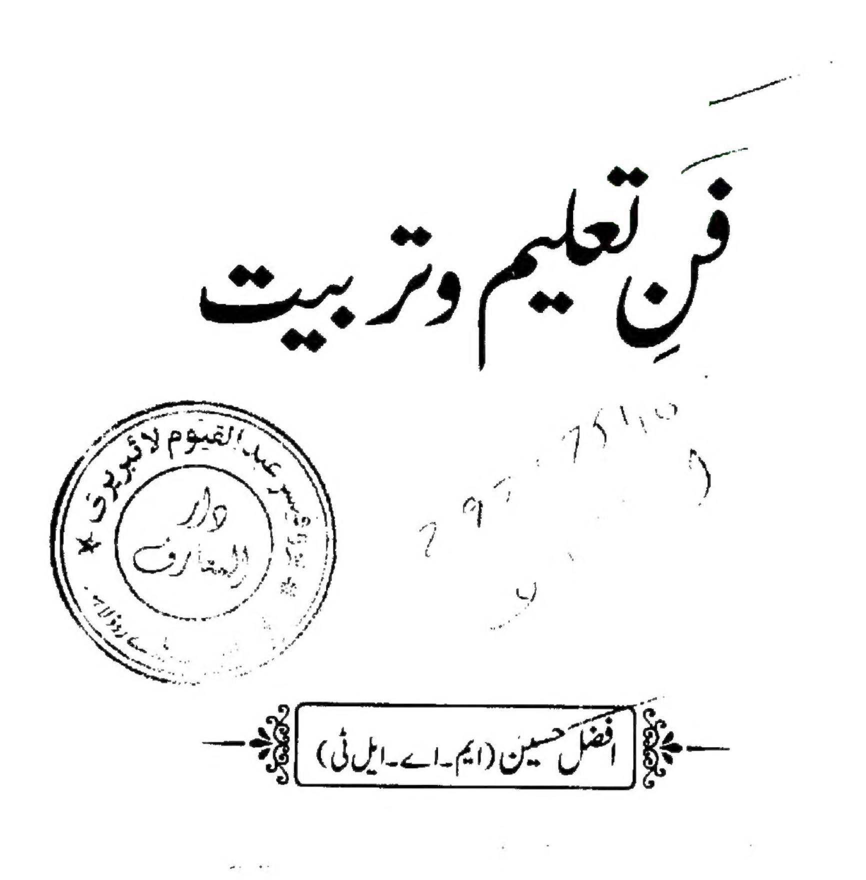


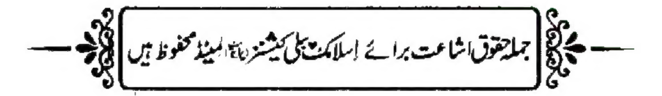
www.KitaboSunnat.com
فنِ تعلیم وتربیت
افضل حسین
ایم۔اے،ایل ٹی



فنِ تعلیم و تربیت

افضل حسین (ایم۔اے۔ایل ٹی)

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
۳۔کورٹ سٹریٹ لوئر مال، لاہور
فون: 37320961-37248676-42-92+



نام کتاب: فنِ تعلیم و تربیت

مصنف: افضل حسین (ایم۔اے۔ایل ٹی)

اشاعت: نومبر 2011ء

ایڈیشن: 12

تعداد: 500

قیمت: -/340 روپے

مطبع: علی اعجاز پرنٹرز، لاہور

اہتمام:

عبدالحفیظ احمد (مینجنگ ڈائریکٹر)

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

ہیڈ آفس: منصورہ ملتان روڈ، لاہور پاکستان

فیکس: 042-37214974

ویب سائٹ: www.islamicpak.com.pk

ای میل: islamicpak@yahoo.com

فہرست مضامین

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

جناب افضل حسین صاحب تعلیمی حلقوں میں اب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اسلامی طرز پر بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے آپ نے جو انتھک کوششیں کی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ درس گاہوں کے لیے نصابی کتب کے طور پر ''ہماری کتاب'' کا سلسلہ جو ۶ حصوں پر مشتمل ہے، مرتب کر کے آپ تعلیمی حلقوں سے داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ملک کی کوئی ایسی قابل ذکر اسلامی درس گاہ نہیں جہاں آپ کی مرتبہ کتب بطور نصاب داخل نہ ہوں۔

اب تک آپ نے جو کتب تالیف کی تھیں، وہ متعلمین سے متعلق لکھی تھیں۔ اب آپ نے معلمین کی ہدایت ورہنمائی کے لیے ایک جامع اور معیاری کتاب ''فن تعلیم وتربیت'' تالیف فرمائی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر یہ واحد کتاب ہے جو اعتماد کے ساتھ معلمین کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے۔ درحقیقت یہ آپ کی ۲۰ سالہ معلمانہ زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ مولف موصوف چونکہ خود ایک عرصہ سے ایک بلند پایہ درس گاہ سے عملاً وابستہ ہیں اور اس کو نہایت کامیابی سے چلا رہے ہیں، اس لیے اس کتاب میں صرف نظریاتی بحثیں ہی نہیں ہیں بلکہ عملی نقشہ اور طریق کار بھی تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ عملی نقشہ مرتب کرنے میں مؤلف نے اپنے اس طویل تجربے سے پورا پورا استفادہ کیا ہے جو آپ کو اپنی معلّمانہ زندگی میں حاصل ہوا ہے۔

جو حضرات تعلیم وتدریس سے کسی حیثیت سے بھی وابستہ ہیں اور اپنے طلباء میں اسلامی سیرت وکردار اور بلند علمی استعداد پیدا کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے یہ کتاب ایک بہترین معاون ومشیر ثابت ہوگی۔ یہ کتاب ان والدین کے لیے بھی ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگی جو اپنی اولاد کو

بہترین اسلامی سیرت وکردار کے سانچہ میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔

اس گراں قدر تالیف کو ہم اپنے روایتی معیار کتابت وطباعت پر پیش کر رہے ہیں۔امید ہے کہ ہماری دوسری مطبوعات کی طرح یہ کتاب بھی قبول عام حاصل کرے گی۔

لاہور۔۱۵۔ذی الحج ۱۴۳۲ھ
مطابق ۱۲/نومبر ۲۰۱۱ء

مینجنگ ڈائریکٹر
اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

............☆☆☆............

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت ایک اہم دینی فریضہ ہے۔ اس کی ادائیگی کی پوری فکر ہونی چاہیے ورنہ سخت گرفت کا اندیشہ ہے۔ اس ذمہ داری میں والدین اور اساتذہ کے ساتھ اگرچہ پوری ملت، معاشرہ اور مملکت بھی شریک ہیں لیکن براہِ راست ذمہ داری والدین اور اساتذہ پر عائد ہوتی ہے اس لیے انہی کو اس ضمن میں سب سے زیادہ فکرمند بھی ہونا چاہیے۔ خصوصاً آج کے حالات میں تو اس طرف غیر معمولی توجہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ معمولی سی غفلت نہایت خطرناک نتائج سے دوچار کر سکتی ہے۔

خدا کا شکر ہے صورت حال کی سنگینی کا اب کسی حد تک احساس ہو چلا ہے اور مختلف اداروں اور جماعتوں کی انفرادی واجتماعی کوششوں کے نتیجے میں لوگ اس طرف متوجہ ہو رہے ہیں، جو ادارے ٹھٹھر رہے تھے، انہیں تقویت بہم پہنچائی جا رہی ہے، جو اپنوں کی سرد مہری اور دوسروں کی تنگ نظری کا شکار ہو چکے تھے، انہیں از سر نو زندہ کیا جا رہا ہے۔ نئے نئے اداروں کا قیام عمل میں آ رہا ہے، صباحی وشبینہ مکاتب کھولے جا رہے ہیں۔ غرض زندگی کے کچھ آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔

ملت کی ضروریات کے لحاظ سے اگرچہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ بہت ہی کم اور انتہائی ناکافی ہے۔ لیکن جن محدود وسائل وذرائع کے ساتھ اور جن دقتوں اور دشواریوں میں گھر کر یہ کام انجام پا رہا ہے اسے بساغنیمت ہی کہا جا سکتا ہے۔

صحیح تعلیم وتربیت کے بندوبست میں یوں تو متعدد دشواریاں پیش آ رہی ہیں لیکن مندرجہ ذیل ان میں خاص ہیں۔

☆ نئے اداروں کے لیے موزوں اساتذہ نہیں ملتے۔

☆ جن اساتذہ سے کام لیا جارہا ہے ان کی اکثریت فنِ تعلیم وتربیت سے ناواقف ہے۔

☆ بچوں کی تعلیم وتربیت میں والدین کا پورا تعاون حاصل نہیں ہوتا، ادارہ جو کچھ سکھاتا پڑھاتا ہے، گھر عموماً اس پر پانی پھیر دیتا ہے۔

انہی مشکلات کو حل کرنے اور بچوں کی تعلیم وتربیت کو موثر بنانے میں مدد دینے کے لیے یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے اس میں بچوں کی نفسیات، تعلیم کے اصول، تدریس کے طریقے، تربیت کے ڈھنگ، مدرسے کے انتظام، تعاون کے حصول کی صورتوں وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ:

☆ زبان آسان اور سلیس، انداز بیان عام فہم اور شگفتہ ہو۔

☆ اساتذہ، والدین اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے تمام حضرات کے لیے یکساں دلچسپ اور مفید ہو۔

☆ تعلیم وتربیت سے متعلق تمام اہم مباحث پر روشنی پڑ جائے۔

☆ ہر مسئلہ پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث ہو۔

☆ حتی الامکان اصطلاحی الفاظ اور علمی انداز بیان سے گریز کیا جائے۔

☆ جو ہدایات یا مشورے دیئے جائیں وہ قابل عمل ہوں۔

☆ صحیح تعلیم وتربیت کا احساس ابھرے اور اپنی ذمہ داریوں کو کما حقہٗ انجام دینے کی فکر لاحق ہو۔

☆ والدین اور اساتذہ کی کوششیں نتیجہ خیز ہوں اور بچوں پر ان کی سہار سے زیادہ بوجھ نہ پڑنے پائے۔

ان کوششوں میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے، اس کا فیصلہ ناظرین ہی کر سکتے ہیں۔ اہل تم حضرات سے استدعا ہے کہ وہ اپنے مفید مشوروں سے ہمیں محروم نہ رکھیں۔ اللہ تعالیٰ اس حقیر پیش کش کو قبول فرمائے اور پیش نظر مقصد کے لیے مفید بنائے۔ آمین

افضل حسین

باب ا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ط (سورۃ تحریم:۶)

ما نحل والد ولده من نحل افضل من ادب حسن (ترمذی)

تعلیم وتربیت

”بچے جنت کے پھول ہیں۔“

”والدین کا بہترین عطیہ اولاد کی صحیح تعلیم وتربیت ہے۔“

شادی کے بعد ہر جوڑے کی یہی تمنا ہوتی ہے کہ جلد اس کی گود ہری ہو۔ دیر ہوتی ہے تو سو جتن کرتا ہے، روتا، گڑگڑاتا ہے، دعائیں مانگتا ہے، منتیں مانتا ہے اور نہ جانے کیا کیا کرتا ہے۔ خدا خدا کر کے نخل آرزو بار آور ہوتا ہے، دل کی کلی کھلتی ہے اور مانگی مراد پوری ہوتی ہے۔ اللہ اس کی گود بھرتا اور مسرت کا سامان کرتا ہے۔ اعزہ خوشی کے شادیانے بجاتے اور احباب ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ بچہ بلاشبہ اپنے ساتھ بے شمار مسرتیں لاتا ہے، اس کے ساتھ گھر میں برکت آتی ہے، اس کی پیاری پیاری صورت اور کامنی سی مورت سب کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتی ہے، والدین اپنے جگر گوشے کو پھولتا پھلتا دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے ہیں، غالباً ان کے لیے اس سے بڑی کوئی مسرت نہیں ہوتی، ماں دن کا سکھ اور رات کا چین قربان کر کے بھی خوش رہتی ہے۔ صورت دیکھتے ہی باپ کی ساری الجھنیں کافور ہو جاتی ہیں۔ والدین ہی پر کیا موقوف، بچوں کے معصوم چہرے اور ان کی بھولی بھالی باتیں کس کا دل نہیں موہ لیتیں۔ کون ہے جو انہیں ہنستا کھیلتا دیکھ کر خوش نہیں ہوتا۔ سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی بھی بچوں کی معصوم حرکتوں پر بے ساختہ مسکرا دیتا ہے، جنت کے ان پھولوں کے کھلنے سے ہر گھر میں رونق اور ہر چمن میں بہار آ جاتی ہے۔ چاروں طرف مسرت کی ہوائیں چلتی، خوشبو پھیلاتی اور ہر ایک کو گدگداتی ہیں۔ پودے لہلہاتے، پرند چہچہاتے، کلیاں مسکراتی اور پھول ہنستے ہیں۔ غرض ہر طرف فرحت وانبساط کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔

بچے کی پیدائش پر یہ غیر معمولی مسرت بلاوجہ نہیں ہے۔

- ☆ جنت کا یہ پھول، صانع حقیقی کی صناعی کا شاہکار اور انمول تحفہ ہے۔
- ☆ اس کی وجہ سے گھر میں خیر و برکت آتی ہے۔
- ☆ والدین کے مابین تعلقات استوار اور رشتہ مستحکم رکھنے کا وہ بہترین ذریعہ ہے۔
- ☆ اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی کشش اور جاذبیت رکھی ہے۔
- ☆ اس سے مل کر آنکھیں ٹھنڈی، قلب مطمئن اور غم غلط ہو جاتا ہے۔

☆ اس کی وجہ سے خاندان کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔

☆ آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز ہوتا ہے، مستقبل میں اس سے طرح طرح کی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔

ظاہر ہے ایسا بیش بہا تحفہ اور ایسی نعمت غیر مترقبہ پا کر کون بدنصیب مسرور نہ ہوگا۔

مگر...... مسرتوں کے ساتھ بچہ بے شمار ذمہ داریاں بھی لاتا ہے۔

☆ خوش دلی سے اس کو پالنا پوسنا۔

☆ شفقت ومحبت کا برتاؤ کرنا۔

☆ ہمدردی ودلسوزی سے اسے سکھانا پڑھانا۔

☆ تدریج سے پسندیدہ عادات ڈلوانا۔

☆ مختلف مواقع کے آداب بتانا۔

☆ مہذب طور طریقے سکھانا۔

☆ عقائد کو نکھارنا، اعمال کو سدھارنا اور اخلاق کو سنوارنا۔

☆ صحت وعافیت اور ترقی وکامرانی کی فکر کرنا۔

یہ سب وہ اہم ذمہ داریاں ہیں جو بچے کے ضمن میں والدین پر عائد ہوتی ہیں۔ شاید ہی کوئی باپ ایسا ہو جسے ان ذمہ داریوں کا احساس نہ ہو اور وہ ان سے عہدہ برآ ہونے کی خواہش نہ رکھتا ہو۔ اپنی اولاد پر جان چھڑکنا، یہ تو ایک فطری تقاضا ہے، جان بوجھ کر کون غفلت اور کوتاہی کرے گا۔ باپ ہی تو وہ ہستی ہے جو اولاد کو اپنے سے بھی بڑھ چڑھ کر دیکھنا چاہتی ہے، لیکن ایسے خوش نصیب کم ہی ہوتے ہیں جن کی یہ تمنا پوری ہوتی ہے اور جو اپنی ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہو جاتے ہیں کیونکہ تنہا خواہش ہی سے تو سارے کام نہیں بن جاتے۔ تعلیم وتربیت کے لیے سلیقہ بھی چاہیے اور غیر معمولی جدوجہد بھی اور جب ان میں کمی ہو تو کسی اچھے نتیجے کی توقع کیوں کر ہو سکتی ہے۔

ناکامی کے اسباب:

بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت میں آج عموماً کیوں ناکامی ہوتی ہے؟ اس کے مندرجہ ذیل وجوہ ہیں:

۱۔ تعلیم و تربیت بہت ہی صبر آزما اور پتہ ماری کا کام ہے۔ یہ کام جتنی توجہ، دلسوزی اور جدوجہد چاہتا ہے، اس کے لیے عملاً کم ہی لوگ آمادہ ہوتے ہیں۔

۲۔ عام طور پر بچوں کی عمر اور صلاحیتوں سے کہیں زیادہ ان سے توقعات وابستہ کر لی جاتی ہیں اور جب ان سے بار بار کوتاہیاں اور لغزشیں سرزد ہوتی ہیں اور رفتارِ ترقی بھی خلافِ توقع بہت سست دکھائی دیتی ہے تو اصلاحِ حال کی طرف سے بددل ہو کر لوگ عموماً نہ صرف اپنی کوششوں میں کمی کر دیتے ہیں بلکہ اپنے رویے اور برتاؤ سے خود بچوں کو بھی مایوسی اور بددلی کا شکار بنا دیتے ہیں اور ان میں خوداعتمادی باقی نہیں رہ جاتی۔

۳۔ پورا معاشرہ بگڑا ہوا ہے۔ بڑوں کے غلط نمونے اور ہمجولیوں کی بری صحبت کے غیر محسوس اثرات بچے برابر قبول کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اچھے بھلے والدین کے بچوں میں بھی غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر طرح طرح کی خرابیاں جڑ پکڑ لیتی ہیں۔

۴۔ جس بچے کا بھی جائزہ لیجئے۔ یہی معلوم ہوگا کہ چند اگر سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں تو متعدد اسے بگاڑنے کے درپے رہتے ہیں۔

۵۔ ضروریاتِ زندگی اب ناگزیر ضروریات تک محدود نہیں رہیں بلکہ ان کی فہرست بہت طویل ہو گئی ہے، اقتصادی نظام اور معاشی ڈھانچہ بھی روز بروز پر پیچ ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ ضروریات کی تکمیل کے لیے دوڑ دھوپ سے فرصت نہیں ملتی، بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دینے کی توفیق کہاں سے نصیب ہو۔

۶۔ مناسب تعلیم و تربیت کے لیے جس صلاحیت اور سلیقے کی ضرورت ہے اکثر لوگ اس سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کی کوششیں بارآور ہونے کے بجائے بسا اوقات الٹی پڑتی ہیں۔

۷۔ والدین کے باہمی تعلقات کی ناخوشگواری، جدائی، موت، عدم موجودگی یا گھر سے دوری وغیرہ بھی بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت میں بہت زیادہ مزاحم ہوتی ہیں۔

۸۔ باطل نظام نے زندگی کی قدریں بدل دی ہیں۔ مادہ پرستی ذہنوں پر اس قدر غالب آ گئی ہے کہ بچوں کی دنیا سنوارنے اور ان کا مستقبل ''شاندار'' بنانے کے لیے اچھے بھلے لوگ اپنے جگر گوشوں کے ایمان واخلاق کو اپنے ہاتھوں شیطان کی بھینٹ چڑھا دینے میں کوئی باک نہیں محسوس کرتے۔

۹۔ کتنے لوگ اپنی معاشی پریشانیوں، علالتوں یا دیگر حقیقی معذوریوں ومجبوریوں کے باعث اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت خود کر نہیں پاتے اور کسی حلقے سے انہیں اس ضمن میں کوئی امداد بھی نہیں مل پاتی، کیونکہ صنعتی انقلاب نے خاندانی نظام درہم برہم کر دیا ہے۔ سماجی بندھن بھی ڈھیلے پڑ چکے ہیں۔ چنانچہ والدین کی معذوری، کوتاہی اور غفلت کی سورت میں خاندان کے دوسرے افراد اس بار کو برداشت کرنے کے لیے نہ تو خود آمادہ ہوتے ہیں، نہ سماج انہیں مجبور کر پاتا ہے اور نہ خود سماج ان بچوں کا کوئی معقول انتظام کرتا ہے۔

۱۰۔ بچوں کو مصروف رکھنے اور ان کے فرصت کے اوقات کو کارآمد بنانے کے لیے دلچسپ تعمیری یا موزوں کھیلوں وغیرہ کا کوئی معقول انتظام نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ بچوں کی صلاحیتیں غلط رخ اختیار کر لیتی ہیں، وہ آوارہ گردی کا شکار ہو جاتے اور طرح طرح کی نازیبا حرکات کرنے لگتے ہیں۔

۱۱۔ سماج میں بڑھتی ہوئی فحاشی، بے حیائی، اخلاقی بے قیدی، نظروں کو خیرہ کرنے والے پرفریب مناظر ومظاہر، فحش لٹریچر، عریاں تصاویر، گھناؤنے پوسٹرز کی فراوانی، مخرب اخلاق فلموں، افسانوں اور ناولوں کی کثرت وغیرہ عموماً اصلاحی کوششوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔

۱۲۔ بچوں کی شخصیت پر گھر، مدرسہ، ماحول، معاشرہ اور مملکت ہر ایک کا کچھ نہ کچھ اثر پڑتا ہے۔ مناسب اور معیاری تعلیم وتربیت کے لیے ان سب میں تعاون اور ہم آہنگی ضروری ہے

لیکن یہاں یہ چیز مفقود ہے۔ہم آہنگی تو الگ رہی ان میں سے تقریباً ہر ایک کی کوششوں کا رخ الگ الگ سمتوں میں ہے،گھر کے لوگ فکر کرتے ہیں تو اچھے مدرسے نہیں ملتے،مدرسہ اپنی ذمہ داری محسوس کرتا ہے تو اوروں کا تعاون حاصل نہیں کر پاتا۔چنانچہ بیشتر بچے اس تناؤ اور کشمکش کا شکار ہو جاتے ہیں۔

غفلت کے نتائج:

تعلیم وتربیت کی طرف سے غفلت نہ صرف افراد اور کنبوں بلکہ ملک وملت سب کے حق میں انتہائی خطرناک اور مضر ثابت ہوتی ہے کیونکہ:

☆ بچے ناکارہ اور نکمے رہ جاتے ہیں،ان کی پیدائشی قوتیں اور صلاحیتیں یا تو ٹھٹھر جاتی ہیں یا غلط رخ اختیار کر لیتی ہیں۔

☆ طرح طرح کی برائیوں اور بداعمالیوں میں مبتلا ہو کر بچے دین دنیا دونوں تباہ کر لیتے ہیں۔

☆ آنکھوں کی ٹھنڈک اور بڑھاپے کی لکڑی بنتا تو الگ رہا،الٹا خار بن کر کھٹکتے اور والدین پر بوجھ بن کر رہتے ہیں۔

☆ باپ دادا کی گاڑھی کمائی نہایت بےدردی سے اڑا دیتے ہیں۔

☆ خاندان کے چشم وچراغ ہونے کے بجائے اس کا نام ڈبوتے ہیں۔

☆ اپنے خراب اسوے سے دین وملت کو بدنام کرتے ہیں۔

☆ جرائم پیشہ ہو کر سب کے لیے دردِ سر بنتے ہیں اور ملک ومعاشرے کو طرح طرح سے نقصان پہنچاتے ہیں۔

☆ ملت صالح افراد،معاشرہ بےلوث خادموں اور مملکت اچھے شہریوں سے محروم رہ جاتی ہے۔

☆ ان کے لیے حکومتوں کو جیلوں،عدالتوں،تھانوں اور ہسپتالوں وغیرہ پر کافی روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔

☆ ملکی معاش اور اجتماعی اخلاق کے لیے وہ گھن ثابت ہوتے ہیں۔غرض جنت کے وہ پھول جو خوشبو پھیلانے کے لیے کھلے تھے اور ابتداء میں ہر ایک کی فرحت وانبساط کا سامان تھے۔ غفلتوں اور کوتاہیوں کے نتیجے میں غلاظت کا ڈھیر بن جاتے اور اپنے ناقابل برداشت تعفن سے سب کا ناک میں دم کر دیتے ہیں اور اس طرح کوتاہی اور لاپروائی کا قدرت ہر ایک سے انتقام لیتی ہے۔

اس کے برعکس بچوں کی تعلیم وتربیت پر اگر مناسب توجہ دی جائے تو:

☆ ان کی صلاحیتیں ابھرتی، سیرتیں سنورتی ہیں اور دین ودنیا میں انہیں فلاح وکامرانی نصیب ہوتی ہے۔

☆ اس مقصد کی تکمیل میں مدد ملتی ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین پر بھیجا ہے۔

☆ وہ اپنی انفرادی، خاندانی اور اجتماعی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے اہل ہو جاتے ہیں۔

☆ وہ اللہ کے صالح بندے، معاشرے کے بے لوث خادم اور ملک کے وفادار شہری بنتے ہیں۔

☆ ان کا وجود خود اپنے اور ملک وملت سب کے لیے باعث رحمت اور موجب خیر و برکت ہوتا ہے۔

☆ تمدن کی ترقی میں ان کی صلاحیتوں سے مدد ملتی ہے۔

☆ ملکی معیشت اور قومی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے اور حکومت کے مصارف اور دردسری میں کمی آتی ہے۔

غرض صحیح تعلیم وتربیت پر صرف کی ہوئی قوت محنت اور دولت ہر ایک کے حق میں نفع بخش ثابت ہوتی ہے۔

مگر افسوس یہ ہے کہ ہماری غفلتوں اور ارباب سیاست کی کوتاہ اندیشیوں سے ساری دنیا پر ایک ایسا نظام تعلیم وتربیت مسلط ہو گیا ہے جو اپنے گوناگوں مضامین ومشاغل، درسی وامدادی کتب، بیرون نصاب مصروفیات اور کلچرل پروگراموں وغیرہ کے ذریعے یا تو

☆ خدا پرستی، احساس ذمہ داری اور اخلاقی قدروں کی پاسداری سکھانے کے بجائے خدا سے بے نیازی، آخرت کی باز پرس سے بے خوفی اور اعلیٰ انسانی قدروں کی بے قدری سکھاتا ہے یا شرک وتوہم پرستی، تعصب وتنگ نظری، ملکی وقومی عصبیت، خودغرضی وخودنمائی، عیاشی وتن آسانی میں مبتلا کرتا ہے، اور جو

☆ مادی ترقی اور معاشی خوش حالی کو تو آخری مقصود ٹھہراتا ہے لیکن سیرت کو سنوارنے اور اخلاق کو سدھارنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔

ظاہر ہے کہ اس نظام میں جب تک تبدیلیاں نہ کی جائیں گی، اس کے تحت پروان چڑھنے والی نسلوں سے بحیثیت مجموعی کسی خیر کی توقع عبث ہے، البتہ شر کے اندیشے ہمیشہ لگے رہیں گے۔

رہے دینی ادارے جو صحیح تعلیم وتربیت کے علمبردار اور جہالت کی تاریکیوں میں روشنی کے مینار رہے ہیں اور جن سے ہدایت ورہنمائی کے سوتے پھوٹتے اور خلق خدا کو فیض پہنچتا تھا وہ بھی اب اپنی بے حسی، ملت کی عدم توجہی، پرایوں کی رقابت، باطل سے مرعوبیت، دینی غیرت وحمیت کے فقدان، ایثار وبے لوثی کی کمی، اساتذہ کی علمی وعملی کوتاہیوں اور فن تعلیم وتربیت سے ناواقفیت، علوم میں دینی ودنیاوی کی عملاً تفریق اور اپنے یک رخے پن اور ازکاررفتہ نصاب ونظام وغیرہ کے باعث ٹھٹھر رہے ہیں اور دن بدن ان کی افادیت گھٹتی اور ان کا حلقہ اثر سکڑتا جا رہا ہے۔

اس صورت حال کا تقاضا یہ ہے کہ تمام افراد اور جماعتیں اصلاح حال کی طرف توجہ دیں اور انفرادی واجتماعی حیثیت سے جو کچھ کر سکتے ہیں اس سے ہرگز دریغ نہ کریں۔ غیر معمولی جدوجہد اور پامردی واستقلال سے حالات کا مقابلہ کیا اور اس کا رخ موڑا جا سکتا ہے۔

صورت حال بلاشبہ نہایت روح فرسا اور حوصلہ شکن ہے۔ ملک بظاہر کسی صالح انقلاب کے لیے آمادہ نظر نہیں آتا۔ اکثریت یا تو مادہ پرستی اور مغرب زدگی کا شکار ہے یا احیائی ذہنیت کا۔ وہ یا تو آنکھیں بند کر کے مغرب کے پیچھے بھاگ رہی ہے یا ''پراچین سبھیتا'' کو لوٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔ وہ خود بھی اس سیلاب کی نذر ہونے پر تلی ہوئی ہے، اور ہمیں بھی اس میں

بہا لے جانا چاہتی ہے۔ادھر امت مسلمہ کا حال یہ ہے کہ اس میں نظم واتحاد نہیں، وہ جزوی وفروعی اختلافات میں الجھی ہوئی ہے۔اس کے وسائل و ذرائع محدود، ہمت و جرأت مفقود اور حوصلے انتہائی پست ہیں۔ایسی صورت میں کسی ہمہ گیر انقلاب کی دعوت دینا مجذوب کی بڑ سمجھا جائے گا لیکن جس سیلاب میں ہم گھر گئے ہیں اس کے ساتھ بہنے میں ملت کا وجود نمک کی طرح تحلیل اور ملک کا اخلاق بالکلیہ تباہ ہوا جاتا ہے۔ پھر اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ ملک وملت اور آئندہ نسلوں کو تباہی سے بچانے کے لیے بہادروں کی طرح اٹھ کھڑے ہوں اور سیلاب کا رخ موڑنے کی پوری جدوجہد کریں۔اسی میں ہماری ہر طرح جیت ہے۔

..........☆☆☆..........

باب ۲:

تعلیم کا مفہوم

بچوں کی تعلیم ایک ایسا موضوع ہے جس سے کم وبیش ہر ایک کو دلچسپی ہوتی ہے۔ کسی مجلس میں اس مسئلہ کو چھیڑ کر دیکھ لیجئے مرد، عورت، امیر، غریب، شہری، دیہاتی، مسلم، غیر مسلم غرض ہر فرقے و طبقے کے لوگ متوجہ ہو جائیں گے اور موقعہ ملا تو ہر ایک اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ تبصرہ بھی کر دے گا۔

یہ عمومی دلچسپی کچھ فطری بھی ہے کیونکہ:

- ☆ اللہ کے فضل سے سب بال بچے والے ہوتے ہیں اور سب کو اپنے بچوں کے مستقبل کی فکر بھی ہوتی ہے۔
- ☆ ہر ایک اپنی اولاد کو اپنے سے بڑھ چڑھ کر دیکھنا چاہتا ہے اور اس کے لیے تعلیم وتربیت کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔
- ☆ ہر ایک کی بعض آرزوئیں اور تمنائیں ایسی ہوتی ہیں جو اس کے اپنے ہاتھوں پوری ہوتی نظر نہیں آتیں، وہ اپنی اولاد کے ذریعے ان کی تکمیل چاہتا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے وہ مناسب تدابیر معلوم کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔
- ☆ اپنے آدرشوں کے مطابق اپنی اولاد کو پروان چڑھتا نہیں دیکھتا تو ہر ایک کڑھتا ہے اور بے اطمینانی کا اظہار کرتا ہے۔
- ☆ مستقبل کی تیاری کے لیے قدرت نے بچپن کی جو طویل مدت عطا فرمائی ہے، ہر ایک اسے کارآمد بنانا چاہتا ہے۔

لیکن اس مسئلہ پر لوگوں کے تبصروں کا تجزیہ کیجئے، جتنے منہ اتنی باتیں ہوں گی۔ ایسا محسوس ہوگا کہ ہر ایک کے ذہن میں تعلیم کا ایک الگ مفہوم ہے اور ایک جداگانہ تصور...... بمشکل چند افراد

ایسے ملیں گے جو کسی ایک مفہوم یا ایک تصور پر متفق ہوں، یہاں تک کہ ماہرینِ تعلیم کے مابین بھی اس ضمن میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔

اس انتشار فکری کے بھی دراصل متعدد وجوہ ہیں:

۱۔ نظریۂ حیات کا اختلاف:

زندگی کے متعلق لوگوں کے نظریات مختلف ہیں۔ کچھ لوگ دنیوی زندگی اور اس کی لذتوں ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں تو کچھ لوگ زندگی بعد موت کے قائل ہیں اور آخرت کی کامیابی کو منزل مقصود قرار دیتے ہیں۔ کسی کے نزدیک زندگی کا مقصد صرف دولت سمیٹنا اور بینک بیلنس بڑھانا ہے تو کسی کے نزدیک قوت واقتدار حاصل کرنا اور دوسروں پر رعب جمانا ہے۔ بعض لوگ دنیوی جھمیلوں سے الگ تھلگ راہبانہ زندگی میں یقین رکھتے ہیں تو بعض دنیا کے ہنگاموں سے گزرتے ہوئے خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ نظریۂ حیات کا یہی اختلاف تعلیم وتربیت کے متعلق تصورات میں بھی اختلاف کا موجب ہوتا ہے۔

۲۔ آدرشوں کا اختلاف:

مختلف لوگوں کے سامنے مختلف آدرش ہوتے ہیں۔ کوئی اپنے بچے کو ڈاکٹر بنانا چاہتا ہے کوئی انجینئر، کوئی لیڈر بنانا چاہتا ہے، کوئی پلیڈر، کسی کے سامنے زراعت یا تجارت ہوتی ہے کسی کے سامنے صحافت یا سیاست، کوئی عالمِ دین بنانے کا خواہاں ہوتا ہے تو کوئی ملازم سرکار، غرض جتنے افراد ہیں اتنے آدرش۔ آدرشوں کے اس اختلاف کے نتیجے میں تصورات میں بھی اختلاف پیدا ہوتا ہے۔

۳۔ ماحول کا اختلاف:

ہر مقام کا فطری وسماجی ماحول جدا ہوتا ہے، اپنے ماحول میں فٹ ہونے کے لیے افراد میں کچھ مخصوص اوصاف اور صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں، جو تعلیم وتربیت ہی کے ذریعے پروان چڑھائی

جاسکتی ہیں، ماحول اوراس کے تقاضوں کا یہی اختلاف تعلیم کے بارے میں تصورات میں اختلاف کا موجب ہوتا ہے۔

۴۔ حالات وضروریات میں اختلاف:

ہرایک کے اپنے مخصوص حالات ہوتے ہیں اور ہرایک کی جداجدا ضروریات، تعلیم میں ان کی رعایت نہیں کی جاتی تو اسے بے اطمینانی ہوتی ہے۔

۵۔ شخصیت کی پیچیدگی:

انسان کی شخصیت بڑی پیچیدہ ہے۔ اس کے متعدد پہلو ہیں مثلاً ذہنی، جسمانی، عملی اوراخلاقی وغیرہ، کسی کے نزدیک ایک پہلو اہم ہوتا ہے کسی کے نزدیک دوسرا، ہرایک تعلیم وتربیت کے ذریعے اپنے پسندیدہ پہلو کی نشو ونما اور ترقی کو اہمیت دیتا ہے اوراس میں کمی پاتا ہے تو بے اطمینانی کا اظہار کرتا ہے۔

۶۔ تعلیمی اسکیموں میں اختلاف:

ماہرین تعلیم نے غور وفکر اور تجربے سے متعدد تعلیمی اسکیمیں نکالی ہیں۔ کسی کو ایک اسکیم پسند ہے کسی کو دوسری۔

۷۔ طریق تعلیم کا اختلاف:

مختلف لوگوں نے اپنے اپنے تجربات کے مطابق تعلیم وتربیت کے مختلف طریقوں کو مفید اور کامیاب پایا ہے، چنانچہ آج متعدد طریقے رائج ہیں۔ ہرایک اپنے پسندیدہ طریقے ہی کو صحیح اور معقول سمجھتا ہے۔

لیکن ظاہر ہے تعلیم کا ہر مفہوم اور ہر تصور تو صحیح نہیں ہوسکتا، کوئی ایک ہی معقول اور مناسب ہوگا۔

تعلیم کے معنی:

(علم سے باب تفعیل میں) تعلیم کے لغوی معنی کسی کو کچھ بتانا، پڑھانا یا سکھانا۔ بعض لوگ غلط فہمی میں اس کو تدریس کا ہم معنی سمجھتے ہیں۔ یعنی طلبہ کو بعض مضامین یا کتب کا درس دے دینا انہیں لکھنا پڑھنا اور حساب وغیرہ سکھا دینا۔ حالانکہ یہ بہت جامع لفظ ہے۔ اس کے مفہوم میں تدریس کے ساتھ ساتھ تدریب (فنون میں مہارت پیدا کرنا) تادیب (ادب سکھانا) اور تربیت (شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی ہم آہنگ نشوونما کرنا) بھی شامل ہے۔

تعلیم کا محدود اور وسیع مفہوم:

تعلیم کا لفظ آتے ہی ذہن عموماً ان منظم کوششوں کی طرف منتقل ہوتا ہے جو طلبہ کے لیے تعلیمی ادارے انجام دیتے ہیں۔ بلاشبہ باضابطہ اور رسمی (Formal) تعلیم یہی ہے اور اس کے اثرات بھی بہت دوررس ہوتے ہیں۔ مگر یہ تعلیم کا بہت ہی محدود مفہوم ہے کیونکہ تعلیمی اداروں میں تو بچے بہت کم وقت گزارتے ہیں اور بہت ہی محدود معلومات و تجربات حاصل کرتے ہیں جب کہ ان کے جاننے سیکھنے اور تجربات حاصل کرنے کا عمل پیدائش سے لے کر موت تک برابر جاری رہتا ہے تعلیمی اداروں کی باضابطہ تعلیم کے علاوہ نہ جانے کتنی باتیں وہ اپنے گھر محلے، پڑوس، فطری و سماجی ماحول اور اپنے گردوپیش پھیلی ہوئی دنیا اور اس میں بسنے والے افراد سے سیکھتے ہیں۔ اگرچہ یہ تعلیم غیر رسمی اور بے ضابطہ (Informal) ہوتی ہے لیکن اثرات ونتائج کے اعتبار سے باضابطہ تعلیم سے کم نہیں ہے۔

اس طرح تعلیم کے وسیع مفہوم میں وہ تمام معلومات و تجربات شامل شمار ہوتے ہیں جو گود سے گور تک ہر فرد باضابطہ یا بے ضابطہ خود حاصل کرتا ہے یا اسے حاصل کرائے جاتے ہیں۔

☆☆☆

باب ۳:

تعلیم وتربیت پر اثرانداز عوامل

تعلیم کے اس وسیع مفہوم سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ بچوں کی تعلیم وتربیت پر متعدد عوامل (Agencies) اثر انداز ہوتے ہیں۔ان میں سے خاص خاص یہ ہیں:

۱۔گھر۔ ۲۔مدرسہ۔ ۳۔ ماحول۔ ۴۔معاشرہ۔ ۵۔مملکت یاحکومت۔

۱۔ گھر

تعلیم وتربیت کا اولین اور اہم ترین ادارہ گھر ہے۔پیدائش سے لے کر چار پانچ سال کی عمر تک بچے کی ساری حیات پھرت گھر کی چہار دیواری تک محدود رہتی ہے۔گھر کے افراد اور گھریلو ماحول کا جو اثر بچہ قبول کرتا ہے وہ بہت ہی دوررس اور انتہائی اہم ہوتا ہے۔یہیں وہ اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، بات چیت کرنا غرض سب کچھ سیکھتا ہے۔یہیں اسے وہ حقیقی محبت وشفقت، ہمدردی وتعاون اور آسائش وناز برداری نصیب ہوتی ہے جو اس کی تربیت وپرورش کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ماں، باپ، بہن بھائی، دادا دادی اور دوسرے اعزہ واقارب مختلف حیثیتوں سے اس کے معلم کا کام انجام دیتے ہیں۔ ان کے عادات واطوار، حرکات وسکنات کی تقلید کرکے بچہ اپنے کو مختلف اوصاف سے متصف کرتا ہے، بچوں کے سادہ ذہن ودماغ پر گھریلو زندگی کے جو گہرے نقوش ثبت ہو جاتے ہیں وہ زندگی بھر نہیں مٹتے۔ مدرسے میں داخل ہونے کے بعد بھی گھر کی اہمیت کم نہیں ہوتی کیونکہ مدرسے میں بچے صرف چند گھنٹے رہتے ہیں۔اس مختصر وقت میں انہیں لکھنا پڑھانا، ان کی جسمانی، عملی اور اخلاقی تربیت کرنا، ان کے عادات واطوار پر نظر رکھنا یہ سب کام گھر کے تعاون کے بغیر تنہا مدرسہ کسی طرح بھی انجام نہیں دے سکتا۔گھر کو بہر حال مندرجہ ذیل فرائض انجام دینے ہی پڑیں گے۔

فرائض:

☆ پرورش، جسمانی تربیت اور صحت وصفائی کی دیکھ بھال، کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کا مناسب بندوبست کرنا، جسم اور لباس کی صفائی، پابندی سے نہانے دھونے، کپڑے بدلنے، ناخن اور بال ترشوانے وغیرہ کا اہتمام کرنا۔ کھیل کود یا ورزش اور حفظان صحت کے اصولوں کی پابندی کرانا وغیرہ۔

☆ بچے کی عادات واطوار پر نظر رکھنا۔ شفقت ومحبت سے ان کی تربیت کرنا اور رفتہ رفتہ پسندیدہ عادات ومعمولات کا پابند بنانا۔

☆ تعلیم وتربیت کے ضمن میں مدرسے کی طرف سے دی ہوئی ہدایات کی پابندی کرانا۔

☆ گھریلو زندگی کو پاکیزہ بنانے اور افراد خاندان کے باہمی تعلقات کو استوار رکھنے کی پوری کوشش کرنا تا کہ بچہ شعوری یا غیر شعوری تقلید کے لیے اچھے نمونے پاسکے۔

☆ گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے مواقع دینا، فرصت کے اوقات کے لیے کوئی دلچسپ مشغلہ (ہابی) فراہم کرنا، نیز صلاحیت کے مطابق کوئی گھریلو ذمہ داری سپرد کرنا تا کہ محنت ومشقت، احساس ذمہ داری، انہماک تعاون وغیرہ کا عادی بنایا جاسکے۔

☆ ہمجولیوں کے ساتھ کھیلنے کودنے اور اعزہ واقارب سے ملنے جلنے کے مواقع دینا تا کہ معاشرتی تربیت ہوسکے البتہ ہمجولیوں کے عادات واطوار پر نظر رکھنا اور بری صحبت سے بچانا بھی ضروری ہے۔

☆ بچوں کی عزت نفس کا لحاظ رکھنا اور جائز حدود میں ان کے ذوق اور جذبات کی پوری رعایت کرنا۔

☆ بچہ اگر کسی ایسے مدرسے میں پڑھنے پر مجبور ہے جہاں دینی تعلیم وتربیت کا بندوبست نہیں ہے تو اپنے طور پر اس کا بندوبست کرنا۔

یہ ہیں وہ بنیادی فرائض جو صحیح طور پر گھر ہی انجام دے سکتا ہے اور اسی کو دینا بھی چاہیے، لیکن جہالت، افلاس، وسائل وذرائع کی کمی، والدین کی مصروفیات اور عمومی بگاڑ کے باعث بہت کم گھر اپنے ان فرائض کو کماحقہ انجام دیتے یا دے سکتے ہیں۔ صنعتی انقلاب نے گھریلو نظام کو اور زیادہ درہم برہم کر دیا ہے۔ باپ کہیں رہتا ہے بچے کہیں۔ بھلا ان کی دیکھ بھال کون کرے؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدرسے عموماً گھروں کے تعاون سے محروم رہتے ہیں۔ محدود وسائل کے باعث مدارس بھی عام طور پر اقامتی نہیں ہوتے اسی لیے تعلیم وتربیت کی پوری ذمہ داری تنہا نہیں اٹھا سکتے، چنانچہ بچوں کی تعلیم وتربیت بے حد متاثر ہو رہی ہے۔ گھریلو نظام کو مستحکم رکھنے اور افراد خاندان کو بچوں سے متعلق اپنے فرائض کو انجام دینے کی طرف برابر توجہ دلاتے رہنا چاہئے ورنہ آئندہ نسلوں کا خدا ہی حافظ ہے۔

۲۔ مدرسہ

بچوں کی تعلیم وتربیت پر اثر انداز ہونے والا دوسرا سب سے موثر عامل مدرسہ ہے۔ بچوں کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ہم آہنگی کے ساتھ پروان چڑھانے کی ذمہ داری اسی کے سپرد ہوتی ہے، بچے جو کچھ مدرسے کے باہر سیکھتے ہیں اس میں نہ تو کوئی نظم ہوتا اور نہ ترتیب، مدرسہ ایک منظم ادارہ ہوتا ہے جو باصلاحیت اساتذہ کی مدد سے ایک خاص نظم وترتیب کے ساتھ بچوں کو تعلیم دیتا اور ان کی سیرت وشخصیت کو سنوارتا ہے۔ گھر کی طرح اپنے مدرسے سے بھی بچوں کو جذباتی لگاؤ ہوتا ہے۔ وہ اپنے استاد کو دنیا کا سب سے بڑا آدمی سمجھتے ہیں۔ اس کی معلومات پر غیر معمولی اعتماد کرتے ہیں، اس کی سیرت وکردار کو اپنے لیے قابل تقلید اسوہ سمجھتے ہیں۔ مدرسے کی فضا انہیں بے حد متاثر کرتی ہے۔ یہاں بچے کی سیرت وشخصیت پر جو نقوش ثبت ہوتے ہیں وہ زندگی بھر قائم رہتے ہیں، انھی وجوہ سے اس عامل کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔

مدرسے کے فرائض:

مدرسے کو مندرجہ ذیل فرائض انجام دینے پڑتے ہیں:

☆ بچوں کی مختلف علوم وفنون میں مہارت پیدا کرنا۔ بچے ادھر ادھر سے جو کچھ سیکھتے ہیں یا معلومات حاصل کرتے ہیں وہ عموماً ناقص یا ناکافی ہوتی ہیں۔ ان میں کوئی نظم وترتیب بھی نہیں ہوتی، مدرسے کا فرض ہے کہ وہ ایک خاص تدریج سے اور نظم وترتیب کے ساتھ انہیں معلومات بہم پہنچائے اور مہارت پیدا کرے۔

☆ اصلاح وتربیت کرنا۔ علمی، عملی، جسمانی یا اخلاقی حیثیت سے بچوں میں جو خرابیاں جڑ پکڑنے لگتی ہیں، ان کی اصلاح کرنا، پسندیدہ عادات واطوار کا حامل بنانا، ان کی اندرونی صلاحیتوں کو صحیح رخ پر ڈالنا، نیز انہیں ان عملی واخلاقی اوصاف سے متصف کرنا جو انفرادی، اجتماعی اور عائلی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دینے میں معاون ہوں۔

☆ بچوں کے اندر برے بھلے کی تمیز، حق سے محبت اور باطل سے نفرت، بھلائیوں کے پھیلانے اور برائیوں کے مٹانے کا جذبہ بیدار کرنا تاکہ وہ معاشرے کے ناپسندیدہ رجحانات کا مقابلہ کرسکیں خود اس کا شکار ہونے سے محفوظ رہیں اور دوسروں کو بھی بچانے کی کوشش کریں۔

☆ بچپن اور جوانی، کتابی دنیا اور عملی دنیا، مدرسے اور معاشرے کے مابین جو خلا ہے اسے پر کرنا تاکہ بچے حقیقی دنیا میں کامیابی کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔

☆ بنی نوع انسان کے کارآمد تجربات اور اسلاف سے ملے ہوئے علمی، فنی اور ثقافتی ورثہ کا تحفظ اور ان میں مناسب اضافہ کرکے آئندہ نسلوں کو منتقل کرنا۔ ہمارے اسلاف نے مختلف علوم وفنون کا جو ورثہ چھوڑا ہے، مدرسے کا فرض ہے کہ ان کو ضائع ہونے سے بچائے اور اپنی تحقیق وتجربے سے اس میں مناسب اضافہ کرکے اگلی نسلوں کو منتقل کرے۔

☆ بچوں میں یہ جذبہ ابھارنا کہ وہ اپنے علم پر خود بھی عمل کریں اور اسے دوسروں تک پہنچائیں۔

☆ سماج کو علم وفضل کی ایک کسوٹی فراہم کرنا۔ یعنی مدرسے کی دی ہوئی سندوں سے سماج اندازہ لگا سکے کہ کسی سند کا حامل کن صلاحیتوں کا مالک ہے اور وہ کس طرح کی ذمہ داریاں اٹھا سکتا ہے۔

☆ طلبہ کے مابین ذہنی، جسمانی، معاشرتی اور اخلاقی اعتبار سے جو فرق ہوتا ہے اسے ملحوظ رکھتے ہوئے ان پر انفرادی توجہ دینا تاکہ ہر بچہ اپنی بساط وصلاحیت کے مطابق آگے بڑھ سکے۔

۳۔ قریبی ماحول

یہ تیسرا اہم عامل ہے۔ بچوں کی تعلیم وتربیت پر ان کے ماحول کا بھی بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ بچہ جس جغرافیائی ماحول میں رہتا ہے، جس طرح کے مناظر سے دوچار ہوتا ہے، جس طبقے سے تعلق رکھتا ہے، جن بچوں کے ساتھ کھیلتا کودتا اور اٹھتا بیٹھتا ہے، ان سب کا مجموعی اثر قبول کرتا ہے پاس پڑوس کے لوگوں کے رہن سہن، عقائد واعمال، رسم ورواج وغیرہ سے متاثر ہوتا ہے۔ ماحول اگر اچھا ہو تو مدرسے اور گھر دونوں کی کوششیں بارآور ہوتی ہیں ورنہ دونوں کو بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ بسا اوقات بھلے گھروں کے بچے اور معیاری مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ بھی باوجود ہر طرح کی کوششوں کے برے ماحول کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کی اٹھان مطلوبہ نہج پر نہیں ہو پاتی۔ اس لیے ماحول کو بھی تعلیم وتربیت کے لیے سازگار بنانے کی پوری کوشش ہونی چاہیے۔

۴۔ معاشرہ

انسان عموماً اپنے ماحول اور معاشرے ہی کی پیداوار ہوتا ہے، بہت کم افراد ایسے انقلابی ذہن کے ہوتے یا براہیمی نظر رکھتے ہیں جو اپنے گردوپیش سے بلند ہو کر کچھ سوچ اور فکر کر سکیں۔ معاشرے میں جن چیزوں کا چلن ہوتا ہے افراد بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر انھی کو اپنا لیتے ہیں۔

آج کی سوسائٹی میں متعدد عناصر سرگرم عمل نظر آتے ہیں اور افراد پر اپنے برے بھلے نقوش ثبت کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً مختلف قسم کی مذہبی، سماجی وسیاسی جمعیتیں، کلب، سوسائٹیاں، پریس، پلیٹ فارم، سینما، ریڈیو، میلے ٹھیلے، دارالمطالعے وکتب خانے، عجائب گھر اور نمائش گاہیں، خدمت خلق اور رفاہ عامہ کے ادارے وغیرہ، افراد ساری زندگی ان سے کچھ نہ کچھ سیکھتے اور ان کے اثرات قبول کرتے رہتے ہیں۔ معاشرے کے یہ مختلف عناصر اگر صحیح بنیادوں پر کام کرتے ہیں تو افراد کو ونچا اٹھانے اور ان کی سیرت وکردار کو سنوارنے میں بہت معاون ہوتے اور اپنے لیے بے لوث خادم تیار کرتے ہیں ورنہ ان کی وجہ سے افراد بگڑتے اور معاشرے کے ساتھ خود انہیں بھی لے ڈوبتے ہیں۔

معاشرے کے فرائض:

معاشرے کا فرض ہے کہ وہ:

☆ اجتماعی ضمیر کو بیدار رکھے تاکہ برے عناصر ابھر کر معاشرے کو بگاڑ نہ سکیں۔

☆ طرح طرح کے اداروں، کلبوں اور سوسائٹیوں وغیرہ سے اپنے آپ کو مالا مال رکھے تاکہ ہر صلاحیت اور رجحان کے افراد اپنے ذوق اور بساط کے مطابق خود بھی استفادہ کرسکیں اور سماج کو بھی فائدہ پہنچا سکیں۔

☆ افراد اور اداروں کی سرگرمیوں پر نظر رکھے، معروف میں ان کے ساتھ پورا تعاون کرے اور منکرات کی روک تھام کے لیے سرگرم عمل رہے۔

☆ سماج کے پس ماندہ، معذور اور کچلے ہوئے افراد کو سہارا دینے اور ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا اہتمام کرے۔

۵۔ حکومت یا مملکت

مملکت کا دائرۂ اختیار روز بروز وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ اجتماعی امور سے آگے بڑھ کر اب وہ

انفرادی زندگیوں میں بھی دخل دینے لگی ہے، اس کے وسائل و ذرائع بہت وسیع ہیں۔ شہریوں کی زندگی کا کوئی شعبہ اس کے اثرات سے خالی نہیں۔ چنانچہ تعلیم وتربیت کا بھی یہ سب سے بڑا اور سب سے موثر عامل ہے۔ ایسی صورت میں اس کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔

فرائض:

مملکت کے حسب ذیل فرائض ہیں:

☆ ابتدائی تعلیم وتربیت سے ہر شہری کو آراستہ کرنا۔

☆ بالغان کی تعلیم وتربیت کا بندوبست کرنا۔

☆ بلا لحاظ مذہب وملت، رنگ ونسل ہر ایک کو اس کی صلاحیت کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کے مواقع دینا۔

☆ علم وفن، طب وجراحت، صنعت وحرفت، انجینئرنگ وزراعت وغیرہ کی ترقی کے لیے چھوٹے بڑے طرح طرح کے متعدد ادارے قائم کرنا۔

☆ اقلیتوں کو اپنی پسند کے ادارے چلانے کی سہولتیں بہم پہنچانا۔

☆ پرائیویٹ اداروں کو حتی الامکان آزادی سے کام کرنے کے مواقع دینا۔

☆ شہریوں کی تعلیم وتربیت پر غیر معمولی توجہ دینا اور ملکی بجٹ میں اس کے لیے زیادہ سے زیادہ گنجائش نکالنا۔

☆ نادار طلبہ کی تعلیم کے لیے وظائف ومراعات کا بندوبست کرنا۔

☆ گونگے بہرے، اندھے غبی اور ذہنی یا جسمانی حیثیت سے معذور بچوں کے لیے ان کے مناسب حال تعلیم وتربیت کا انتظام کرنا۔

☆ تعلیم وتربیت کو آسان، دلچسپ، موثر اور ہمہ گیر بنانے کے طور طریقوں پر تجربات اور تحقیق کام کرنے نیز معیاری درسی وغیرِ درسی کتب تیار کرنے کے لیے سہولتیں بہم پہنچانا۔

☆ وسیع پیمانے پر اچھے کردار کے صاحب صلاحیت اساتذہ تیار کرنا۔

یہ ہیں تعلیم وتربیت کے مختلف عوامل۔ ان عوامل ہی کی اچھائی برائی، فرض شناسی، لاپروائی پر تعلیم وتربیت کے اچھے برے نتائج کا انحصار ہے لیکن جہاں تک خود ان عوامل کے برے یا بھلے ہونے کا تعلق ہے تو اس کا دارومدار ان اساسی تصورات ومعتقدات پر ہے، جو ان اداروں کے تشکیل پانے یا چلنے کے محرک ہوتے ہیں۔ اسی لیے اچھی تعلیم وتربیت کے لیے ان اداروں کو اچھا اور فرض شناس بنانے کی جدوجہد ہونی چاہیے اور یہ کام اسی وقت ہوسکتا ہے جب ان کی پشت پر کام کرنے والے تصورات ومعتقدات کی اصلاح کی جائے۔

............☆☆☆............

باب ۴:

تعلیم کا مقصد

تعلیم کے مفہوم کی طرح تعلیم کے مدعا میں بھی شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ والدین اپنے بچوں کو عموماً اسی لیے تعلیم دلاتے ہیں کہ وہ پڑھ لکھ کر کمانے کھانے کے قابل ہو جائیں۔ "تعلیم برائے معاش" ہی ان کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ اگرچہ زبان سے اعتراف کم ہی لوگ کرتے ہیں، بلاشبہ کمانا کھانا انسان کی بنیادی ضرورت ہے اور بہر حال اس بات کی کماحقہٗ فکر ہونی چاہیے کہ بچہ پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے لیکن انسانیت کا تقاضا صرف یہی تو نہیں ہے۔ تنہا اسی کو تعلیم کا بنیادی مقصد قرار دے دینے سے بچہ معاشی حیوان تو ضرور بن جائے گا، انسان ہرگز نہیں بن سکتا اور مسلمان کے نزدیک تو جان سے بھی زیادہ ایمان عزیز ہوتا ہے ایسی صورت میں معاش ہی کو مقصود زندگی ٹھہرا کر تعلیم و تربیت کے نظام کو اس کے گرد گھمانا دراصل بچے پر احسان نہیں صریح ظلم ہے۔

اسی طرح بیشتر اساتذہ بھی تعلیم کا مقصد زبان سے خواہ کچھ بیان کریں مگر عملاً "تعلیم برائے علمیت" ہی کے قائل نظر آتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ طلبہ اپنی ساری توجہ لکھنے پڑھنے، اپنی علمی لیاقت بڑھانے اور اچھے نمبروں سے امتحان پاس کرنے پر مرکوز رکھیں۔ شخصیت کے دیگر پہلو (جسمانی، عملی، اخلاقی وغیرہ) ان کی نظروں سے عموماً اوجھل رہتے ہیں۔ حالانکہ متوازن اور کامیاب زندگی کے لیے یہ پہلو بھی اتنے ہی نہیں بلکہ بسا اوقات اس سے بھی زیادہ توجہ کے محتاج ہوتے ہیں۔ علمی لیاقت میں اضافہ بلاشبہ نہایت ضروری بھی ہے اور غیر معمولی توجہ بھی چاہتا ہے لیکن شخصیت کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز یا علمیت پر قربان کر دینے کے نتائج بھی بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ ہمارا آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے اور اعلیٰ علمی لیاقت

رکھنے والے لوگ صحت، اخلاق یا عمل کے اعتبار سے ناقص رہ کر اپنے اور دوسروں کے لیے مفید ہونے کے بجائے انتہائی نکمے اور مضر ثابت ہوتے ہیں۔

تعلیم کے متعدد اور مقاصد بھی پیش کیے جاتے ہیں جن میں خاص خاص یہ ہیں:

۱ سماج کا بےنفس خادم بنانا۔

۲ شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو ہم آہنگی کے ساتھ سنوارنا۔

۳ مملکت کا اچھا شہری بنانا۔

۴ انفرادیت کی نشو ونما اور خودی کی تکمیل کرنا۔

۵ زندگی بسر کرنے کے لیے پورے طور سے تیار کرنا یعنی طلبہ کو اس لائق بنانا کہ وہ:

☆ اپنی ذات کا تحفظ کر سکیں۔

☆ عام ضروریات زندگی فراہم کر سکیں۔

☆ اولاد اور کنبے کی پرورش ونگہداشت کر سکیں۔

☆ سماجی تعلقات کو استوار رکھ سکیں۔

☆ فرصت کے اوقات کو اچھی طرح گزار سکیں۔

۶۔ اخلاق اور سیرت و کردار کو سنوارنا۔

۷۔ صحت مند جسم میں صحت مند دل و دماغ پروان چڑھانا وغیرہ۔

تعلیم کے مذکورہ مقاصد کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان میں سے ایک بھی تنہا مقصد نہیں بن سکتا کیونکہ ہر ایک الگ الگ ناقص یک رخا یا مبہم ہے۔

تعلیم کا صحیح مقصد:

”اللہ کا صالح بندہ بنانا ہے۔“

یعنی طلبہ کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنا، ان کے طبعی رجحانات کو صحیح رخ پر ڈالنا اور انہیں

ذہنی، جسمانی، عملی اور اخلاقی اعتبار سے بتدریج اس لائق بنانا کہ وہ اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں، کائنات میں اس کی مرضی کے مطابق تصرف کریں نیز انفرادی، عائلی اور اجتماعی حیثیت سے ان پر جو ذمہ داریاں ان کے خالق و مالک کی طرف سے عائد ہوتی ہیں ان سے وہ کما حقہ عہدہ برآ ہوسکیں۔

تعلیم کا یہی صحیح جامع اور بنیادی مقصد ہے، کیونکہ:

اللہ نے سب کو پیدا کیا ہے۔ وہی سب کو پالتا پوستا اور سب کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ وہی سب کا مالک معبود، حاکم اور بادشاہ ہے۔ اس کی سلطنت بے پایاں اور لامحدود ہے، ہماری یہ لمبی چوڑی زمین اس کی بے پایاں مملکت کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ اللہ نے اس کو طرح طرح کی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے۔ ان نعمتوں کو ہمارے تصرف میں دے کر ہمیں یہاں آباد کیا ہے۔ کائنات کی ساری چیزوں کا حقیقی مالک وہی ہے، ہم کو جو کچھ ملا ہے اسی کی امانت ہے، ہم اس کے بندے اور غلام ہیں۔ اس نے ہمیں زندگی گزارنے کا مفصل طریقہ بتا دیا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی نعمتوں کے شکر گزار ہوں، اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں اور اس کی سلطنت میں اس کی مرضی پوری کریں۔ اس نے ہم پر طرح طرح کی ذمہ داریاں ڈالی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو انجام دینے کے لیے اس نے ہمیں ایک سڈول جسم عطا فرمایا ہے۔ جس کے اندر مختلف قسم کی قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں، گردوپیش طرح طرح کے وسائل و ذرائع مہیا کیے ہیں۔ اس کی عطا کی ہوئی کوئی چیز بے کار نہیں ہے۔ ہماری فلاح اسی میں ہے کہ ہم اللہ کی بخشی ہوئی قوتوں، صلاحیتوں اور ساز و سامان کو اس کی مرضی کے مطابق صرف کریں۔ یعنی اس کے شکر گزار اور صالح بندے بن کر رہیں۔

ظاہر ہے یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب تعلیم و تربیت میں مندرجہ ذیل باتیں ملحوظ رہیں:

۱۔ جسمانی صحت:۔ اللہ تعالیٰ نے جو سڈول جسم عطا فرمایا ہے اس کی صحت و نشو و نما سے

لیے ضروری معلومات بہم پہنچانا۔

حفظان صحت کے اصولوں کی پابندی کرانا، جسمانی محنت، ورزش یا کھیل اور صفائی ستھرائی کا عادی بنانا اور احتیاطی تدابیر بتانا۔

۲۔ فطری قوتوں اور صلاحیتوں کی نشوونما: اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جو فطری قوتیں وصلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں، وہ سب اس کے لیے نہایت ضروری اور کارآمد ہیں۔ ان سب کو پروان چڑھانے کی فکر کرنا۔ ان کے مناسب استعمال کے ضمن میں مدد اور رہنمائی کرنا۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی نہ تو دبانا اور کچلنا اور نہ ان کو نظر انداز کرنا۔

۳۔ فطری خواہشات ومیلانات کو صحیح رخ پر ڈالنا اور پسندیدہ نیز مفید مشاغل میں دلچسپی پیدا کرنا۔ اسلامیات، زبان وادب، معاشرتی علوم اور بیرون نصاب مصروفیات وغیرہ کے ذریعے یہ کام کیا جائے تاکہ بچے اپنے فرصت کے اوقات پسندیدہ اور مفید مشاغل میں صرف کرنے کے عادی بنیں۔

۴۔ صحیح انداز سے سوچنے اور برے بھلے حق وباطل میں تمیز کرنے کی کسوٹی فراہم کرنا تاکہ غلط افکار اور باطل نظریات کا شکار نہ ہوں۔

۵۔ انفرادی عائلی اور اجتماعی ذمہ داریوں کا صحیح علم اور انہیں انجام دینے کی عملی تربیت کرنا۔

۶۔ قدرت کے کارخانہ کا علم بہم پہنچانا اور اس کے پوشیدہ اور کھلے ہوئے خزانے کا صحیح مصرف بتانا۔

۷۔ لکھنا پڑھنا اور دیگر معلومات فراہم کرنا۔

۸۔ ٹھوس سیرت وکردار کا حامل بنانا۔

یہ ہیں وہ اعلیٰ اور پاکیزہ مقاصد جو بچوں کی تعلیم وتربیت میں بڑوں کے پیش نظر ہونے چاہئیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بچوں کو قبل از وقت بالغ بنانے کی کوشش کی جائے یا ان کی عمر کی خصوصیات دلچسپیوں اور میلانات کو نظر انداز کر کے تعلیم وتربیت کا پروگرام بنایا جائے۔

مستقبل کی فکر میں لوگوں سے عموماً ایسی چوک ہو جاتی ہے چنانچہ بچوں پر اس کا شدید ردعمل ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت میں بغاوت یا منافقت کے جراثیم پلنے لگتے ہیں اور ان کی ذہنی وجسمانی صلاحیتیں ٹھٹھرنے لگتی ہیں۔ اس لیے ان اعلیٰ مقاصد کو ہر وقت اپنے سامنے ضرور رکھا جائے۔ لیکن بچوں سے نہ تو بہت اونچی توقعات وابستہ کی جائیں اور نہ کوئی چیز قبل از وقت ان پر تھوپی جائے بلکہ تعلیم وتربیت کا پروگرام مرتب کرتے وقت ان کی بچگانہ خصوصیات اور دلچسپیوں کا حتی الامکان لحاظ رکھا جائے اور انہی راستوں سے بتدریج یہ مقاصد بروئے کار لائے جائیں۔

۱۔ تعلیم کا مقصد پرخلوص نیکی کے ذریعے شادمانی کا حصول ہے۔ (ارسطو)

۲۔ تعلیم کا مقصد مثالی انسان کی تکمیل ہے۔ (چین)

۳۔ تعلیم سے مراد مکمل انسان کی تربیت۔ (کامینیس)

۴۔ تعلیم سے مراد ہے شعوری یا ارادی ارتقا۔ (ڈیوڈسن)

۵۔ تعلیم ایک ہنر ہے جس سے ماہرین خصوصی نہیں بلکہ انسان بنائے جاتے ہیں۔ (مانٹین)

۶۔ سنگ مرمر کے ٹکڑے کے لیے جس طرح سنگ تراشی ہے ویسے ہی انسانی روح کے لیے تعلیم ہے۔ (ایڈیسن)

۷۔ تعلیم کا مقصد علم سے بھر دینا نہیں ہے بلکہ قوت کی تربیت کرنا ہے۔ (آرکٹ)

۸۔ تعلیم کا مقصد کھری، پرخلوص، بے عیب اور پاک صاف زندگی بسر کرنے کے قابل بنانا ہے۔ (فروبل)

۹۔ تعلیم سے مراد تجربہ کی از سر نو تشکیل ہے جس میں فرد کو اپنی قوتوں پر زیادہ تسلط پانے کے قابل بناتے ہوئے اس کے تجربے میں وسعت پیدا کی جاتی ہے اور اسے سماجی لحاظ سے زیادہ مفید بنایا جاتا ہے۔ (ڈیوی)

۱۰۔ عام طور پر انسانیت کا اعلیٰ ترین مقصد اخلاق تسلیم کیا جاتا ہے اور بنا بریں تعلیم کا بھی۔

(ہربارٹ)

باب ۵:

مختلف تعلیمی نظریات

زندگی کے دوسرے تمام شعبوں کی طرح تعلیم کے بارے میں بھی مختلف نظریات ہیں لیکن ہم یہاں صرف مندرجہ ذیل تین اہم نظریات سے بحث کریں گے۔

۱۔ اشتراکی۔ ۲۔ جمہوری۔ ۳۔ اسلامی

دنیا کی سربراہ کاری آج امریکہ اور روس کے ہاتھ میں ہے۔ نظریات کے میدان میں بھی یہی دونوں پیش پیش ہیں، امریکہ جمہوریت کا علمبردار ہے اور روس اشتراکیت کا۔

دنیا کے وہ تمام ممالک جو امریکہ سے مرعوب و متاثر ہیں وہ قوم پرستانہ جمہوریت میں یقین رکھتے ہیں اور اپنے یہاں کا تعلیمی ڈھانچہ بھی اسی نظریہ کے تحت مرتب کرتے ہیں اور جو لوگ روس کے آلہ کار ہیں وہ کلیت پسندانہ اشتراکیت کو اپناتے ہیں اور ان کے نظام تعلیم پر بھی اس کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔ اسی لیے تعلیم کے غیر اسلامی نظریات میں ہم نے صرف انہی دو کو بحث کے لیے منتخب کیا ہے۔

۱۔ اشتراکی نظریۂ تعلیم

اشتراکیت ایک مادہ پرستانہ نظام ہے جو اپنی مذہب دشمنی اور اخلاقی و روحانی قدروں کی بیخ کنی کے لیے مشہور ہے۔ طبقاتی کشمکش چھیڑ کر وہ اپنا الو سیدھا کرتی ہے۔ افراد اور ان کی انفرادیت اس کے نزدیک ناقابل لحاظ ہیں، شہریوں کی جان و مال ان کی عزت و آبرو اور مملکت کے سارے وسائل و ذرائع کی مالک اسٹیٹ ہوتی ہے۔ چنانچہ اشتراکی نظام خدا سے مکمل بغاوت کرنے اور افراد کی انفرادیت کو کچلنے کے درپے رہتا ہے، اسے فطرت کے خلاف مسلسل جنگ کرنی پڑتی ہے، اسے ہر آن جوابی انقلاب کا خطرہ رہتا ہے، اسی لیے اپنی بقا و استحکام کے لیے اسے جبر و استبداد اور

کلیت وآمریت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

تعلیم کا مقصد:

اشتراکیت کے علمبردار دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ تعلیم وتربیت کے ذریعے ہم افراد کو "سماج کا بے نفس خادم" بنانا چاہتے ہیں لیکن وہ دراصل طلبہ کی فطری صلاحیتوں اور انفرادی خصوصیات کو اس انداز سے موڑنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنی شخصیت کو اجتماعی مادی مفاد پر قربان اور اپنی انفرادیت کو اجتماعیت میں گم کر دیں، وہ طلبہ کو مادہ پرست، مذہب دشمن اور خدا کا باغی بناتے ہیں، ان کے اندر طبقاتی منافرت پیدا کرتے ہیں اور انہیں جانوروں سے بدتر بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ اس طرح چند افراد یا ایک مختصر سی پارٹی مملکت کے سارے وسائل وذرائع اور سب کے جسم وجان پر قابض ہو کر دو وقت کی روٹی کے عوض ہر ایک کو بے ضمیر اور اپنا آلہ کار بنا لیتی ہے، اور کہا یہ جاتا ہے کہ ہم نے انسان کا معاشی مسئلہ حل کر دیا ہے اگر یہ دعویٰ مان بھی لیا جائے تو:۔

"راتب بندی کا رزق جس کی کنجیاں دوسرے کے ہاتھوں میں ہوں اگر فراواں بھی ہو تو خوشگوار نہیں کیونکہ اس سے پرواز میں جو کوتاہی آتی ہے محض جسم کی فربہی اس کی تلافی نہیں کر سکتی۔"

اشتراکی نظام تعلیم کی خصوصیات:

اشتراکی نظریۂ تعلیم کی اساس پر جو تعلیمی نظام تشکیل پاتا ہے اس میں مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں:

۱۔ تعلیم سب کے لیے عام اور لازمی ہوتی ہے تاکہ مملکت کے تمام افراد اشتراکیت سے متاثر اور اس نظام کے مؤید اور خادم بن سکیں۔

۲۔ تعلیم کا پورا نظام اسٹیٹ کے کنٹرول میں ہوتا ہے۔ حکومت کے مرتب کردہ ڈھانچے کے مطابق ہر ایک کو تعلیم دی جاتی ہے۔ پرائیویٹ اداروں کے قیام کی قطعاً اجازت نہیں تاکہ طلبہ کے کانوں میں حکومت یا اشتراکیت کے خلاف کوئی بات نہ پڑنے پائے۔

۳۔ تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ تعلیم خواہ عمومی نوعیت کی ہو یا پیشہ وارانہ، صنعتی ہو یا زراعتی، سارے مصارف اسٹیٹ خود برداشت کرتی ہے۔ طلبہ کو کھانا، کپڑا اور تعلیمی سامان بھی اسٹیٹ کی طرف سے مفت فراہم کیا جاتا ہے۔

۴۔ تمام بچوں کے لیے اوائل عمری سے تعلیم کا بندوبست کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ بچوں کے ذہن پر شروع ہی سے اشتراکیت کی گہری چھاپ پڑ سکے۔ اس کے لیے والدین کو خاص انداز سے ٹریننگ دی جاتی ہے اور مدارس اطفال (نرسری اسکولوں) کا وسیع پیمانے پر انتظام کیا جاتا ہے۔

۵۔ بلا لحاظ مذہب وملت، رنگ، نسل، جنس وطبقہ ہر ایک کو ایک سی تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے، ذہنی اور جسمانی کام کرنے والوں میں بھی تفریق نہیں کی جاتی، سب کو ایک ہی ڈنڈے سے ہانکا جاتا ہے۔

۶۔ مذہب، اخلاق، روحانیت یا زندگی کی مستقل قدروں کو اس نظام تعلیم میں کوئی جگہ نہیں دی جاتی۔ اس کے برعکس مادہ پرستی، الحاد، مذہب دشمنی اور طبقاتی منافرت کوٹ کوٹ کر بھرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ سماج کے موجودہ ڈھانچے کو بیخ وبن سے اکھاڑ کر خالص مادہ پرستی اور دہریت کی بنیادوں پر سماج کی تشکیل کی جاسکے۔

۷۔ مدرسے کے تمام مضامین، مصروفیات ومشاغل میں افادی نقطہ نظر حاوی رہتا ہے۔ وہی کچھ سکھایا پڑھایا اور کرایا جاتا ہے جس سے مادی فائدہ پہنچے اور ملکی پیداوار نیز قومی دولت میں اضافہ ہو۔ اسی لیے حرفہ جات ہی کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے، مدارس، مقامی صنعتوں سے مربوط کر دیئے جاتے ہیں اور طلبہ کو فارموں یا کارخانوں وغیرہ میں عملی تعلیم حاصل کرنی ہوتی ہے۔

۸۔ مملکت کے دیگر ادارے تعلیمی اداروں کے ساتھ پورا تعاون کرتے ہیں۔ چونکہ اشتراکی نظام میں ساری صنعت وحرفت، تجارت وزراعت وغیرہ مملکت ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے

اس لیے کارخانے، فارم اور دیگر سرکاری ادارے مدارس کی ہر ممکن مدد کرتے ہیں۔

۹۔ مملکت کو اپنے منصوبے کے مطابق جس لیاقت وصلاحیت اور جس فنی مہارت کے جتنے کارکن مطلوب ہوتے ہیں سب کو اپنے کنٹرول اور نگرانی میں تیار کراتی ہے، تاکہ مملکت کی ضروریات اور افراد کی صلاحیتوں میں توازن رہے۔

۱۰۔ نصاب تعلیم، درسی کتب اور طریق تعلیم سب اسٹیٹ کا تجویز کردہ ہوتا ہے۔ طلبہ کو مضامین کے انتخاب اور اساتذہ کو طریقہ تعلیم وغیرہ کے ضمن میں قطعاً کوئی آزادی نہیں دی جاتی۔ اسی لیے پورا نظام تعلیم جامد اور بے لچک ہوتا ہے اور اس میں غیر معمولی یکسانیت پائی جاتی ہے۔

اس نظام کی خوبیاں اور خامیاں:

اس نظام میں اگرچہ بعض خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں، مثلاً:

خوبیاں:

☆ افراد میں اجتماعی مفاد کی خاطر ذاتی مفاد کو قربان کرنے کی غیر معمولی اسپرٹ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

☆ طلبہ کو جسمانی محنت ومشقت کا عادی بنایا جاتا ہے اور وہ ہاتھ سے کام کرنے کو عار نہیں سمجھتے۔

☆ نظری کے بجائے عملی تعلیم پر زور دینے کی وجہ سے طلبہ اپنے علم کو عمل میں لانے کے طریقوں سے بخوبی واقف ہوتے ہیں اور نظری کے بجائے عملی انسان بنتے ہیں۔

☆ معاشی ومعاشرتی مساوات اور دولت کی مساوی تقسیم پر ابتدا ہی سے غیر معمولی زور دینے کے باعث طلبہ میں اونچ نیچ، امیر غریب وغیرہ کا فرق وامتیاز نہیں ہوتا۔

☆ مفت عمومی اور جبری تعلیم کی وجہ سے ہر فرد تعلیم یافتہ ہو جاتا ہے۔

☆ تعلیم میں یکسانیت کے باعث افراد میں وحدت فکر کا زیادہ امکان رہتا ہے اور فکری وعملی انتشار کا زیادہ اندیشہ نہیں ہوتا۔

☆ سب کچھ اسٹیٹ کے کنٹرول میں ہونے کے باعث گھر، مدرسے، سماج اور اسٹیٹ کے مختلف اداروں میں مکمل تعاون اور ہم آہنگی ہوتی ہے جس سے بچوں کی تعلیم میں بہت سہولت ہو جاتی ہے۔

☆ تعلیم پر اسٹیٹ کا مکمل کنٹرول ہونے کے باعث مملکت کی ضرورت کی مناسبت سے تعلیم دی جاتی ہے اس لیے تعلیم یافتہ بے کاروں کا مسئلہ نہیں اٹھتا

لیکن ان خوبیوں کے ساتھ بعض ایسی بنیادی خامیاں پائی جاتی ہیں جو اس نظریئے کی ساری افادیت پر پانی پھیر دیتی ہیں اور اسے ناقابل قبول ٹھہراتی ہیں۔ مثلاً:

خامیاں:

☆ خدا سے بغاوت، مذہب دشمنی اور اخلاقی قدروں کی پامالی کا درس لے کر پروان چڑھنے والے افراد انسانیت کے حق میں درندے ہی ہو سکتے ہیں۔ ان سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ وہ نہ صرف دوسروں کے حق میں ظالم ہوتے ہیں بلکہ اپنے آپ پر بھی ظلم کرتے ہیں اور موقع ملے تو اسٹیٹ کو بھی نہیں بخشتے۔

☆ افراد کی انفرادیت کچل کر رکھ دی جاتی ہے۔

☆ جبر اور بیرونی دباؤ کے باعث طلبہ کو اپنی خواہش، رائے اور ضمیر سے مسلسل جنگ کرنی پڑتی ہے۔ وہ ذہنی کشمکش کے شکار ہو جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسے طلبہ کبھی ٹھوس سیرت وکردار کے مالک نہیں بن سکتے۔

☆ مادہ پرستی اور افادی نقطہ نظر غالب ہونے کی وجہ سے خود غرضی عام ہو جاتی ہے۔

☆ ہر چیز اوپر سے تھوپنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اساتذہ اور طلبہ سب کام کو بیکار سمجھنے لگتے ہیں اور

عام طور پر چوری کی عادت پڑ جاتی ہے اور پوری قوم ڈنڈے کے زور سے چلنے کی عادی ہو جاتی ہے۔

☆ افراد کی شخصیت کے متعدد پہلو نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں اور ہم آہنگ نشو ونما نہ ہونے کی وجہ سے بہت ناقص شخصیت پروان چڑھتی ہے۔

☆ پیداوار اور قومی دولت میں اضافے کو غیر معمولی اہمیت دے کر تعلیم وتربیت کے ذریعے افراد کو معاشی حیوان کی سطح پر اتار لایا جاتا ہے۔ کھانے کمانے کے سوا زندگی میں اور کسی چیز کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہنے دی جاتی۔

☆ مملکت کے چند ذمہ دار افراد کے سوا باقی تمام افراد کو ذہنی جمود وتعطل کا شکار بنا دیا جاتا ہے۔

☆ افراد کو دنیا کے سکون اور آخرت کی فلاح دونوں سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

۲۔ جمہوری نظریہ تعلیم

آمریت یا ملوکیت کے برعکس جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ کے مالک تمام باشندگان ملک ہوتے ہیں۔ انہی کی مرضی سے حکومتیں قائم ہوتی اور قوانین بنتے ہیں۔ مملکت پر کسی فرد، خاندان یا گروہ کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔ عوام کے منتخب نمائندے حکومت چلاتے ہیں۔ انتخابات عموماً چار پانچ سال میں منعقد ہوتے ہیں، کثرت رائے سے جو لوگ بھی منتخب ہو جائیں متعین مدت تک وہی حکومت کے ذمہ دار ہوتے ہیں، انتخابات کی بنیاد عموماً بالغ رائے دہندگی ہوتی ہے۔ سب کو ووٹ دینے اور امیدوار بننے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ ہر ایک کا ووٹ برابر شمار کیا جاتا ہے۔ کثرت رائے سے حکومت بدلی جا سکتی ہے۔ اس طرح جمہوریت مندرجہ ذیل چیزوں پر یقین رکھنے کا دعویٰ کرتی ہے۔

ا۔ افراد کی آزادی پر یقین:

یعنی مملکت کے ہر شہری کو زندہ رہنے، گھومنے، پھرنے، جماعت بنانے، اجتماعات کرنے کی

آزادی ہے۔ تحریر، تقریر عقیدہ و مسلک، رائے، ضمیر وغیرہ کی آزادی اور تعلیم و تبلیغ کا حق حاصل ہے۔ شرطیکہ اس سے ملک وقوم یا دوسرے شہریوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے یا دوسروں کے حقوق پر دست درازی نہ کی جائے۔

۲۔ مساوات پر یقین:

یعنی تمام شہری برابر ہیں، ذات پاک، رنگ ونسل، عقیدہ و مسلک یا جنس و دولت کی بنا پر شہریوں کے مابین فرق و امتیاز نہ برتا جائے۔ ہر ایک کو آگے بڑھنے کے مساوی مواقع حاصل ہوں۔ جو بھی جس مقام و منصب کے لیے ضروری صفات و صلاحیتیں بہم پہنچائے وہ اس پر فائز ہو سکے۔

۳۔ اجتماعیت اور ہم وجودیت پر یقین:

مملکت کے تمام شہری مل جل کر رہیں، ایک دوسرے کی شخصیت و انفرادیت کا لحاظ رکھیں اور ملک وقوم کے مفاد کے لیے باہم تعاون کریں۔

۴۔ تبدیلی میں یقین:

تبدیلی فطری ہے۔ یہی زندگی اور ترقی کی علامت ہے۔ زمانہ ہر گھڑی بدلتا رہتا ہے۔ مملکت کے حالات و ضروریات میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ نئے حالات، نئے مسائل کھڑے کرتے ہیں۔ اس لیے مملکت کی بقا، استحکام اور ترقی کے لیے اس کے نظام، پالیسی اور پروگرام میں بھی حسب ضرورت تبدیلی ہونی چاہیے لیکن یہ تبدیلی اسی وقت مفید اور نتیجہ خیز ہو سکتی ہے جب اس کے لانے میں شہریوں کی رائے اور مرضی کو دخل ہو کوئی چیز اوپر سے نہ تھوپی جائے۔

تعلیم کا مقصد:

چونکہ جمہوری نظام کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار مملکت کے شہریوں کی صلاحیت پر ہوتا ہے

اس لیے جمہوریت کے علمبرداروں کے نزدیک تعلیم کا مقصد افراد کو ''مملکت کا اچھا شہری بنانا۔''
ہے لیکن قومی جمہوریتوں میں بھی چونکہ

☆ مادی ترقی اور معاشی خوش حالی ہی کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے اور اس کے لیے شہریوں میں باہم اور دوسری مملکتوں سے برابر دوڑ لگی رہتی ہے۔

☆ شہریوں کو مسلسل وطن پرستی اور قومی عصبیت کا نشہ پلایا جاتا رہتا ہے۔

اس لیے یہاں بھی اخلاقی قدریں عملاً اضافی ہو جاتی ہیں اور ان کی کوئی مستقل حیثیت باقی نہیں رہتی اور جہاں مملکت کے مفاد اور اخلاقی اصولوں میں باہم ٹکراؤ نظر آتا ہے وہاں ایک اچھے شہری سے اصولوں کو خیر باد کہہ دینے اور اخلاقی وروحانی قدروں کو قربان کر دینے کی توقع کی جاتی ہے جب کہ ایک اچھے آدمی سے ایسا ہرگز متوقع نہیں۔ اس لیے لفظ ''اچھا'' سے غلط فہمی نہ ہونی چاہیے، اچھے شہری اور اچھے آدمی کی صفات اکثر امور میں باہم متضاد شمار ہوتی ہیں۔

جمہوری نظام تعلیم کی خصوصیات:

اس نظریہ پر مبنی تعلیم کا جو نظام تشکیل پاتا ہے اس میں مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں:

۱۔ ابتدائی تعلیم عمومی اور لازمی ہوتی ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ تمام شہری بنیادی تعلیم وتربیت سے آراستہ ہو جائیں۔

۲۔ عام ابتدائی تعلیم مفت دینے کی کوشش کی جاتی ہے تا کہ کوئی شہری وسائل کی کمی کے باعث بنیادی تعلیم سے محروم نہ رہ جائے۔

۳۔ بلا لحاظ مذہب وملت، رنگ ونسل یا فرقہ وطبقہ وغیرہ ہر ایک کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے یکساں مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ کسی کے ساتھ فرق وامتیاز نہیں برتا جاتا۔

۴۔ طلبہ کی انفرادی خصوصیات اور ان کے مابین صلاحیتوں کے فرق کا لحاظ رکھ کر ان پر انفرادی توجہ دی جاتی ہے تا کہ ہر فرد اپنی صلاحیت کے مطابق آگے بڑھ سکے۔

۵۔ فرد اور سماج دونوں کو اہمیت دی جاتی ہے۔ کسی ایک کو دوسرے پر قربان نہیں کیا جاتا بلکہ جہاں فرد کو زیادہ سے زیادہ ترقی کے مواقع دیئے جاتے ہیں، وہیں اس کو اجتماعی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لیے بھی تیار کیا جاتا ہے۔

۶۔ معلم اور متعلم دونوں کی آزادی کا احترام کیا جاتا ہے معلم ڈکٹیٹر کے بجائے شفیق رہنما کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ جبر اور خارجی دباؤ سے کام نہیں لیتا بلکہ آزادی کی فضا میں تعلیم دیتا ہے۔ معلم کو بھی طریق تعلیم اور انتظام مدرسہ وغیرہ کے معاملے میں زیادہ سے زیادہ آزادی دی جاتی ہے۔

۷۔ مادی اور افادی نقطہ نظر کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے لیکن زندگی کی اعلیٰ قدروں کو بالکل نظر انداز نہیں کر دیا جاتا۔ کم از کم قومی وملکی سطح پر اس کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔

۸۔ مذہب کو افراد کا پرائیویٹ معاملہ سمجھا جاتا ہے اور اسے پوجا پاٹ تک محدود رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اجتماعی معاملات میں اس کی مداخلت کو صحیح نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے مذہبی تعلیم کو افراد اور نجی اداروں کی صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ حکومت اپنے اداروں میں اس کا انتظام نہیں کرتی۔

۹۔ مملکت کے مختلف مذہبی، لسانی، تہذیبی یا طبقاتی گروہوں کے مابین زیادہ سے زیادہ مشترک دلچسپیاں پیدا کرانے کی کوشش کی جاتی ہے اور ان کی انفرادیت کو بتدریج محدود سے محدود تر کر کے سب کو بالآخر ایک قوم اور ایک کلچر تک لانے کی فکر کی جاتی ہے۔

۱۰۔ پرائیویٹ اداروں کے قیام کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ افراد اور گروہوں کا یہ حق تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ادارے چلا سکیں اور اپنے بچوں کو اپنی مرضی کی تعلیم دے سکیں۔

۱۱۔ تعلیم کے نظام میں مرکز کم سے کم مداخلت کرتا ہے۔ لوکل باڈیز اور صوبائی حکومتوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جاتے ہیں تاکہ جمہوریت کی رنگارنگی برقرار رہے۔ لوگ زیادہ سے زیادہ آزادی کی فضا محسوس کریں اور آزادی سے تجربات کر سکیں۔

۱۲۔ تمام باشندگان ملک کو متحد رکھنے اور ان میں یک جہتی پیدا کرنے کے لیے قوم پرستی اور وطنیت کے جذبے کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جاتا ہے۔

تبصرہ:

قوم پرستانہ جمہوری نظام تعلیم میں جہاں متعدد خوبیاں ہیں۔ مثلاً

☆ افراد کی آزادی کا احترام اور شخصیت کو پروان چڑھنے کے لیے آزادی کی فضا۔

☆ ہمہ گیر لازمی اور مفت ابتدائی تعلیم کا بندوبست۔

☆ مساوات اور آگے بڑھنے کے یکساں مواقع۔

☆ صلاحیت اور محنت کے لحاظ سے ترقی کرنے کی پوری گنجائش۔

☆ تہذیب و تمدن اور مذہب و اخلاق کا کسی درجہ میں پاس ولحاظ وغیرہ

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نظام تعلیم میں بعض بنیادی خامیاں بھی ہیں مثلاً

☆ ابتداء ہی سے قوم پرستی اور وطنیت کا نشہ پلا کر شہریوں کو تعصب و تنگ نظری اور قومی خود غرضی کا شکار بنا دیا جاتا ہے۔ ملکی حدود کے باہر بسنے والوں کے لیے ان کے دلوں میں عموماً گنجائش باقی نہیں رہتی بلکہ ان کے خلاف معاندانہ جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے لوگوں سے انسانیت کے حق میں کسی خیر کی توقع کم ہی کی جاسکتی ہے۔

☆ مذہبی تعلیم کو نظر انداز کر کے یا سرپرستوں اور پرائیویٹ اداروں کی صوابدید پر چھوڑ کر ایک بہت بڑی تعداد کا رشتہ مذہب و اخلاق سے کاٹ دیا جاتا ہے کیونکہ لوگ اپنے طور پر بہت محدود اور ناقص انتظام کر پاتے ہیں۔

☆ زندگی کے تمام شعبوں خصوصاً اجتماعی امور میں خدا کی ہدایت سے بے نیاز بنا کر شہریوں کو فلاح دارین سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

☆ اپنے اور پرایوں کے لیے الگ الگ پیمانے تشکیل دے کر اخلاقی قدروں کو اضافی حیثیت

دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ لوگوں میں اصول پسندی باقی نہیں رہتی اور وہ رفتہ رفتہ اپنوں کے ساتھ بھی دھاندلی کرنے لگتے ہیں۔

ج۔ حق وانصاف اور زندگی کے مستقل اصولوں کے بجائے کثرت رائے کو فیصلہ کی اساس قرار دینے کی وجہ سے اقلیتوں کے ساتھ عموماً کم ہی انصاف کیا جاتا ہے۔

چنانچہ قوم پرستانہ جمہوری نقطۂ نظر سے تعلیم دینے کے نتیجے میں عموماً ''بے اصل مفسد'' ہی پیدا ہوتے ہیں۔

۳۔ اسلامی نظریۂ تعلیم

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ اللہ کے نزدیک ساری انسانیت کے لیے واحد مستند دین یہی ہے۔ صرف اس کو اپنا کر انسان فلاح دارین حاصل کر سکتا ہے۔

اسلامی نظام کی اساس:

۱۔ توحید: ساری کائنات کا خالق، رازق، مالک اور فرمانروا اللہ ہے۔ سارے انسان اس کے بندے اور غلام ہیں۔ سروری اور فرمانروائی صرف اس کے لیے مخصوص ہے ہر ایک کو اس کا تابع فرمان بن کر رہنا چاہیے اور اس کے آگے سر جھکانا چاہیے۔

۲۔ رسالت: اللہ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے رسول بھیجے۔ رسول اپنے ساتھ اللہ کے فرمان لائے۔ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں۔ آنحضرت ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آپ ﷺ اللہ کا فرمان، قرآن لائے اور اللہ کی مرضی پر چل کر دکھایا۔

اللہ کی کتاب (قرآن) اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع ہی میں سارے انسانوں کی نجات ہے۔

۳۔ آخرت: سارے انسانوں کو مر مٹ کر ایک روز اللہ کے حضور کھڑا ہونا اور اپنے سارے کاموں کا حساب دینا ہے۔ کوئی بھی اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتا، ہر ایک کو اپنے کئے کا برا

یا بھلا بدلہ پانا ہے۔

۴۔ خلافت: ہماری یہ زمین اللہ کی بے پایاں مملکت کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ انسان اس زمین پر اللہ کے نائب یا خلیفہ ہیں۔ ان کے لیے صحیح رویہ یہی ہے کہ اللہ کی زمین پر اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزاریں، خدا ترسی، پرہیزگاری، انتظامی صلاحیت اور جمہور کا اعتماد سربراہی وسرداری کے لیے ضروری صفات ہیں۔ ذمہ داروں کا فرض ہے کہ وہ اجتماعی نظام، عدل وانصاف پر قائم کریں، برائیاں مٹائیں، بھلائیوں کو فروغ دیں اور جمہور کو اللہ کی مرضی کے مطابق چلائیں۔

۵۔ وحدت بنی آدم، مساوات اور اخوت: سارے انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ اس لیے آپس میں برابر اور بھائی بھائی ہیں۔ رنگ ونسل کا فرق وامتیاز، ذات پات چھوت چھات یہ سب غلط اور من گھڑت باتیں ہیں۔ عربی کو عجمی پر، گورے کو کالے پر اور امیر کو غریب پر، برہمن کو اچھوت پر کوئی فضیلت نہیں۔ سب سے شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار اور خدا ترس ہے۔

۶۔ آزادی: چھوٹے بڑے، امیر غریب، مرد عورت، مالک نوکر، سب اللہ کے بندے اور اس کے تابع فرمان ہیں۔ مطلق آزاد کوئی بھی نہیں۔ البتہ انسانوں کے تعلق سے ہر ایک آزاد ہے۔ ہر فرد کو اللہ نے اس کی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا کیا ہے، کسی انسان کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسروں کی آزادی سلب کر لے یا اللہ کے بندوں کو اپنا بندہ بنائے اور انہیں اپنی مرضی پر چلائے۔

۷۔ عقیدہ: مسلک ضمیر اور رائے کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ جس عقیدہ مسلک یا رائے پر جس کو اعتماد ہو وہ اسے اختیار کر سکتا ہے۔ اگرچہ سارے انسانوں کے لیے صحیح رویہ یہی ہے کہ وہ اسلام کو اپنا کر فلاح دارین حاصل کریں۔

۸۔ ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے۔ سب کی بنیادی ضروریات لازماً پوری ہونی چاہئیں۔ یہ جو کا

کھانے کا، ننگا کپڑے کا، مریض دوا اور علاج کا مستحق ہے۔ اس کا یہ حق بہر حال اسے ملنا چاہیے۔

۹۔ ہر انسان کی جان ومال، عزت آبرو محترم ہے۔ اس پر دست درازی نہیں کی جاسکتی۔

۱۰۔ ہر ایک دوسرے کے لیے وہی پسند کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔

۱۱۔ نیک کام میں تعاون کیا جائے۔ برے کام میں کسی سے تعاون نہ کیا جائے۔

۱۲۔ زندگی بسر کرنے کے سیدھے سچے طریقے سے جو واقف ہیں وہ انہیں بتائیں جو ناواقف ہیں۔

تعلیم کا مقصد:

ان اساسی تصورات سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم وتربیت کا مقصد فرد کو

"اللہ کا صالح بندہ بنانا" ہے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو صفحات ۵۰ تا ۵۳

اسلامی نظام تعلیم کی خصوصیات:

اسلامی نظام تعلیم مندرجہ ذیل خصوصیات کا حامل ہوتا ہے:

۱۔ بنیادی دینی تعلیم ہر مسلمان مرد عورت کے لیے لازمی ہوتی ہے کیونکہ **طلب العلم فریضة علی کل مسلم ومسلمة** (ابن ماجہ)

"(دین کا ضروری) علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد عورت پر فرض ہے۔"

اس فرض کی ادائیگی کے لیے ہر فرد کو پوری سہولت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ متعلم خود بھی فکر مند ہوتا ہے اور معلم، سرپرست، مسلم معاشرہ اور اسلامی نظام سب اس کار خیر میں پورا تعاون کرتے ہیں۔

۲۔ پڑھنے پڑھانے اور تعلیم کو عام کرنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے تاکہ کوئی بھی علم سے کورا نہ رہ جائے۔

تعلموا العلم وعلموه الناس. (بیہقی)

''علم سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔''

۳۔ مفید اور نفع بخش علوم کا پڑھنا پڑھانا کار ثواب شمار ہوتا ہے اور پورے خلوص اور انہماک سے پڑھا پڑھایا جاتا ہے۔

العالم والمتعلم شریکان فی الاجر (ابن ماجہ)

''عالم اور متعلم اجر میں دونوں شریک ہیں۔''

من دل علٰی خیر فله مثل اجر فاعلیه. (مسلم)

''جو شخص کسی بھلائی کی طرف راہنمائی کرے اس کو بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ اس نیکی کرنے والے کو۔''

من سلک طریقا یلتمس فیه علما سهل الله له به طریقا الی الجنة. (مسلم)

''جو شخص ایسی راہ اختیار کرے جس میں اسے علم حاصل ہو تو اس کی بدولت اللہ اس کے لیے جنت کی راہ آسان کر دے گا۔''

معلم الخیر یستغفر له کل شیٔ (ترمذی)

''معلم خیر کے لیے تمام چیزیں دعائے مغفرت کرتی ہیں۔''

من خرج فی طلب العم فهو فی سبیل الله حتّٰی یرجع. (ترمذی)

''جو علم حاصل کرنے کے لیے گھر سے نکلے وہ اللہ کی راہ (جہاد) میں ہے جب تک واپس نہ آجائے۔''

ان الملٰئکة لتضع اجنحتها بیضا یطالب العلم. (ابوداؤد)

''طالب علم کی خوشی کے لیے فرشتے اس کے روبرو اپنے پر بچھاتے ہیں۔''

۴۔ غیر مفید اور ضرر رساں علوم کے پیچھے پڑنے سے روک دیا جاتا ہے۔

تعوذوا باللہ من علم لاینفع. (ابن ماجہ)

''اس علم سے اللہ کی پناہ مانگو جو نفع نہ دے۔''

۵۔ حسب ضرورت تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ غیر مستطیع اور نادار طلبہ کی تمام ضروریات کی کفالت کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ ہر مستطیع اس کام میں تعاون کو کار خیر اور زکوٰۃ وصدقات کا بہترین مصرف سمجھتا ہے۔

۶۔ ہر متعلم کو علم پر عمل کرنے اور دوسروں تک علم پہنچانے کی ترغیب وتربیت دی جاتی ہے۔

العلم علمان علم فی القلب فذاک العلم النافع وعلم علی اللسان فذاک حجۃ اللہ علی ابن ادم. (دارمی)

''علم دو طرح کا ہوتا ہے ایک تو وہ جو زبان سے گزر کر دل میں گھر کر لیتا ہے یہی نفع بخش علم ہے۔ دوسرا وہ جو زبان ہی پر رہتا ہے وہ اللہ کی عدالت میں ابن آدم کے خلاف حجت بنے گا۔''

بلغوا عنی ولو آیۃ. (بخاری)

''میری تعلیم لوگوں تک پہنچاؤ، خواہ ایک ہی آیت ہو۔''

من سئل عن علم علمہ ثم کتمہ الجم یوم القیمۃ بلجام من النار.

(ترمذی ابوداؤد وغیرہ)

''جس شخص سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی جائے جس کو وہ جانتا ہے اور وہ اس کو چھپائے (یعنی نہ بتائے) تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام دی جائے گی۔''

لیعلمن قوم جیرانھم ولیعظنھم ولیامر نھم ولینھو نھم ولیتعلمن قوم من جیرانھم ویتعظون ویتفقھون اولاعا جلنھم العقوبۃ فی الدنیا. (طبرانی)

''لوگ اپنے پڑوسیوں کو لازماً تعلیم دیں۔ انہیں وعظ ونصیحت کریں، اچھی باتوں کی تلقین کریں۔ بری باتوں سے روکیں، اسی طرح لوگوں کو اپنے پڑوسیوں سے علم حاصل کرنا ہوگا۔ وعظ ونصیحت کو قبول

کرنا ہوگا اور اپنے اندر سمجھ پیدا کرنی ہوگی ورنہ میں ان لوگوں کو بہت جلد دنیا میں سزا دوں گا۔“

۷۔ معلم اور متعلم دونوں کی شخصیت کا احترام اور دونوں کی عزت نفس کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اساتذہ، شفیق مربی اور روحانی باپ اور طلبہ فرض شناس اور مطیع بیٹے کی طرح ہوتے ہیں۔

علموا ولا تعنفوا فان المعلم خير من المعنف. (بیہقی)

”علم سکھاؤ اور سختی نہ کرو۔ معلم سختی کرنے والے سے بہتر ہے۔“

”جس سے علم سیکھو اس کی عزت کرو۔“ (حدیث)

امام شافعیؒ تو اپنے استاد کے گھر کی طرف پیر کر کے سونے سے بھی گریز کرتے تھے مبادا سوء ادبی نہ ہو۔

۸۔ پاکیزہ فضا میں تعلیم دی جاتی ہے۔ گھر، محلہ، ماحول، مملکت اور مدرسہ ہر ایک فضا کو پاکیزہ بنائے رکھنے اور اپنا تعاون پیش کرنے کے لیے تیار رہتا ہے اور بڑوں خصوصاً معلمین کا حسن سلوک، ہمدردی و دل سوزی اور اچھا اسوہ متعلمین کی مناسب تربیت اور مثالی نظم وضبط کے قیام میں معاون ہوتا ہے۔

۹۔ انفرادی، عائلی اور اجتماعی ذمہ داریوں کا صحیح علم بہم پہنچایا جاتا ہے اور ان کو اللہ ورسول کے احکام کے مطابق سرانجام دینے کی بتدریج عملی تربیت کی جاتی ہے۔

۱۰۔ غیر مسلموں کو اپنے عقیدہ ومسلک اور اپنی مرضی کے مطابق تعلیمی اداروں کے قیام کی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں اور ان کے مسلک یا مرضی کے خلاف کوئی بات انہیں بہ جبر نہیں پڑھائی جاتی۔

لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ (البقرہ۔۲۵۶)

”دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔“

۱۱۔ دینی واخلاقی قدروں کو مستقل حیثیت اور غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے ان کے تقاضوں کو ہر حال میں پورا کیا جاتا ہے کسی حال میں بھی ان قدروں کی بے قدری نہیں ہونے دی جاتی۔

بعثت لاتمم مکارم اخلاق. (موطا امام مالک)

''مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے تا کہ اخلاقی اچھائیوں کو تمام وکمال تک پہنچاؤں۔''

قل امنت باللّٰہ ثم استقم. (حدیث)

''کہو میں اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر جمے رہو۔''

ان رجالا یاتونکم من اقطار الارض یتفقھون فی الدین فاذا اتوکم فاستروصوابھم. (ترمذی)

''اطراف زمین سے لوگ تمہارے پاس علم دین سمجھنے آئیں گے تم ان کو بھلائی کی تلقین کرنا۔''

۱۲۔ متعلم کی عمر، ضروریات، مزاج، انفرادی خصوصیات اور نفسی کیفیات کالحاظ کر کے تعلیم دی جاتی ہے تعلیم وتربیت میں آسانیاں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ شدائد ومشکلات میں مبتلا کر کے انہیں بددل و مایوس نہیں ہونے دیا جاتا اور نہ تعلیم کو ان پر بار بننے دیا جاتا ہے۔ مشہور مقولہ ہے

کلموا الناس علٰی قدر عقولھم.

''لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق بات کرو۔''

یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا. (الحدیث)

''آسانیاں بہم پہناؤ، شدائد میں مبتلا نہ کرو، خوشخبری دو، متنفر نہ کرو۔''

انی اتخولکم بالموعظة کما کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یتخولنا بھا مخالفة السامة علینا. (عبداللہ بن مسعود بخاری ومسلم)

''میں ناغے دے کر وعظ وتلقین کرتا ہوں جیسے کہ نبی اکرم ﷺ ناغے دے کر وعظ فرماتے اور آپ ایسا اس لیے کرتے کہ ہم لوگ کہیں اکتا نہ جائیں۔''

اسلام میں مایوسی کفر ہے اصلاح وتربیت کی طرف سے نہ متعلمین مایوس ہوتے اور نہ ان

کے اساتذہ سرپرست یا دوسرے ذمہ دار، بلکہ ہر ایک مایوسی سے خود بچتا ہے اور متعلمین کو بچاتا ہے۔

وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ط اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ.

(یوسف:۸۷)

''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔''

ان للقلوب شهوات واقبالا وادبارا فاتوها من قبل شهواتها واقبالها، فان القلب اذا اكره عمى. (حضرت علیؓ، از کتاب الخراج ابو یوسف)

''دلوں کی کچھ خواہشیں اور میلانات ہوتے ہیں اور کسی وقت وہ بات سننے کے لیے تیار رہتے ہیں اور کسی وقت اس کے لیے تیار نہیں رہتے تو لوگوں کے دلوں میں ان میلانات کے اندر سے داخل ہو اور اس وقت اپنی بات کہو جب وہ سننے کے لیے تیار ہوں اس لیے کہ دل کا حال یہ ہے کہ جب اس کو کسی بات پر مجبور کیا جاتا ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔'' (اور بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔)

۱۳۔ طلبہ کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو ہم آہنگی سے پروان چڑھانے کی فکر کی جاتی ہے۔فطری صلاحیتوں کو نشو ونما دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور ان کو بروئے کار لانے کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں کیونکہ بچوں کو خدا کی امانت، ان کے جسم اور جسم کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو خدا کا زبردست عطیہ اور انسان کے لیے انتہائی ضروری اور مفید سمجھا جاتا ہے۔اسی لیے انہیں نہ تو کچلا جاتا اور نہ نظر انداز کیا جاتا ہے بلکہ صحیح رخ پر ڈالنے کا اہتمام ہوتا ہے۔

۱۴۔ طلبہ کو سادہ زندگی، محنت مشقت، اپنا کام آپ کر لینے اور خلق خدا کی خدمت کرنے کا عادی بنایا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو عار نہ سمجھیں۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود سارے کام اپنے ہاتھ سے کر لیتے اور خلفائے راشدین و بزرگان دین کا بھی یہی اسوہ رہا ہے۔

۱۵۔ خدا کی خوشنودی حاصل کرنا اور خلق خدا کو نفع پہنچانا یہی حصول علم کی غرض وغایت ہوتی ہے نہ کہ آج کل کی طرح ڈگریوں کا رعب، دبدبہ ومرتبہ، جاہ وجلال، دولت وثروت اور علمی لیاقت پر فخر وغرور یا حصول دنیا کے لیے۔

من تعلم علما مما يبتغى به وجه الله، لا يتعلمه الا ليصيب به عرضا من الدنيا لم يجد عرف الجنة يوم القيمة يعني ريحها. (ابوداؤد، ابن ماجہ، احمد)

''جس شخص نے وہ علم سیکھا جس سے خدا کی خوشنودی طلب کی جاتی ہے لیکن اس غرض سے سیکھا کہ وہ اس سے دنیا کی متاع حاصل کرے تو قیامت کے دن اس کو جنت کی خوشبو میسر نہ ہوگی۔''

من طلب العلم ليجازى به العلماء اوليمادى به الفهاء او يصرف به وجوه الناس اليه ادخله الله النار. (ترمذی۔ ابن ماجہ)

''جس شخص نے علم کو اس غرض سے حاصل کیا کہ وہ اس سے علماء سے مناظرہ کرے یا بیوقوفوں سے جھگڑے یا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے تو اللہ اس کو آگ میں داخل کرے گا۔''

عمر بن الخطاب قال لكعب من ارباب العلم قال الذين يعملون بما يعلمون قال فما اخرج العلم من قلوب العلماء قال اطمع. (دارمی)

''حضرت عمرؓ بن الخطاب نے حضرت کعبؓ سے دریافت کیا تمہارے نزدیک اہل علم کون ہیں۔ حضرت کعبؓ بولے: ''وہ لوگ جو اپنے علم کے موافق عمل کریں۔'' پھر حضرت عمرؓ نے پوچھا: ''عالموں کے دلوں سے کون سی چیز علم کو نکال لیتی ہے۔'' حضرت کعبؓ نے جواب دیا: ''لالچ''

۱۶۔ چھوٹے بڑے پڑھے لکھے اور ان پڑھ سب علم کے حریص بنا دیئے جاتے ہیں اور لائبریریوں اور دارالمطالعوں اور مذاکراتی مجالس وغیرہ کے ذریعے ایسی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں کہ ہر شخص گود سے گور تک علم حاصل کر سکے۔

لن يشبع المومن من خير يسمعه حتى يكون منتهه الجنة. (ترمذی)

''مومن کا پیٹ بھلی باتوں (علم) سے نہیں بھرتا۔ وہ سنتا رہتا ہے یہاں تک کہ جنت میں

پہنچ جاتا ہے۔"

یہ ہیں اسلامی نظام تعلیم کی بنیادی خصوصیات۔ ان سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی نظام تعلیم ہی وہ جامع الصفات نظام ہے جس میں انسان کی شخصیت کے ہر پہلو اور اس کی تمام فطری قوتوں اور صلاحیتوں اور اس کی ساری ضروریات کی پوری رعایت رکھی گئی ہے۔ یہی وہ نظام تعلیم ہے جو ہر حیثیت سے مکمل، مفید اور اللہ کی نظر میں مستند ہے۔ باقی جتنے نظام تعلیم رائج ہیں وہ سب انسانوں کے گھڑے ہوئے، یک رخے، ناقص اور بحیثیت مجموعی، انسانیت کے لیے مضر ہیں۔ یہی واحد نظام تعلیم ہے جس میں انسانیت کی فلاح ہے اسی کو اپنا کر موجودہ تعلیمی مسائل کا حل نکالا جا سکتا ہے اور آئندہ نسلوں کا مستقبل تابناک بنایا جا سکتا ہے۔ ورنہ انسانیت کا انجام انتہائی دردناک ہوگا۔ مروجہ نظام ہائے تعلیم آئندہ نسلوں میں جس تیزی سے بگاڑ پیدا کر رہے ہیں اس کا ہر ایک کو علم ہے۔ اللہ تعالیٰ اسلامی نظام کو اختیار کرنے کی توفیق دے اور اس انجام بد سے بچائے جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

باب ٦:

فن تعلیم وتربیت

(اسوۂ حسنہ ﷺ کی روشنی میں)

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ. (البقرہ۔۱۵۱)

''جس طرح میں نے تمہارے درمیان خودتم میں سے ایک رسول بھیجا جوتمہیں میری آیات سناتا ہے،تمہاری زندگیوں کوسنوارتا ہے۔تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہےاور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جوتم نہ جانتے تھے۔''

بعثت معلما. (مشکوٰۃ)

''مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔''

بعثت لاتمم مكارم الاخلاق. (موطاامام مالکؒ)

''مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے تاکہ اخلاقی اچھائیوں کوتمام وکمال تک پہنچاؤں۔''

ان العلماء ورثة الانبياء وان الانبياء لم يورثوا دينارا ولا درهما وانما ورثوا العلم. (ترمذی۔ابوداؤد)

''عالم نبیوں کے وارث ہیں اور انبیاء کا ورثہ دینار اور درہم نہیں ہیں بلکہ ان کا ورثہ علم ہے جس کا وارث انہوں نے عالم کو بنایا ہے۔''

مندرجہ بالا آیت اور ارشادات گرامی سے ثابت ہوتا ہے کہ صحیح تعلیم وتربیت کار نبوت کا ایک اہم جزو ہے اور دیگر امور زندگی کی طرح اس معاملے میں بھی آپ ﷺ ہی کا اسوۂ حسنہ ہم سب

کے لیے مستند اور قابل تقلید ہے۔آیئے جائزہ لے کر دیکھیں کہ اس ضمن میں ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے تاکہ آپ ﷺ کی اتباع کر کے ہم کار تعلیم وتربیت کو مفید اور نتیجہ خیز بنا سکیں۔

معلم کی شخصیت اور اوصاف:

طلبہ کی تعلیم وتربیت میں معلم کی اپنی شخصیت اور اس کے ذاتی اوصاف کا رول سب سے اہم ہوتا ہے۔طلبہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان سے برابر متاثر ہوتے رہتے ہیں اور یہ تاثر اتنا گہرا ہوتا ہے کہ زندگی بھر نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

☆ آپ ﷺ کی شخصیت کے مندرجہ ذیل چند پہلوؤں کو خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے تاکہ ہر معلم ان کی روشنی میں اپنی شخصیت کو ڈھال سکے اور اپنا قابل تقلید اسوہ طلبہ کے سامنے پیش کر سکے۔

☆ آپ ﷺ کی شخصیت بڑی دلکش، محبوب اور موثر تھی، جو دیکھتا بے اختیار کھنچتا، اپنی جان چھڑکتا اور آپ ﷺ کے اشاروں پر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کی کوشش کرتا۔معلم کو بھی اپنے اندر ان اوصاف کی جھلک لانی چاہیے تاکہ طلبہ اس سے بدکنے کے بجائے قریب آئیں۔توجہ اور دلچسپی سے بات سنیں اور معلم کا اثر قبول کریں۔ان اوصاف کے بغیر معلم اپنا فرض بخوبی انجام دے ہی نہیں سکتا۔

☆ زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں آپ ﷺ کا اسوہ قابل تقلید تھا۔پوری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی۔ظاہر یا باطن یکساں تھا۔جن باتوں کی تعلیم دی خود اس پر عامل رہے۔زبان سے جو کچھ فرمایا اس پر عمل کر کے دکھایا۔

☆ طلبہ بھی معلم کی باتوں سے زیادہ اس کے اسوہ کی تقلید کرتے ہیں۔اس لیے معلم کو بھی اپنی سیرت کے تمام پہلوؤں پر برابر نظر رکھنی چاہیے تاکہ طلبہ کو تقلید کے لیے اچھا اسوہ ملے ورنہ اپنی کوتاہیوں کا وبال تو ہوگا ہی، غلط اسوے کا جو برتو طلبہ پر پڑے گا اس کا وبال بھی معلم پر

ہوگا۔

☆ ذات گرامی ﷺ علم وحکمت کی حامل تھی۔ معلم کو بھی صاحب علم وحکمت ہنا چاہیے۔ کیونکہ صحیح اور پختہ علم کے بغیر طلبہ کو اچھی تعلیم نہیں دی جاسکتی اور حکمت کے بغیر سلیقے سے ان کی تربیت نہیں کی جاسکتی۔ تربیت کا کام تو غیر معمولی حکمت ودانائی چاہتا ہے، معلم کو اپنے علم میں اضافے اور پختگی نیز اپنی معلومات پر بھروسہ اور یقین پیدا کرنے کی برابر جدوجہد کرتے رہنا چاہیے۔ علم کے معاملہ میں طلبہ اپنے معلمین ہی کو سند سمجھتے ہیں۔ اگر معلم کو خود اپنے علم پر بھروسہ اور یقین نہ ہوتو طلبہ کا اعتماد متزلزل ہوگا اگر کسی معاملہ میں صحیح معلومات نہ ہوں تو غلط سلط باتیں بتانے کے بجائے خندہ پیشانی سے عدم واقفیت کا اعتراف کر لینا چاہیے اور معلومات حاصل کر کے بعد میں بتا دینا چاہیے۔ اس سے طلبہ کا اعتماد بحال رہے گا اور معلم غلط بیانی کے اس وبال سے بھی محفوظ رہے گا۔ جس کی طرف ذیل کی حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

”اگر کسی نے بلا علم کے مسئلہ بتا دیا تو اس کا وبال بتانے والے پر ہوگا۔“

آنحضرت ﷺ نے خود متعدد سوالات کے جواب میں لاعلمی کا اظہار فرمایا اور جب وحی نازل ہوئی اس وقت بتلایا۔

☆ عفو ودرگزر اور تحمل وبردباری میں حضور اکرم ﷺ اپنی مثال آپ تھے۔ معلم کو بھی نادان بچوں سے سابقہ پیش آتا ہے جن سے ہمہ وقت غلطیاں وکوتاہیاں اور خلاف طبع حرکات سرزد ہونے کا امکان ہوتا ہے اس لیے وہی معلم کامیاب ہوسکتا ہے جس میں یہ صفات پائی جاتی ہوں۔ چڑچڑے اور غصہ ور لوگ کبھی اچھے معلم نہیں ہوسکتے۔

☆ حضور اکرم ﷺ کی خوش اخلاقی اور ملنساری کا یہ عالم تھا کہ اپنے پرائے دوست دشمن یہاں تک کہ ان سے بھی جنہیں آپ ﷺ ناپسند کرتے تھے نہایت نرمی، خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ دوسروں کی دلداری کا آپ ﷺ کو بے حد خیال رہتا تھا۔ دل پر

خواہ کچھ بیت رہی ہو، مسکراتے ہوئے ملتے۔تبسم، مزاح اور خوش طبعی کا اہتمام فرماتے۔ معلم کو بھی بہت ہی خوش اخلاق، ملنسار اور خوش طبع ہونا چاہیے، اسے بھی طلبہ، ان کے سرپرستوں، عام پبلک، مدرسے کے موافق مخالف، ہر طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے اور ہر ایک کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے بغیر ان صفات کے وہ اپنا فرض انجام نہیں دے سکتا۔

☆ لباس میں سادگی، تواضع اور بے تکلفی کے ساتھ آپ ﷺ طہارت ونظافت کا حد درجہ خیال رکھتے تھے۔معلم کو بھی فیشن اور نقالی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ سادگی اور صفائی ہی میں علم کی شان ہے۔

☆ آپ ﷺ کی شخصیت میں غیر معمولی نظم وانضباط اور برتاؤ میں حد درجہ یکسانی وہمواری تھی، جسے بھی واسطہ پڑتا وہ بآسانی اندازہ لگا لیتا کہ آپ ﷺ کی پسند ناپسند کیا ہے؟ ہماری کن باتوں کا آپ ﷺ پر کیا ردعمل ہوگا؟ معلم میں بھی یہ صفات ضروری ہیں تاکہ طلبہ اس کے جذبات کا پورا احترام کرسکیں ورنہ باوجود خواہش کے وہ عجب کش مکش کا شکار ہو جاتے ہیں۔ انہیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ معلم کس بات سے خوش ہوگا اور کس سے ناخوش۔

☆ آپ ﷺ کی سیدھی سچی تعلیم کا جواب نادانوں نے اینٹ پتھر سے دیا مگر آخر وقت تک آپ ﷺ ان کی اصلاح کی طرف سے مایوس نہ ہوئے بلکہ پرامید ہی رہے بالآخر کامیابی نے آپ ﷺ کے قدم چومے۔معلم کو بھی تعلیم وتربیت یا اصلاح کی طرف سے نہ تو خود مایوس ہونا چاہیے اور نہ طلبہ یا ان کے سرپرستوں کو مایوسی کا شکار ہونے دینا چاہیے۔ہم معمر لوگ اپنی اصلاح کے ضمن میں اب بھی پُر امید رہتے ہیں تو بچوں کے سدھرنے کے لیے تو پوری عمر پڑی ہے اور نادانی میں تو بہر حال ان سے غلطیوں اور خامیوں کا کہیں زیادہ امکان ہوتا ہی ہے۔

☆ ایثار، قناعت اور توکل میں حضور ﷺ اپنی نظیر آپ تھے۔معلم کو بھی یوں تو ہر دور میں نمونہ

لیکن آج کے حالات میں خصوصاً ان صفات کا حامل ہونا چاہیے۔ تعلیم وتربیت جیسے کارِ خیر میں برکت انہی صفات کے ذریعے ہو سکتی ہے جسے صرف دنیا عزیز ہو اسے اس کوچے میں قدم نہ رکھنا چاہیے۔

☆ حضور ﷺ کے احساس ذمہ داری، لگن اور انہماک کا یہ عالم تھا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

لعلک باخع نفسک.

''شاید آپ اپنے کو ان کے پیچھے ہلاک کر دیں گے۔''

تعلیم وتربیت انتہائی پتہ ماری کا کام ہے۔ معلم بھی اپنے فرائض کو ان صفات کے بغیر بخوبی انجام نہیں دے سکتا۔

☆ صورت حال کیسی بھی پیچیدہ ہو معاملات کو آپ ﷺ بڑی دور اندیشی اور سہولت سے سلجھا دیتے، آپ ﷺ کے چند جملے آگ پر پانی کا کام کرتے اور ہر فریق مطمئن ہو جاتا۔ معلم کو بھی آئے دن درجات میں اور باہر بھی طرح طرح کے معاملات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اگر نمٹنے کی صلاحیت نہ ہو تو معلم کو بڑی دشواری پیش آئے گی۔

☆ بچوں سے آپ ﷺ کو غیر معمولی انس اور طبعی مناسبت تھی، ان کی بچگانہ حرکات کی آپ ﷺ بہت زیادہ رعایت کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے کبھی کسی بچے کو نہیں پیٹا اور مارنے کے لیے کہا بھی ہے تو آخری چارۂ کار کے طور پر۔ معلم کو بھی اپنے اندر ان صفات کو پروان چڑھانا چاہیے۔ اگر بچوں سے انس اور لگاؤ نہ ہو تو انسان معلمی کا پیشہ اختیار نہ کرے۔

معلم کی آواز:

سبق کے موثر اور کامیاب ہونے کا بہت کچھ انحصار معلم کی آواز پر ہوتا ہے۔ آواز اگر جاذب توجہ، خوشگوار اور میٹھی ہو تو طلبہ بآسانی متوجہ بھی ہوتے ہیں اور درس میں دیر تک تکان یا اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے، آواز اگر کرخت ہو یا معلم بہت زیادہ چیخ کر بولے تو کانوں کو برا لگتا

ہے۔طلبہ جلد اکتا جاتے اور تکان محسوس کرنے لگتے ہیں۔کرخت آواز سے ابتدائی درجات کے چھوٹے بچوں پر تو مسلسل خوف کا جذبہ طاری رہتا ہے اور وہ معلم کی بات پر قطعاً توجہ نہیں دے پاتے اور نہ ان کی سمجھ میں پوری بات آتی ہے۔خود معلم کی صحت کے لیے چیخنا چلانا بہت مضر ہے گلا بھی خراب ہو جاتا ہے اور پھیپھڑے بھی بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔اسی طرح بہت زیادہ بولنا اور بغیر ضرورت بولتے رہنا توجہ اور دلچسپی کو ختم کر دیتا ہے۔بات خواہ کتنی زوردار اور موثر کیوں نہ ہو بغیر اتار چڑھاؤ کے ایک ہی سر میں پیش کی جائے تو وہ غیر موثر ہو جاتی ہے۔آواز کے معاملے میں معلم کی رہنمائی کے لیے حضور اکرم ﷺ کے اسوے سے مندرجہ ذیل باتیں پیش کی جاتی ہیں۔سبق کو مفید اور موثر بنانے کے لیے ان کی اتباع ضروری ہے۔

☆ حضور اکرم ﷺ کی آواز نہ بہت بلند ہوتی، نہ بہت پست بلکہ میانہ ہوتی تھی جو کانوں کو بہت خوش گوار معلوم ہوتی۔البتہ حسب ضرورت اتنی بلند آواز سے بولتے کہ مخاطب سن سکے۔ معلم کو بھی اپنی آواز نہ اتنی بلند رکھنی چاہیے کہ کانوں کو بری لگے نہ اتنی پست کہ سنائی نہ دے اور درجے کا نظم وضبط متاثر ہو بلکہ اتنی ہو کہ پورا درجہ بآسانی سن سکے۔چیخنا چلانا یا کرخت آواز سے بولنا تو کسی طرح درست نہیں۔گدھے کی آواز کی تو خود قرآن نے بھی مذمت کی ہے۔

اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ۝ (لقمان:۱۹)

”بے شک گدھے کی آواز بہت کریہہ ہے۔“

☆ ابتدا سے انتہا تک آپ ﷺ منہ بھر کر بولتے تھے (یہ نہیں کہ آدھی بات اندر ہی رہ گئی) معلم کو بھی اس کا پورا لحاظ رکھنا چاہیے۔

☆ آپؐ جب بولتے تھے تو جملوں کے آخری الفاظ اور الفاظ کے آخری حروف تک واضح سنائی دیتے۔معلم کو بھی اس کی خوب مشق کرنی چاہیے۔تلفظ اور مخارج درست ہوں تو بات بھی بخوبی سمجھ میں آئے گی اور طلبہ کے تلفظ اور مخارج کی اصلاح بھی ہو جائے گی۔

☆ حضور اکرم ﷺ کی آواز میں حسب ضرورت اتار چڑھاؤ ہوتا تھا۔ چنانچہ کلام میں غیر معمولی تاثیر پیدا ہو جاتی تھی۔ معلم کو بھی ایک ہی سر میں بولنے سے بچنا چاہیے اور آواز میں حسب ضرورت اتار چڑھاؤ پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

☆ دیگر تمام امور کی طرح حضور اکرم ﷺ کی آواز میں بھی تکلف و تصنع بالکل نہ تھا۔ معلم کو بھی اپنی آواز میں بے ساختہ پن اور بے تکلفی برقرار رکھنی چاہیے۔ انداز فطری ہونا چاہیے۔ بعض اساتذہ منہ ٹیڑھا کر کے بولنے اور آواز میں تصنع پیدا کرنے میں اپنی شان سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اپنی ان حرکات سے وہ طلبہ کی نظروں میں مضحکہ خیز بن جاتے ہیں۔

☆ حضور اکرم ﷺ ضرورت بھر بولتے تھے۔ زیادہ بولنے اور فضول باتیں کرنے سے آپ ﷺ منع فرمایا کرتے تھے۔ معلم کو بھی روزانہ گھنٹوں اور زندگی بھر بولنا ہی پڑتا ہے، اس لیے بولنے میں بہت محتاط رہنا چاہیے۔ بہتر یہ ہے کہ مختلف کاموں کے لیے اشارات مقرر کر لے تاکہ کم بولنا پڑے۔ بلاضرورت بولنے اور فضول باتیں کرنے سے گریز کرے۔ حتیٰ الامکان طلبہ ہی کو بولنے اور کام کرنے کے مواقع دے۔

معلم کی زبان:

طلبہ کی تعلیم وتربیت میں معلم کی زبان کو بھی بہت زیادہ دخل ہوتا ہے کیونکہ یہی تو وہ اہم آلہ ہے جس کے ذریعے طلبہ تک معلم اپنی بات پہنچاتا اور اپنے خیالات وجذبات منتقل کرتا ہے۔ دوسرے خود طلبہ ارادی اور غیر ارادی طور پر معلم کی زبان کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ اس لیے معلم کو زبان کے استعمال میں بہت محتاط ہونا چاہیے۔ اگر معلم کی زبان ناقص ہوگی تو طلبہ بھی ناقص زبان استعمال کرنے لگیں گے اور بات بھی پورے طور پر سمجھ میں نہ آئے گی۔ اس ضمن میں حضور اکرم ﷺ کے اسوے سے ہمیں مندرجہ ذیل رہنمائی ملتی ہے:

☆ حضور اکرم ﷺ بہت ہی صاف، سادہ، عام فہم اور سلیس زبان استعمال فرماتے، مرصع و مسجع

عبارت بولنے اور پُر تکلف زبان استعمال کرنے سے گریز کرتے، کوئی بھی مسئلہ ہو ایسی زبان میں بیان فرماتے کہ اَن پڑھ اور معمولی صلاحیت کے لوگ بھی بخوبی سمجھ لیتے۔ معلمؔ ؛ بھی چھوٹے بچوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ جن کا ذخیرۂ الفاظ بہت محدود ہوتا ہے۔ اگر بولنے میں اس کی رعایت نہ کی جائے تو بچے سمجھ ہی نہ سکیں گے۔

☆ فصاحت وبلاغت کا بھی حضور اکرم ﷺ بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ کم سے کم الفاظ میں اپنا مافی الضمیر ادا فرماتے۔ جملے مختصر اور الفاظ جامع ہوتے اس کے باوجود مطلب پوری طرح واضح ہو جاتا۔ معلم کو بھی چاہیے کہ بہت ہی چھوٹے چھوٹے جملوں اور کم سے کم الفاظ میں اپنی بات واضح کرے۔ جملے مربوط اور موضوع سے متعلق اور حشو وزوائد سے پاک ہوں۔

☆ زبان نہایت ہی صحیح، شستہ اور شائستہ استعمال فرماتے۔ جس بات کا تفصیل سے ذکر نا شائستگی کے خلاف ہوتا، اسے اشاروں اور کنایوں میں بیان فرماتے، معلم کو بھی زبان کی صحت شستگی اور شائستگی کا پورا لحاظ رکھنا چاہیے تاکہ طلبہ کی زبان بھی ان اوصاف کی حامل ہو۔ غلط زبان اور ناشائستہ کلام سے معلم کو خود تو بچنا ہی چاہیے۔ طلبہ سے بھی کوتاہی ہو تو بروقت اصلاح کر دینی چاہیے۔ بچوں کی زبان پر اکثر غیر شعوری طور پر بعض ناشائستہ کلمات یا بازاری الفاظ اور جملے چڑھ جاتے ہیں، جنہیں وہ تحریر وتقریر میں بے تکلف استعمال کرنے لگتے ہیں۔ بچوں کو ایسا کرنے سے روکنا چاہیے۔

طریق تعلیم:

حضور ﷺ کے اسوے سے اس ضمن میں ہمیں مندرجہ ذیل رہنمائی ملتی ہے:

☆ سبق کا مقصد متعین اور معلم و متعلم دونوں پر اچھی طرح واضح ہو۔ حضور ﷺ جو کچھ بتانا یا سکھانا چاہتے تھے اس کا بنیادی مقصد آپ کی نظر میں تو خیر متعین ہوتا ہی تھا خود متعلمین پر بھی

اچھی طرح واضح ہوتا تھا کہ وہ کیا کچھ اور کس مقصد سے سیکھنے جا رہے ہیں۔ معلم کو بھی اس کا لحاظ رکھنا چاہیے تاکہ دوران سبق معلم و متعلم دونوں کا پورا وقت اور توجہ اسی مقصد کے حصول کی کوشش میں صرف ہو اور وہ ادھر ادھر بھٹکنے سے بچ جائیں۔

☆ طلبہ کو آمادہ کر کے یا ان کا تجسس ابھار کر سبق پیش کیا جائے۔ حضور کوئی سوال کر کے یا کوئی ادھوری بات کہہ کر لوگوں کے تجسس کو ابھار دیتے اور اپنی طرف اچھی طرح متوجہ کر لیتے تب کوئی بات پیش فرماتے۔ مثلاً آپؐ کا سوال ''سب سے بڑا سخی کون ہے؟'' اور پھر جواب دیا، یا منبر پر چڑھتے ہوئے تین بار ارشاد فرمایا: ''ہلاک ہوا وہ، ہلاک ہوا وہ......'' اور واقعہ یہ ہے کہ جب تک طلبہ متجسس یا ذہنی طور پر آمادہ نہ ہوں سبق کی طرف متوجہ ہو ہی نہیں سکتے اور طلبہ کی توجہ و دلچسپی اور انہماک کے بغیر معلم کی کوششیں نتیجہ خیز نہیں ہو سکتیں۔

☆ سب کچھ ایک ساتھ بتا دینے کے بجائے سبق کو مناسب اجزا میں تقسیم کر لیا جائے۔ پھر طلبہ کو آمادہ کر کے ایک جز پیش کیا جائے اور اس جز کے ذہن نشین ہو جانے کی طرف سے اطمینان کر کے اگلا جز لیا جائے۔ حضرت معاذؓ والی حدیث سے اس ضمن میں پوری رہنمائی ملتی ہے۔ اس طرح پورا سبق بآسانی ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

☆ طلبہ کے لیے حتی الامکان آسانیاں بہم پہنچائیے۔ انہیں اتنی مشکلات میں نہ پھنسائیے کہ وہ گھبرا کر کندھا ڈال دیں۔

یسروا ولا تعسروا (حدیث)

''آسانیاں بہم پہنچاؤ، مشکلات میں نہ ڈالو۔''

بتدریج آسان سے مشکل کی طرف بڑھیں تاکہ بچے بآسانی مشکلات پر قابو پاتے جائیں۔

☆ دوران سبق دیکھتا رہے کہ توجہ بھٹکنے یا اکتاہٹ پیدا ہونے نہ پائے۔ حضور ﷺ اس کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔ اگر اس کے آثار محسوس فرماتے تو یا تو تھوڑی دیر کے لیے موضوع بدل دیتے یا جتنا بتا چکتے اتنے ہی پر اکتفا کرتے۔

☆ مواد کی پیشکش کے لیے مندرجہ ذیل طریقوں میں سے موقع ومحل کی مناسبت سے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

الف۔ بات چیت کا طریقہ (Conversational Method)

ب۔ سوال وجواب کا طریقہ (Question Answer Method)

ج۔ اخباری یا اطلاعی طریقہ (Narrative or Descriptive Method)

د۔ لکچر یا خطابت کا طریقہ (Lecture Method)

الف۔ بات چیت کا طریقہ:

حضور ﷺ باتوں باتوں میں بہت سی ضروری معلومات بہم پہنچا دیتے تھے۔ یہ طریقہ بہت ہی دلچسپ، سادہ، فطری اور مفید ہے۔ طلبہ نہایت بے تکلفی سے اپنا مطلب بیان کر دیتے ہیں۔ معلم کو ان کی مشکلات اور ان کے خیالات وجذبات کا ٹھیک اندازہ لگانے میں آسانی ہوتی ہے۔ اور ان کی اصلاح وتربیت کا فطری موقع ہاتھ آتا ہے۔ لیکن گفتگو مفید اور نتیجہ خیز اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس ضمن میں حضور ﷺ کے اسوے کی پوری پیروی کی جائے یعنی

☆ گفتگو زیادہ سے زیادہ بے تکلفی کی فضا میں ہو، تاکہ ہر ایک بے جھجک اپنا مافی الضمیر ادا کر سکے، البتہ شائستگی کو ہر حال میں برقرار رکھا جائے۔

☆ پوری توجہ اور خندہ پیشانی سے بات سنی جائے۔

☆ بات کاٹی نہ جائے۔ ایک وقت میں ایک ہی شخص بات کرے۔ جب تک ایک شخص اپنی بات پوری نہ کرلے بیچ میں بولا نہ جائے۔

☆ موضوع سے بالکل ہٹی ہوئی، خلاف واقعہ یا نامناسب گفتگو ہونے لگے تو مناسب انداز سے اصلاح کردی جائے۔

☆ دوران گفتگو تعلیم وتربیت کے جو فطری مواقع ہاتھ آئیں ان سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔

☆ بات چیت میں الفاظ تیز رفتاری سے نہیں بلکہ ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے ادا کیے جائیں اور ضرورت ہو تو وہ الفاظ یا فقرے جن پر زور دینا ہو دو تین بار دہرا دیئے جائیں تا کہ بات خوب ذہن نشین ہو جائے اور ان الفاظ یا فقروں کی اہمیت بخوبی محسوس ہونے لگے۔

☆ گفتگو میں مخاطب کی استعداد، ذوق اور ضرورت کی حتی الامکان رعایت کی جائے۔

ب۔ سوال و جواب کا طریقہ:

بہت سی باتیں حضور ﷺ اس طریقے سے بھی ذہن نشین کراتے تھے۔ جو کچھ بتانا ہوتا، اسے پہلے سوالات کی شکل میں رکھتے اور پھر صحیح جواب ارشاد فرماتے۔ دوسروں کو بھی آزادی سے پوچھنے کا موقع دیتے۔ البتہ لغو اور لایعنی سوالات سے یا تو مناسب انداز میں منع فرما دیتے یا صرف نظر کر جاتے۔ غیر متعلق سوال ہوتا تو بات ختم کرنے کے بعد علیحدہ سے جواب ارشاد فرماتے۔ یہ طریقہ بہت مفید ہے۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ متعلم کا ذہن سوال کا حل ڈھونڈنے میں پورا زور لگا دیتا ہے۔ یا کم از کم پوری توجہ اور یکسوئی سے اس کا جواب سننے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں آپؐ کے اسوے سے حسب ذیل رہنمائی ہوتی ہے:

☆ سوالات مختصر اور جامع ہوں۔ نیز واضح الفاظ میں پوچھے جائیں تا کہ مخاطب اچھی طرح سمجھ جائیں کہ ان سے پوچھا کیا جا رہا ہے اور سوال کے الفاظ بھی زبان پر چڑھ جائیں اور یاد ہو جائیں تا کہ جواب سوچنے یا سن کر خوب سمجھنے میں مدد ملے۔ جب تک سوال اچھی طرح مستحضر نہ رہے نہ تو پورا جواب دیا جا سکتا ہے اور نہ دوسرے کا جواب بخوبی سمجھ میں آ سکتا ہے۔

☆ سوال پوچھنے کا انداز ایسا ہو کہ ہر ایک کان کھڑے کر لے۔ ہمہ تن متوجہ ہو جائے اور ذہن جواب سوچنے یا سننے پر پوری طرح آمادہ ہو جائے۔

☆ سوال پوچھنے کے بعد سوچنے کا موقع دیا جائے پھر خندہ پیشانی سے جواب سنا جائے۔

☆ غلط جواب کی تصحیح کر دی جائے۔ اگر جواب بالکل نہ ملے یا سوال لوٹا دیا جائے تو خود ہی وضاحت سے جواب دے کر مطمئن کر دیا جائے۔ تجسس بیدار کر کے تسکین کا سامان نہ کرنا مضر اور موجب خلجان ہوتا ہے۔

☆ طلبہ کو بھی سوالات پوچھنے کے مواقع دیئے جائیں کیونکہ جو زیادہ پوچھتا ہے وہ زیادہ سیکھتا ہے لیکن لغو یا لایعنی سوالات کریں تو جھڑکنے کے بجائے یا تو نظر انداز کر دیا جائے یا مناسب انداز سے روک دیا جائے۔

☆ غیر متعلق لیکن مفید اور ضروری سوال ہو تو بات ختم کرنے کے بعد علیحدہ سے جواب دے دیا جائے۔

ج۔ اخباری اطلاعی یا بیانیہ طریقہ:

کسی چیز کے بارے میں کچھ بتانا ہوتا یا کوئی واقعہ سنانا ہوتا تو آپؐ کبھی کبھی سادہ اخباری یا اطلاعی انداز بیان اختیار فرماتے تھے لیکن آپؐ کا بیان مندرجہ ذیل خصوصیات کا حامل ہوتا تھا۔

☆ اختصار: آپؐ بیان کو بہت طول نہیں دیتے تھے بلکہ اختصار ملحوظ رکھتے تا کہ لوگ اکتائیں نہیں۔

☆ منظر کشی: الفاظ میں ایسی منظر کشی فرماتے کہ ان دیکھی حقیقتیں ایسی معلوم ہوتیں گویا سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

☆ تشبیہات وتمثیلات کے ذریعے وضاحت: بات کو اچھی طرح واضح کرنے کے لیے نہایت موزوں اور برمحل تشبیہات وتمثیلات سے کام لیتے تھے جس سے اس کا ہر پہلو بآسانی سمجھ میں آجاتا تھا۔

☆ موقع ومحل کی مناسبت سے لب ولہجہ، اتار چڑھاؤ اور الفاظ، فقروں پر زور، آپؐ کے ا... اہتمام کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ آپؐ جو کچھ پیش فرماتے، اس کی اہمیت اور شدت پورے طور پ...

ذہن نشین ہو جاتی۔

- چہرے، بشرے، حرکات و سکنات، جذبات و تاثرات کے ذریعے کیفیت پیدا کرنے کی کوشش: جس طرح کا تاثر آپؐ دینا چاہتے اس کا تاثر سب سے پہلے آپؐ اپنے اوپر محسوس فرماتے چنانچہ آپؐ کی اس کیفیت کا سامعین پر بھی گہرا اثر پڑتا۔ ظاہر ہے بات جب دل سے نکلتی ہے تو متاثر کر کے چھوڑتی ہے۔
- حسب ضرورت عملی نمونہ یا روزمرہ کی زندگی پر اس کا عملی انطباق: آپ ﷺ کوئی بات زبانی یا اصولی طور پر بتا دینے ہی پر اکتفا نہ فرماتے بلکہ ضرورت اور موقع ہوتا تو کر کے دکھا دیتے یا روزمرہ زندگی پر اس کا عملی انطباق اور زندگی سے اس کا تعلق بھی اچھی طرح سمجھا دیتے تھے۔ معلم کو بھی اپنے بیانیہ اسباق میں ان باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

د۔ لیکچر یا خطابت کا طریقہ:

حضور ﷺ کا عام انداز بیان خطیبانہ تھا۔ اجتماعی تعلیم و تربیت میں آپ عموماً اسی طریقہ سے کام لیتے تھے۔ آپؐ جب خطبے کے لیے کھڑے ہوتے تو مجلس پر سناٹا چھا جاتا۔ بہت ہی مختصر اور جامع خطبہ ارشاد فرماتے۔ آپؐ کے خطبے نہایت زوردار، جوشیلے اور موثر ہوتے تھے۔ انداز بھی انتہائی جوشیلا اور جذبات میں تلاطم پیدا کر دینے والا ہوتا تھا۔ موقع محل کی مناسبت سے آواز میں اتار چڑھاؤ یا سوز و گداز ہوتا۔ جسم کی حرکات و سکنات، چہرے بشرے اور آنکھوں سے آپؐ کے قلبی تاثر کا پورا اظہار ہو جاتا تھا۔ چنانچہ سامعین بے حد متاثر ہوتے تھے۔ صحابہ کرامؓ میں ایثار و قربانی، جوش و جذبے اور حسن عمل کی بے پناہ قوتوں کی نشو و نما میں آپؐ کے خطبات کو بھی بہت کچھ دخل تھا۔

لیکچر کا طریقہ اپنانے میں معلم کو بھی ان خصوصیات کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

توضیح و تشریح:

حضور ﷺ اپنی بات کو واضح اور اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لیے حسب ضرورت

مندرجہ ذیل طریقے اختیار فرماتے:

☆ عملی نمونہ پیش فرماتے، کر کے دکھاتے یا ہاتھوں انگلیوں وغیرہ کے اشارے سے بتاتے تھے۔

☆ کبھی کبھی ریت پر نشانات بنا کر اپنا مدعا واضح فرماتے۔

☆ کسی جانی پہچانی چیز سے تشبیہ دے کر بات ذہن نشین کراتے۔

☆ کسی موزوں کہانی، واقعہ، چٹکلہ یا تمثیل سے مدد لیتے۔

☆ اس کی ضد سے مقابلہ کر کے فرق کو اچھی طرح واضح فرماتے۔

☆ حسب ضرورت ایک بات کو مکرر سہ مکرر بیان فرما کر خوب ذہن نشین کرا دیتے۔

☆ معلم کو بھی ان چیزوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔

متعلّمین سے برتاؤ:

متعلمین کے ساتھ بھلائی سے پیش آنے کی حضور ﷺ نے وصیت فرمائی ہے۔ آپؐ کا اسوۂ مبارک یہ تھا:

☆ مسکراتے ہوئے خندہ پیشانی سے ملتے۔ نرمی وملاطفت سے پیش آتے۔

☆ ان کی عزت نفس کا ہمیشہ خیال رکھتے۔ آپؐ نے کبھی کسی کی تحقیر یا تذلیل نہیں کی۔

☆ ان کی دلداری کے لیے خوش طبعی اور مہذب ظرافت سے بھی کام لیتے۔

☆ بیمار ہوں تو عیادت اور پرسہ کے لیے جاتے، مزاج پوچھتے، تسلی دیتے، دعا فرماتے۔

☆ ان کی استعداد، ذوق اور دلچسپی کی رعایت فرماتے۔ گفتگو، تقریر یا وعظ وتلقین کو کبھی ان پر بار نہ ہونے دیتے۔ عدم دلچسپی کا احساس ہوتا تو موضوع بدل دیتے یا سلسلہ ختم کر دیتے۔

☆ ہر ایک کی بات غور سے سنتے۔ اچھی بات پر تحسین فرماتے۔ نامناسب گفتگو پر مطلع فرما دیتے۔

☆ کوئی ادب کی حدود سے تجاوز کرتا تو کمال حلم سے برداشت فرماتے، ناپسند بات پر تغافل فرماتے اور ٹال جاتے۔

☆ ان کے سوالات کے تشفی بخش جواب دیتے۔ لغو یا فضول سوالات سے منع فرمادیتے یا نظر انداز کر جاتے۔

☆ کوئی خامی دیکھتے تو عمومی انداز میں ٹوکتے یا درحدیث دیگراں توجہ دلاتے۔

☆ ان کے دکھ درد میں کام آتے۔ ڈھارس بندھا دیتے۔ ناداروں کی خود بھی مدد کرتے اور صاحب استطاعت صحابہؓ سے بھی مدد کراتے۔

☆ ان کے ساتھ روابط میں غیر معمولی یگانگت، قرب اور لگاؤ کا ثبوت دیتے، ان کے برابر بیٹھ جاتے، سینے سے چمٹا کر دعائیں دیتے۔ دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر نہایت شفقت اور دل سوزی سے تلقین فرماتے، کبھی کبھی اپنے کھانے پینے میں شریک کرتے۔

☆ کوئی فرد کسی طرح کوئی معمولی خدمت بھی بجالاتا تو متشکر ہوتے اور دعا دیتے۔

☆ مجلس کے ایک ایک فرد پر توجہ فرماتے تاکہ کسی کو تفوق یا ترجیحی سلوک کا احساس نہ ہو، ہر ایک یہی محسوس کرتا کہ آپ کو مجھ سے غیر معمولی انس ہے۔

☆ بچوں کے ساتھ آپ ﷺ کا برتاؤ تو اور زیادہ شفقت آمیز تھا۔ آپؐ بچوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے، خود سلام کرتے، ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے۔ گود میں اٹھا لیتے۔ کندھے پر بٹھا لیتے۔ پیار کرتے۔ دعائیں دیتے، ان کی دلچسپی کی باتیں کرتے بچوں کو قطار میں کھڑا کر کے انعامی دوڑ کراتے۔ بچے دوڑ کر سینے اور پیٹ پر گر پڑتے۔ آپؐ بخوشی انگیز کرتے۔ خوش طبعی اور دل لگی کے کلمات فرماتے۔ کھانے پینے میں شریک کرتے۔ پیار سے ادب و آداب سکھاتے۔ راستے میں ملیں تو اپنی سواری پر بٹھا لیتے، غلطی کریں تو سمجھا کر معاف کر دیتے، بچوں کو پیٹنے سے منع فرماتے۔ ان کے معاملے میں بار بار عفو و درگزر سے کام لینے کی تلقین کرتے۔ حالت جنگ میں بعض صحابہؓ نے غیر مسلموں کے چند بچوں کو قتل

کر دیا۔آپؐ نے سنا تو بہت رنجیدہ ہوئے۔چہرے کا رنگ بدل گیا۔خفگی سے ارشاد فرمایا:

''(وہ بچے) تم سے اچھے تھے۔خبردار بچوں کو ہرگز قتل نہ کرو۔''

ایک بچے کو بوسہ دیتے ہوئے آپؐ نے فرمایا:

''یہ بچے تو جنت کے پھول ہیں۔''

بچے بھی آپؐ سے بہت محبت رکھتے،گلی کوچوں میں آپؐ کو دیکھ کر اچھلنے کودنے لگتے۔دوڑ کر آتے،آپ سے ملتے۔مل کر بہت خوش ہوتے اور پھولے نہ سماتے۔

حضور ﷺ کے معیاری طریق تعلیم وتربیت اور متعلمین کے ساتھ آپؐ کے اسی برتاؤ کا نتیجہ تھا کہ ان کے اندر حصول علم کی غیر معمولی لگن پیدا ہوئی۔آپؐ کی ہر بات انھوں نے دل سے سنی۔ انتہائی خلوص سے ان پر عمل کیا۔ارشادات گرامی کو گرہ میں باندھ لیا۔زندگی بھر یاد رکھا،اور آپؐ کی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے تن من دھن سے لگ گئے۔اس راہ میں ہر طرح کا دکھ جھیلا۔حالات کا پامردی سے مقابلہ کیا،ہر حال میں حق پر جمے رہے اور اعلاء کلمۃ الحق کے لیے خون پسینہ ایک کر دیا۔اللہ ان سے راضی ہو۔

آج بھی حالات بدل سکتے ہیں بشرطیکہ معلمین اپنے اندر ان اوصاف کی جھلک پیدا کر لیں۔

............☆☆☆............

باب ۷:

جدید تعلیمی رجحانات

الکلمة الحکمة ضالة الحکیم فحیث وجدھا فھو احق بھا.

(ترمذی۔ ابن ماجہ)

”حکمت ودانائی کی بات ایک صاحب حکمت اور دانا شخص کی گمشدہ چیز ہے۔ پس جہاں اسے وہ پائے اس کا وہی زیادہ حق دار ہے۔“ (اسے لے لینا چاہیے)

دنیا کے مختلف ممالک میں آج جن تعلیمی نظریات کا عام طور پر چلن ہے اور جو نظام ہائے تعلیم وہاں مسلط ہیں وہ اپنی بعض بنیادی خرابیوں کے باعث اگرچہ انتہائی قابل اصلاح ہیں لیکن طویل تجربات ومشاہدات اور بچوں کی نفسیات کے مطالعہ کی روشنی میں چند ایسے رجحانات ابھر کر سامنے آ رہے ہیں جو مفید ہیں اور اسلامی تعلیمات سے ٹکراتے بھی نہیں اس لیے خذ ما صفا دع ما کدر کے اصول پر انہیں اپنانے کی کوشش کرنی چاہیے، مثلاً:

ا۔ تعلیم کے مقصد ومفہوم کو، لکھنے پڑھنے تک محدود رکھنے یا چند کتب، مضامین اور فنون میں طلبہ کو مہارت پیدا کرا دینے کے بجائے اس میں مزید وسعت دی جائے۔ یعنی:

الف۔ تعلیم کے ذریعے طلبہ کی شخصیت کے تمام پہلوؤں (ذہنی وجسمانی، عملی واخلاقی، جذباتی وروحانی) کی ہم آہنگ نشوونما اور متوازن ارتقاء۔

ب۔ انفرادی واجتماعی دونوں حیثیتوں سے طلبہ پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، انہیں کماحقہ انجام دینے اور مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت۔

ج۔ خود اعتمادی کا جذبہ، صورت حال سے نمٹنے کی صلاحیت اور روزمرہ کے کاموں کو بلا جھجک انجام دینے پر قدرت۔

د۔ فرصت کے اوقات کو مفید مشاغل میں استعمال کرنے کی عادت۔

ہ۔ طلبہ اور اساتذہ دونوں میں تحقیقی اسپرٹ اور مزید معلومات حاصل کرنے کی تڑپ۔

۲۔ نصاب، مضامین یا درسی کتب کے بجائے بچہ کو مرکزی حیثیت اور بنیادی اہمیت دی جائے یعنی:

الف۔ یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہے کہ تعلیم بچے کے لیے ہے نہ کہ بچہ تعلیم کے لیے، تاکہ ساری تعلیمی کوششیں بچے کو مختلف حیثیتوں سے فائدہ پہنچانے کے لیے ہوں نہ کہ بچے کو تعلیم پر قربان کرنے کے لیے

ب۔ مستقبل کی تیاری کی فکر میں بچوں کی موجودہ دلچسپیوں کو یکسر نظر انداز نہ کر دیا جائے ورنہ اس کا ردعمل شدید ہوگا اور وہ مقصد ہرگز حاصل نہ ہوگا جس کے لیے اسے حال کی مسرتوں سے محروم کیا جا رہا ہے بلکہ شخصیت کے بعض پہلو مجروح ہوں گے اور متوازن ارتقا ہرگز نہ ہو سکے گا۔

ج۔ بچے کی عمر، ذہنی صلاحیت، جسمانی حالت، اس کی ضروریات اور گھریلو ماحول کو ملحوظ رکھ کر تعلیم دی جائے۔

د۔ طلبہ کے مابین انفرادی فرق اور ان کے مخصوص میلانات و رجحانات پیش نظر رہیں۔ پوری جماعت کے بجائے ہر بچے کو علیحدہ اکائی تسلیم کیا جائے۔ اس کی انفرادیت کا لحاظ اور اس کی شخصیت کا احترام کیا جائے نیز پوری جماعت کو ایک ہی لاٹھی سے نہ ہانکا جائے۔

ہ۔ طلبہ کی پیدائشی قوتوں اور فطری میلانات کو صحیح رخ پر ڈالنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

۳۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کا نصاب مرتب کرتے وقت مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہیں:

الف۔ بچے کی عمر، اس کی فطری قوتیں، جبلتیں، جذبات، خواہشات، میلانات اور جسمانی، ذہنی استعداد۔

ب۔ بچوں کی نشو و نما کے مختلف مراحل اور ہر مرحلے کی نفسی خصوصیات، ان کی دلچسپیاں اور

ضروریات۔

ج۔ سماجی اور فطری ماحول اور اس میں فٹ ہونے کے لیے ضروری صلاحیتیں اور اوصاف۔

د۔ ملک وملت کی ضروریات، ان کے عزائم اور تہذیبی ورثہ۔

ہ۔ بچے کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کی ہم آہنگ نشو ونما اور تربیت کے لیے عنوانات، مضامین، مشاغل ومصروفیات۔

و۔ بچے کو مستقبل کی زندگی کے لیے تیار کرنے میں معاون امور۔

۴۔ طریقہ تعلیم ایسا اپنایا جائے کہ تدریس بچوں کے لیے آسان دلچسپ اور مؤثر ہو یعنی:

الف۔ کھیل ہی کھیل میں بہت سی باتیں سکھادی جائیں۔

ب۔ کہانیوں، مکالموں اور ڈراموں کی مدد سے تعلیم دی جائے۔

ج۔ ہر مضمون سے متعلق ضروری تصاویر، چارٹس اور دیگر توضیحی و تعلیمی سامان استعمال کیے جائیں تاکہ سبق دلچسپ ہو جائے، تصورات واضح بنیں اور ایک سے زائد حواس کو استعمال کر کے زیادہ مستحکم معلومات حاصل کرنے کا موقع ملے۔

د۔ مفید اور دلچسپ مشاغل اور منصوبہ جات کا بندوبست کر کے تعمیری صلاحیتیں ابھاری جائیں اور خود تجربہ کر کے سیکھنے کے بیش از بیش مواقع دیے جائیں۔

ہ۔ درجے کی فضا ایسی بنائی جائے کہ بچے اپنی مشکلات اور الجھنیں کھل کر بے جھجک پیش کر سکیں۔

و۔ جذبات وخیالات کے اظہار کے مختلف ذرائع کو کام میں لانے کا سلیقہ سکھایا جائے، یعنی بچے زبانی یا تحریری طور پر مضمون نگاری، انشا پردازی، خطابت، آرٹ وغیرہ کے ذریعے اظہار خیال کر سکیں۔

ز۔ استاد اپنے کو مستبد حکمران کے بجائے بچوں کے مشیر، معاون اور محافظ کی حیثیت میں پیش کریں۔

ح۔ سبق کو آگے بڑھانے میں طلبہ کا تعاون حاصل کیا جائے۔ درجے کو ساری معلومات خود فراہم کر دینے کے بجائے ایسی صورت حال پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ بچے معلومات حاصل کرنے کی خود کوشش کریں۔

ط۔ مضامین اور اسباق کو آپس میں مربوط کر کے پڑھانے کی کوشش کی جائے۔ سماجی وفطری ماحول اور بچوں کی روزمرہ کی زندگی سے بھی ان کا ربط ملایا جائے۔

ی۔ تعلیم بچوں کی مادری زبان میں دی جائے۔

۵۔ مدرسے کے انتظام میں آزادی، مساوات، جمہوریت اور تعاون کی روح کارفرما ہو یعنی:

الف۔ مدرسے کے انتظامات میں اساتذہ کے مشوروں کو اہمیت دی جائے۔

ب۔ اساتذہ آپس میں نیز طلبہ آپس میں مساوات اور بھائی چارہ کی فضا محسوس کریں۔ کسی طرح کا فرق وامتیاز روا نہ رکھا جائے۔

ج۔ خارجی دباؤ کے بجائے خود انضباطی پر زور دیا جائے۔

د۔ ٹولیوں میں مل جل کر کام کرنے کی عادت ڈلوائی جائے اور مختلف قسم کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے ٹولیاں بنائی جائیں جو اپنے مانیٹر کی سرکردگی میں کام کرنا سیکھیں۔

ہ۔ سرپرستوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

و۔ تعلیم حتی الامکان سب کے لیے عام اور لازمی ہو۔

..........☆☆☆..........

باب ۸:

بچہ اوراس کی فطرت

بچوں کو بڑوں پر ہرگز قیاس نہ کرنا چاہیے۔ان کی دنیا ہی الگ اورنرالی ہوتی ہے۔ ہمارا آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ بڑے سے بڑے واقعات وحوادث جن کے اثرات خود ان بچوں کی زندگی پر نہایت دوررس اور گہرے پڑنے والے ہوتے ہیں،ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے بلکہ الٹا ان کی تفریح اور مسرت کا سامان بن جاتے ہیں۔گھر میں آگ لگ جائے، چوری ہو جائے یا گھر کے کسی ذمہ دار فرد کا انتقال ہو جائے۔ہوسکتا ہے بچے دوسروں کی دیکھا دیکھی وقتی طور پر کچھ متاثر ہوکر دو چار قطرے آنسو بھی ٹپکا دیں لیکن اصل دلچسپی انہیں اس ہنگامے سے ہوتی ہے جو ایسے مواقع پر اعزہ واقارب، دوست واحباب اور پڑوسیوں نیز ان کے بچوں کے جمع ہو جانے سے گھر میں برپا ہوتا ہے۔ان حادثات کے مواقع پر بچوں کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ کیجئے صاف محسوس ہوگا کہ ان کے دل پر دراصل ان حادثات کا کوئی خاص اثر نہیں ہے۔موقع ملے تو وہ پوری دل جمعی سے اچھل کود اور شور وشغب میں حصہ لیں گے۔دراصل وہ اپنی فطرت سے مجبور ہیں۔

بچہ ایک زندۂ جاوید ہستی ہے۔اس کے اندر مختلف قسم کی قوتیں اور صلاحیتیں ہوتی ہیں۔وہ کچھ بنیادی خواہشات وجذبات رکھتا ہے۔اس کی اپنی پسند وناپسند اور اپنی دلچسپیاں اور ارادے ہوتے ہیں۔اس کے سوچنے سمجھنے،محسوس کرنے اور متاثر ہونے، سیکھنے اور عادی بننے،متوجہ ومنہمک ہونے، حفظ واعادہ کرنے کے مخصوص ڈھنگ ہوتے ہیں۔ بلوغ تک پہنچنے اور بڑوں کی دنیا میں داخل ہونے تک اسے متعدد مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہر مرحلے کی کچھ اہم خصوصیات ہوتی ہیں اوران خصوصیات کے کچھ بنیادی تقاضے،تعلیم وتربیت کے سلسلے کی کوششیں اس وقت بارآور ہوسکتی

ہیں جب ان سب کے بارے میں معلومات حاصل کر کے ان کا پورا لحاظ رکھا جائے۔

بچوں کو متعدد قوتیں وصلاحیتیں پیدائشی طور پر ملتی ہیں اور متعدد وہ انہی کی اساس پر خود یا دوسروں کی کوششوں سے حاصل کرتے ہیں۔ پیدائش کے ساتھ ملنے والی قوتوں اور صلاحیتوں کو پیدائشی قوتیں، فطری صلاحیتیں یا فطرت کہا جاتا ہے۔ یہ خالصۃً اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہوتی ہیں، ان کے حصول میں کسی فرد کی اپنی یا دوسروں کی کوششوں کو بالکل دخل نہیں ہوتا اور نہ ان میں کسی طرح کی کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔ انسانی کوششوں سے صرف ان کو پروان چڑھایا اور کسی خاص رخ پر ڈالا جا سکتا ہے۔

تعلیم وتربیت کا مقصود دراصل فطری قوتوں کو اجاگر کرنا، انہیں سنوارنا سدھارنا اور صحیح رخ پر ڈالنا ہے اور اگر خدانخواستہ وہ غلط رخ پر پڑ گئی ہوں تو ان کی اصلاح کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے عطیات یوں تو بے شمار ہیں لیکن تعلیم وتربیت کی غرض سے بچوں کی مندرجہ ذیل فطری قوتوں اور صلاحیتوں کے بارے میں مختصر معلومات اور ان کو صحیح رخ پر ڈالنے کے طریقے جان لینا ضروری ہیں۔

۱۔ اضطراری قوتیں۔

۲۔ جبلتیں وجذبات۔

۳۔ استعدادیں۔

۱۔ اضطراری قوتیں (Reflexes):

اللہ تعالیٰ نے ہمارے جسم میں کم وبیش پچاس ایسی قوتیں رکھ دی ہیں جو جسم کے مختلف اعضا کو ہنگامی حادثات یا اچانک پہنچ جانے والے نقصانات سے بچانے میں بے حد معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ان کی وجہ سے اضطراری طور پر متعدد ایسے مفید کام انجام پا جاتے ہیں جن میں ہمارے شعور اور ارادے کو قطعاً کوئی دخل نہیں ہوتا۔ مثلاً چھینکنا، کھانسنا، بلغم اور تھوک خارج کرنا، پلک جھپکنا،

چیخنا چلانا، ہانپنا، کانپنا، جمائی لینا، مسکرانا، قے کرنا، ناک بھوں چڑھانا، جھرجھری لینا اور مختلف غدودوں سے رطوبت خارج کرنا وغیرہ۔

اضطراری افعال کی خصوصیات: ان فطری قوتوں کی وجہ سے جو اضطراری افعال سرزد ہوتے ہیں ان میں مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

- ☆ تیزی سے رونما ہونا۔
- ☆ ہمیشہ ایک متعین انداز سے ہونا۔
- ☆ غیر ارادی طور پر ہونا۔
- ☆ شعور کو دخل نہ ہونا۔
- ☆ وقوع پذیر ہونے کے لیے ہمہ وقت آمادہ رہنا۔
- ☆ مقامی ہونا یعنی جسم کے ایک مخصوص حصے تک محدود ہونا۔
- ☆ ناقابل تغیر ہونا۔

۲۔ جبلتیں (Instincts):

یہ وہ فطری قوتیں یا طبعی رجحانات ہیں جن کی بدولت پہلے سے سیکھنے یا ٹریننگ حاصل کیے بغیر ہم متعدد کام سرانجام دے لیتے ہیں۔ یہ رجحانات کسی وقتی تحریک کی وجہ سے جسم میں خاص کیفیت پیدا کر دیتے ہیں اور پورا جسم مخصوص اور متعین طور پر کام کرنے لگتا ہے۔ مثلاً بھوک لگنے پر غذا تلاش کرنا، خطرناک چیز سے ڈر کر بھاگنا، دشمن سے لڑنا، نئی چیز سامنے آئے تو معلومات حاصل کرنے کے لیے متجسس ہونا وغیرہ۔ کسی جبلت کا اظہار کس طریقے سے ہو گا اس کا انحصار ماحول پر ہے۔ ہر بچہ بولنا چاہتا ہے لیکن کون سی بولی اپنائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ اس کے ماحول پر ہے۔ جو کچھ وہ گردوپیش بولتے سنے گا اس کی وہ بھی تقلید کرے گا۔ اضطراری کے مقابلے میں جبلی افعال:

- ☆ زیادہ پیچیدہ ہوتے ہیں۔

☆ ان میں شعور کو بھی کسی حد تک دخل ہوتا ہے۔

☆ پورا جسم منہمک ہو جاتا ہے۔

☆ متعدد طریقوں سے روبعمل ہو سکتے ہیں۔

☆ تربیت سے ان میں کسی حد تک تغیر وتبدل ہو سکتا ہے۔

۳۔ استعداد (Capacity):

وہ فطری صلاحیتیں جن کے بروئے کار آنے میں عقل وذہانت اور شعور وارادے کو غیر معمولی دخل ہوتا ہے۔ مثلاً انتظامی صلاحیت، کسی خاص مضمون یا فن کی طرف خصوصی میلان، قیادت اور رہنمائی کی قابلیت وغیرہ۔ چونکہ ان کا تعلق ذہانت سے بھی ہوتا ہے اور تجربہ وتربیت سے ان میں کافی تغیر وتبدل کا بھی امکان ہوتا ہے۔ اس لیے مختلف افراد میں ان صلاحیتوں کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔

اضطراری قوتیں اور تربیت:

چونکہ اضطراری افعال متعین طریقے سے روبعمل ہوتے ہیں اور ان میں کسی طرح کا تغیر وتبدل ممکن ہی نہیں ہے۔ نیز ان کے سرزد ہونے میں شعور اور ارادے کو بھی کوئی دخل نہیں ہوتا اس لیے اس پہلو سے اس ضمن میں تربیت کا تو سوال ہی نہیں ہوتا۔ البتہ اضطراری افعال کے ضمن میں دو پہلوؤں سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

الف: متعدد اضطراری افعال ایسے ہیں جو جب روبعمل ہونے لگتے ہیں تو عموماً شعور میں آ جاتے ہیں۔ مثلاً کھانسنا، جمائی لینا، چھینکنا، تھوک یا بلغم خارج ہونا وغیرہ۔ اس کے ضمن میں بچپن ہی سے مندرجہ ذیل باتوں کا عادی بنانا چاہیے۔

☆ کھانسی، جمائی یا چھینک آنے لگے تو منہ پر ہاتھ یا رومال رکھ لیا کریں۔

☆ بلغم یا تھوک نگلنے سے پرہیز کریں۔ یہ گندی بات ہے۔

☆ ایک طرف جا کر تھوکیں یا ناک صاف کریں۔ ہر جگہ گندگی نہ پھیلائیں۔

☆ نماز یا مجلس میں ہوں تو حتی الامکان کھانسی یا جمائی کو دبائیں یعنی بار بار بہت بلند آواز سے نہ کھانسیں اور نہ جمائی لینے میں بہت زیادہ منہ کھولیں۔

☆ چھینکنے کے بعد اَلْحَمْدُلِلّٰہ، جمائی لینے کے بعد لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ کہا کریں۔ دوسرے کی چھینک کے جواب میں یَرْحَمُکَ اللّٰہِ کہیں۔

(ب): دوسرا قابل لحاظ پہلو اضطرار کا مشروط ومربوط کر لینا یا ہو جانا یعنی (Conditioning of Reflexes) ہے۔ بسا اوقات جبلی حرکات یا اضطراری افعال اصل محرک کے بغیر بھی کسی مصنوعی محرک کی وجہ سے سرزد ہونے لگتے ہیں۔ انہیں مشروط یا مربوط اضطراری افعال کہتے ہیں۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

پیدائش کے بعد ہی ہر فرد کو آئے دن متعدد تجربات ومشاہدات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان میں کچھ تلخ ہوتے ہیں کچھ خوشگوار، بعض نفع بخش ہوتے ہیں بعض مضرت رساں۔ ظاہر ہے تجربات ہی کی مناسبت سے جبلی یا اضطراری حرکات سرزد ہوتی ہیں۔ اب جن افراد، حالات یا اشیا سے جیسے کچھ تجربات وابستہ ہو جائیں گے ان سے دوچار ہوتے ہی ویسی ہی حرکات سرزد ہونے لگیں گی خواہ عملاً اس طرح کے تجربات کی نوبت نہ آئے۔ مثلاً اندھیرا بذات خود کوئی ڈرنے کی چیز نہیں لیکن ایک بچے کو اندھیرے میں کسی موذی جانور یا کیڑے کوڑے سے ضرر پہنچ جاتا ہے۔ یا کسی چیز سے ٹکرا کر چوٹ لگ جاتی ہے تو وہ اندھیرے سے ڈرنے لگتا ہے خواہ وہاں گزند پہنچانے والی کوئی چیز نہ بھی ہو۔

ایک شیر خوار بچے کو ماں کی چھاتی سے زیادہ مرغوب چیز اور کیا ہو سکتی ہے؟ جب دودھ چھڑانے کے لیے رسوت، کونین کا ست یا کوئی اور کڑوی چیز لگا کر دی جاتی ہے اور منہ مارتے ہی

بچے کو بار بار کڑواہٹ کا تلخ تجربہ ہوتا ہے تو پھر وہ نہ صرف منہ مارنا بند کر دیتا ہے بلکہ چھاتی دیکھتے ہی منہ بنانے لگتا ہے۔ ننھے بچے گھر میں پلے ہوئے یا آس پاس پائے جانے والے جانوروں اور پرندوں وغیرہ کو بہت پسند کرتے ہیں ان کے ساتھ کھیلنا چاہتے ہیں۔ رو رہے ہوں تو انہیں دیکھ کر بہل جاتے ہیں، لیکن ایک ننھا بچہ جس کی انگلی طوطے نے کاٹ لی ہو یا بھوں بھوں کر کے کتے نے دوڑایا ہو یا جس کی نیند دو بلیوں کی لڑائی میں خوف ناک آوازوں سے ڈر کر اچاٹ ہوگئی ہو وہ ان کے نام سے ڈرنے لگتا ہے اور ان کی صورت دیکھ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

مقابلوں میں ناکام رہنے والے کا میدان میں اترتے ہی پسینہ چھوٹنے لگتا ہے۔ فیل ہو جانے والا بچہ امتحان کے نام سے گھبراتا ہے۔ اس کے برعکس جیت جانے والے بچے مقابلوں کا اور اچھے نمبر لانے والے امتحانات کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

ایک ننھے بچے کے سامنے خوش رنگ کھلونا پیش کیا جاتا ہے۔ جب وہ لینے کے لیے ہاتھ لپکاتا ہے تو پیچھے سے خوفناک آوازیں نکالی جاتی ہیں جس سے وہ ڈر جاتا ہے۔ یہ عمل بار بار کیا جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کھلونے جیسی مرغوب چیز جب سامنے لائی جاتی ہے تو وہ خوف کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے چاہے ڈراؤنی آواز نہ بھی نکالی جائے۔ لیکن جب ڈراؤنی آوازیں بالکل بند کر دی جاتی ہیں اور وہی کھلونا پیش کرنے کے ساتھ ہر بار مٹھائی بھی دی جاتی ہے۔ تو پھر کھلونے سے جو وحشت ہوتی تھی وہ رفتہ رفتہ دور ہو جاتی ہے۔

ایک بچے کو نہایت شفقت و محبت سے کلام پاک پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں جو قرآن حکیم دیا جاتا ہے وہ اچھے کاغذ پر بہت خوبصورت چھپا ہے جلد نفیس اور جزدان خوش رنگ ہے۔ جب بھی وہ قرآن شریف لے کر بیٹھتا ہے شاباشی پاتا اور بہت اچھی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان مسلسل خوشگوار تجربات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن حکیم سے اس کا لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور اسے دیکھ کر لپکتا ہے لیکن اگر رویہ اس کے برعکس ہو تو صورت سے گھبرانے لگتا ہے اور اپنے شوق سے تلاوت بھی گوارا نہیں کرتا۔

ایک بچہ ریاضی کے گھنٹے میں اکثر ڈانٹا اور پھٹکارا اور مارا پیٹا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اسے مضمون ہی سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اس مضمون کے ساتھ نہایت تلخ تجربات وابستہ ہو جاتے ہیں۔ یہی کچھ افراد کے سلسلے میں بھی ہوتا ہے۔ ایک معلم بچوں کے ساتھ نہایت شفقت ومحبت سے پیش آتا ہے محنت سے پڑھانے کے ساتھ ان کو کھیلنے اور خوش وخرم رہنے کے بھی مواقع بہم پہنچاتا ہے۔ ناگزیر صورت میں کبھی سختی کرتا ہے تو شفیق والدین کی طرح محبت وشفقت اور حسن سلوک سے جلد ہی تلافی کر دیتا ہے، وہ بیمار پڑتا ہے تو سات آٹھ برس کے بچے عیادت کے لیے جاتے ہیں۔ صحت کی دعائیں کرتے ہیں۔ تعطیلات کے بعد معلم کو گھر سے آنے میں تاخیر ہوتی ہے تو بچے بے چین ہو جاتے ہیں اور جلد آنے کے لیے آپس میں چندہ کر کے تار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک دوسرا معلم اکثر ڈانٹ پھٹکار اور مار پیٹ سے کام لیتا ہے۔ جائز حدود میں بھی بچوں کی دلچسپیوں کی رعایت نہیں کرتا۔ بچے اس کی صورت سے گھبرانے لگتے ہیں اس کو بددعائیں دیتے ہیں اور جب علیل ہوتا ہے تو بچوں میں مشہور ہو جاتا ہے کہ انتقال ہو گیا ہے یہاں تک کہ ایک بچے کے سرپرست تعزیت کے لیے آ جاتے ہیں۔ یہ دراصل اس نفرت کا اظہار ہے جو معلم کے ناروا سلوک کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ خود اندازہ لگایئے ایسے استاد کا بچے کیا اثر قبول کریں گے جس کی صورت دیکھتے ہی ان پر عجب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

جھوٹ، چوری، خوش اخلاقی وملنساری، بدمزاجی وچڑچڑاپن، تحمل وبردباری یا چھچھوراپن، کسی مضمون سے لگاؤ یا نفرت، کسی فرد سے محبت یا بغض وعناد، کتے بلی یا اندھیرے سے خوف، جانوروں کو ستانا یا ان پر رحم کرنا، پڑھنے میں محنت یا بھگوڑاپن وغیرہ دراصل مشروط اضطراری وجبلی حرکات ہیں جو ساری زندگی سرزد ہوتی رہتی ہیں۔

قابل لحاظ امور:

اضطراری قوتوں کا ماحول اور اس کے تجربات ومشاہدات سے اس طرح مشروط ومربوط ہو

جانا افراد کی سیرت وکردار پر دراصل بہت دوررس اثرات ڈالتا ہے، اوائل عمری کے بعض تلخ تجربات دل ودماغ پر ایسے گہرے نقوش ثبت کر دیتے ہیں کہ زندگی بھر نہیں مٹتے اور جن افراد، حالات یا مشاغل وغیرہ سے وہ مربوط ہو جاتے ہیں ان سے دوچار ہوتے ہی اضطراری طور پر وہی کیفیت طاری ہو جایا کرتی ہے۔ مثلاً اشتعال، غصہ، خوف، بے رغبتی، خوشی، رنج، محبت، ہمدردی وغیرہ کی کیفیت خواہ یہ درست مفید اور ضروری ہو یا غلط غیر ضروری اور مضر۔ ... قوتوں کے مشروط یا مربوط ہونے کے ضمن میں مندرجہ ذیل امور قابل لحاظ ہیں:

☆ والدین کو چاہیے کہ پسندیدہ عادات واطوار اور اعمال واخلاق پروان چڑھانے کے ضمن میں ہونے والی تمام کوششوں کے ساتھ اوائل عمری ہی سے خوشگوار تجربات وابستہ کر دیا کریں تاکہ بچے ایسا کرنے میں مسرت محسوس کریں اور ان کا بار بار اعادہ کر کے پسندیدہ عادات واطوار اور اچھی سیرت وکردار کے مالک بنیں۔

☆ اگر گھر پر معقول بندوبست نہ ہو سکے تو بچوں کو جلد ہی کسی اچھے مدرسے میں داخل کرا دیں۔

☆ بچوں کی ابتدائی تعلیم انتہائی خوشگوار فضا میں اور بہت پیار سے ہو۔ نیز ایسے مشاغل ومصروفیات کے ذریعے ہو جن میں بچے فطری دلچسپی لیتے ہوں تاکہ پڑھنے لکھنے اور مختلف مضامین ومشاغل سے بچوں کو انس اور لگاؤ پیدا ہو۔

☆ پڑھنے کے دوران اگر کوئی بات بچوں کی سمجھ میں بآسانی نہ آئے تو اس پر مشتعل نہ ہوں اور نہ سزا دیں ورنہ اس مضمون سے نفرت پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مستقل مزاجی سے سمجھانے کی فکر کریں۔

☆ اگر بے تدبیری یا غفلت سے بچوں میں ناپسندیدہ مشروط اضطرار قرار پا جائے مثلاً والدین یا اساتذہ کے ناروا سلوک کے باعث ان سے نفرت، کتے بلی یا اندھیرے کا خوف، مختلف مضامین ومشاغل سے بیزاری وغیرہ تو ان سے خوشگوار تجربات وابستہ کر کے جلد از جلد اصلاح کی کوشش کی جائے۔ نفرت وبغاوت کو دور کرنے کے لیے اساتذہ اور والدین بچوں

کے ساتھ مسلسل شفقت ومحبت کا مظاہرہ کریں اور حسن سلوک سے سابقہ کوتاہیوں کی پوری تلافی کر دیں۔ جن مضامین ومشاغل سے بیزاری کا اظہار کریں ان کی تدریس کو آسان اور دلچسپ بنانے کے لیے ماڈل، تصاویر، چارٹ وغیرہ کا استعمال کریں اور اگر بچے کسی درجے میں بھی ترقی کر رہے ہوں تو ہمت بندھا کر اور شاباشی دے کر مزید جدوجہد پر اکسائیں۔ اندھیرے میں کھیلنے کھانے کی چیزیں رکھ کر لانے کے لیے آمادہ کریں۔ غرض بچوں کے تلخ تجربات کو دھونے کے لیے ان چیزوں سے خوش گوار تجربات وابستہ کرنے کی پوری فکر کریں۔ امید ہے بچپن میں ان شاء اللہ جلد اصلاح ہو جائے گی۔ ورنہ یہی مستحکم ہو کر زندگی بھر شخصیت کو کمزور بنائے رکھیں گی اور نازیبا حرکات اور ناپسندیدہ کردار کا مظاہرہ کرائیں گی۔

..........☆☆☆..........

باب ۹:

جبلتیں اور جذبات

کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام. (حدیث)

''ہر بچہ اسلام کی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ مقرر فرمایا ہے۔ اس منصب کے تقاضے میں انسان پر تین طرح کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

۱۔ انفرادی (ذاتی)

۲۔ عائلی (خاندانی)

۳۔ اجتماعی (سماجی)

ان ذمہ داریوں کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو پیدائشی طور پر مختلف قسم کی قوتوں اور صلاحیتوں سے آراستہ کر کے بھیجا ہے۔ ان میں جبلتیں خاص ہیں۔

جبلتیں دراصل وہ فطری داعیات یا بنیادی خواہشات ہیں جو بچپن ہی سے ہماری تمام سرگرمیوں کی محرک ہوتی ہیں۔ ہماری حرکات وسکنات اور عادت واطوار کی پشت پر بھی براہِ راست یا بالواسطہ یہی کام کرتی ہیں اور ہمیں اپنی ذات کے تحفظ، خاندان کی بقا اور تمدن کے ارتقا میں مدد دیتی ہیں۔ اس طرح جبلتوں کو مندرجہ ذیل تین گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

☆ ذات سے متعلق: یعنی وہ جبلتیں جو جان کے تحفظ اور جسم کی صحیح کارکردگی میں معاون ہوتی ہیں۔ مثلاً غذا کی تلاش، ذخیرہ اندوزی، تجسس، جنگ جوئی، فرار وغیرہ۔

☆ خاندان سے متعلق: یعنی خاندان کی بقاء و تحفظ میں معاون مثلاً جنسی و والدینی۔

☆ سماج سے متعلق: یعنی وہ جبلتیں جو انسان کو اجتماعی زندگی گزارنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ مثلاً

گروہی جبلت، خودتوقیری، خودتحقیری، اثرپذیری، اثرآفرینی، ہمدردی، تقلید وغیرہ۔

جبلتوں کے خواص

جبلتوں میں مندرجہ ذیل اہم خواص پائے جاتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم وتربیت میں ان کا لحاظ ضروری ہے۔ ان خواص کو نظرانداز کر دینے سے بچوں کی متوازن نشوونما پر بہت مضر اثرات پڑتے ہیں۔

ا۔ ہمہ گیر ہیں:

یعنی تمام انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ کسی فرد، قوم یا قبیلے کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ البتہ شدت وخفت کے اعتبار سے افراد کے مابین فرق ہوتا ہے۔ ایک ہی جبلت، ایک فرد میں زیادہ شدید ہوتی ہے دوسرے میں کم۔ اسی طرح ان کے بروئے کار آنے کی صورتوں اور راستوں میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ ایک فرد اپنے ماحول، تربیت، تجربے، اور موثر اسوے کے زیراثر اپنی ایک جبلت کو جس طرح بروئے کار لاتا ہے، دوسرا فرد انہی کے زیراثر بالکل دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس لیے مختلف افراد کی سیرتوں اور عادات میں اتنا نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔

۲۔ فطری ہیں اور پیدائش کے ساتھ ہی مل جاتی ہیں:

لیکن سب یکبارگی نمودار نہیں ہو جاتیں بلکہ سکت اور ضرورت کے لحاظ سے رفتہ رفتہ اپنے اپنے وقت پر ان کا ظہور ہوتا ہے۔ پہلے بچے کی وہ جبلتیں کام کرنا شروع کرتی ہیں جن کا تعلق اس کی ذات سے ہوتا ہے، ان میں بھی غذا کی تلاش مقدم ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی غذا تلاش کرتا ہے، پھر بتدریج پکڑنے، رینگنے، بیٹھنے اور کھڑے ہونے وغیرہ کی جبلتیں برسرکار آتی ہیں اور وہ رفتہ رفتہ تجسس، فرار، جنگ جوئی، تعمیر اور ذخیرہ اندوزی وغیرہ کا مظاہرہ کرتا ہے۔

ذاتی کے بعد گروہی اور سماجی جبلتیں کام کرنا شروع کرتی ہیں۔ عنفوان شباب میں جنسی

جبلت کے آثار نمودار ہوتے ہیں اور سب سے آخر میں والدینی جبلت کے۔ اسی طرح ایک جبلت عمر کے کسی حصے میں زوروں پر ہوتی ہے اور کسی حصے میں اس کا زور بہت گھٹ جاتا ہے مثلاً بچپن میں تجسس اپنے شباب پر ہوتا ہے۔ جوانی میں جنسی جبلت، تعلیم وتربیت میں اس کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ جب جس جبلت کے ظہور اور زور کا زمانہ ہو اسی موقع پر مناسب رہنمائی کی جائے۔ قبل از وقت اس کو چھیڑنا یا وقت آنے پر مناسب رہنمائی کی طرف توجہ نہ دینا دونوں مضر ہیں۔

۳۔ محرک کے بغیر روبعمل نہیں ہوتیں:

یعنی جبلتیں اپنے آپ بلا ضرورت برسرکار نہیں آجاتیں بلکہ ان کو روبعمل ہونے کے لیے کوئی نہ کوئی محرک ضروری ہے۔ کوئی مدمقابل ہوگا اسی وقت جنگ جوئی کی نوبت آئے گی۔ متجسس کرنے والی چیز ہوگی تب تو اس کے بارے میں کوئی متجسس ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ بسا اوقات اصل کے بجائے اس کا تصور ہی محرک کا کام دے دیتا ہے۔

۴۔ عدم استعمال سے کمزور ہو جاتی ہیں:

یعنی کسی جبلت کے ظہور اور زور کا جو وقت ہے اگر اس وقت اس سے کام نہ لیا جائے تو وقت گزر جانے پر وہ بہت کمزور یا بسا اوقات مردہ ہو جاتی ہیں اور جس مقصد سے قدرت نے وہ دیا تھا خود وہ مقصد متاثر ہوتا ہے۔ بھیڑیائی بچوں کی مثال ہمارے سامنے ہے، بولنے، اٹھنے، بیٹھنے اور چلنے پھرنے وغیرہ کے ضمن میں ان بچوں کو بروقت تقلید کا موقع نہ مل سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی بھر سکھانے کے باوجود یہ چیزیں انہیں نہ آسکیں جب کہ ہر انسانی بچہ والدین کی طرف سے بغیر کسی خاص کوشش کے محض تقلید کر کے یہی چیزیں خود بخود سیکھ لیتا ہے۔ اسی لیے ان جبلتوں کو نظر انداز کرنے یا کچلنے کے بجائے ان کے مناسب استعمال کی طرف رہنمائی ہونی چاہیے۔

۵۔ تسکین کی صورت میں مسرت ورنہ بے چینی ہوتی ہے:

یعنی جبلی تقاضے اگر پورے ہو جاتے ہیں تو فرد کو خوشی، اطمینان اور سکون محسوس ہوتا ہے لیکن

اگر ان کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا ہو یا وہ کسی وجہ سے پورے نہ ہوسکیں تو وہ فرد پریشان، غیر مطمئن اور ناخوش رہتا ہے۔ اس لیے جائز حدود میں ان کی تسکین کا پورا سامان ہونا چاہیے۔ ورنہ بچوں کی شخصیت پر بڑے خراب اثرات پڑ سکتے ہیں۔

۶۔ جبلتیں بہت لچکدار ہوتی ہیں اور تعلیم وتربیت سے ان میں کافی تغیر وتبدل ہوسکتا ہے:

حیوانات کے مقابلے میں انسانوں کی جبلتوں میں زیادہ لچک ہوتی ہے۔ تجربہ، تربیت، تقلید اور تعقل (غور وفکر) کی وجہ سے ان کے اظہار کی صورتوں میں کافی تغیر وتبدل ہو جاتا ہے۔ مثلاً حصول معاش کے کتنے طریقے ہمارے معاشرے میں رائج ہیں جب کہ سب کی پشت پر ایک ہی جبلت، تلاش غذا کارفرما ہے۔ چنانچہ اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے انسان، حیوانات کے مقابلے میں تعلیم وتربیت سے فائدہ اٹھانے کا کہیں زیادہ اہل ہوتا ہے۔ شہد کی مکھی اپنا چھتہ بہت ہی خوبصورت اور متوازن بناتی ہے۔ لیکن ہر حال میں وہ صرف ایک ہی شکل کا بنا سکتی ہے۔ اس کے برعکس انسان اپنی جبلت تعمیر یت کو طرح طرح سے بروئے کار لاتا ہے۔ جھونپڑیوں سے لے کر آسمان سے باتیں کرنے والی شاندار عمارتیں، بھاری بھرکم مشینیں، لمبے چوڑے کارخانے کس بات کی غمازی کرتے ہیں۔ بنی نوع انسان کو ایک شاندار تمدن کا مالک بنانے میں دراصل جبلتوں کی تعلیم پذیری کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔

جبلتیں اور جذبات

جذبات دراصل ہمارے وہ خوش گوار یا ناخوش گوار شدید تاثرات ہیں جو ہمارے ذہن ودماغ میں اختلال پیدا کر دینے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ ان کے زیر اثر ہم سے جو حرکات سرزد ہوتی ہیں ان میں عقل وشعور کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ مثلاً غصہ، خوف، حیرت، نفرت، رنج، غرور

وغیرہ۔

جبلتوں اور جذبات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔تقریباً ہر جبلت کے ساتھ کوئی نہ کوئی جذبہ ضرور وابستہ ہوتا ہے۔ایک فرد جب کسی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے اور کوئی محرک اس کی کسی جبلت کو چھیڑتا ہے تو اس کے ساتھ کا جذبہ بھی ابھر آتا ہے۔مثلاً

۱۔ تجسس کی جبلت کے ساتھ حیرت واستعجاب کا جذبہ۔

۲۔ جنگ جوئی کی جبلت کے ساتھ غصہ واشتعال کا جذبہ۔

۳۔ فرار کی جبلت کے ساتھ خوف کا جذبہ۔

۴۔ ذخیرہ اندوزی کی جبلت کے ساتھ ملکیت کا جذبہ۔

۵۔ تعمیریت کی جبلت کے ساتھ تخلیق کا جذبہ۔

۶۔ جنسی جبلت کے ساتھ شہوت کا جذبہ۔

۷۔ والدینی جبلت کے ساتھ شفقت کا جذبہ۔

۸۔ قہقہہ جبلت کے ساتھ مسرت وتفریح کا جذبہ۔

۹۔ تلاش غذا کے ساتھ بھوک اور اشتہا کا جذبہ۔

۱۰۔ خودتوقیری اظہار نمائش کے ساتھ غرورو ناز وخودنمائی کا جذبہ۔

۱۱۔ خودتحقیری کی جبلت کے ساتھ حوالگی وسپردگی پابندگی ورضاجوئی کا جذبہ۔

۱۲۔ گروہی جبلت کے ساتھ احساس تنہائی یا اکیلے پن وبے کسی کا جذبہ۔

۱۳۔ بیزاری ومغایرت کے ساتھ نفرت وحقارت کا جذبہ۔

۱۴۔ دہائی دینے کے ساتھ رنج وغم اور تکلیف واذیت کا جذبہ۔

جبلتیں اور جذبات اکثر ایک دوسرے سے اتنے وابستہ ہوتے ہیں کہ ایک علت دوسرا معلول یا دونوں ایک ہی علت کے معلول محسوس ہوتے ہیں۔اسی طرح متعدد جبلتوں اور جذبات میں کوئی فرق ہی نہیں کیا جاتا بلکہ عام بول چال میں دونوں کے لیے ایک ہی لفظ

استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً غصہ، حسد، رنج، محبت، نفرت، خوف وغیرہ کو ہم جذبہ بھی کہتے ہیں اور جبلت بھی۔

جذبات کے خواص

جذبات میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ

۱۔ ذہنی توازن کو بگاڑ دیتے ہیں اور فرد کو اس قابل نہیں رکھتے کہ وہ اچھی طرح غور وفکر یا مناسب فیصلہ کر سکے اسی لیے جذبات کے تحت عموماً ایسی حرکات سرزد ہو جاتی ہیں جن پر بعد میں بہت پشیمانی ہوتی ہے۔

۲۔ جسمانی اختلال کا موجب بنتے ہیں۔ ہمارے اعضاو جوارح عام حالات میں جس انداز سے کام کرتے ہیں جذبات طاری ہونے پر ان میں طرح طرح کے تغیرات رونما ہونے لگتے ہیں۔ دل دھڑکنا، پسینہ چھوٹنا، مختلف قسم کی رطوبات خارج ہونا، رونگٹے کھڑے ہو جانا، جسم میں کپکپی، چہرے پر سرخی یا زردی، نتھنے پھول جانا، منہ میں جھاگ آ جانا، غرض پورے جسم پر خاص قسم کی کیفیات طاری ہو جاتی ہیں۔ نظام انہضام، دوران خون، اخراج فضلہ ہر ایک متاثر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تو بہت زیادہ جذباتی لوگوں کی صحت ٹھیک نہیں رہتی اور رنج وغم یا غصے کی حالت میں کھانے سے منع کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اطمینان وسکون یا احباب کی معیت میں کھایئے تو زیادہ کھایا بھی جاتا ہے اور خوب ہضم بھی ہوتا ہے۔

۳۔ جذبات کی نوعیت بڑی حد تک انفرادی، ذاتی اور داخلی تجربے کی ہوتی ہے۔ ایک ہی واقعہ مختلف افراد پر مختلف قسم کی جذباتی کیفیات طاری کرتا ہے، مثلاً ایک شخص کی وفات اس کی اہلیہ، اولاد، احباب ومخالفین کے اندر مختلف قسم کے جذبات طاری کرتی ہے جن کی کیفیت اور کمیت دونوں میں اختلاف ہوتا ہے۔ خود ایک فرد پر مختلف حالات اور پس منظر میں ایک ہی چیز یا ایک ہی طرح کے واقعات سے جو کیفیتیں طاری ہوتی ہیں ان میں شدید اختلاف

پایا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک فرد پر جو کچھ بیت رہی ہوتی ہے اس کا صحیح احساس اسی فرد کو ہوتا ہے دوسرے اس کا ٹھیک اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کسی کے جذبات کا خارج سے اندازہ لگانے والے اسی لیے اکثر شدید غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں۔

۴۔ جذبات متعدی ہوتے ہیں یعنی ایک فرد پر جو جذبات طاری ہوتے ہیں دیکھنے والے پر بھی وہی طاری ہونے لگتے ہیں۔ ایک کو غمگین اور روتا دیکھ کر سب کے منہ لٹک جاتے ہیں جب کہ ہنس مکھ اور خوش مزاج لوگوں کی صحبت میں سب کے چہروں پر مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

۵۔ معمولی بات پر بھڑک سکتے ہیں اور بھڑکنے کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ لین دین میں ایک پیسے پر جھگڑے، معمولی باتوں پر چاقو زنی اور قتل کی نوبت آ جانا، مذاق مذاق میں زندگی بھر کے لیے تعلقات منقطع ہو جانا وغیرہ روزمرہ کے مشاہدات ہیں۔

۶۔ دیر تک قائم رہنے کی صورت میں مستقل شکل اختیار کر کے موڈ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ دو افراد جب ایک دوسرے سے خفا ہوتے ہیں تو معمولی باتوں پر لڑ جایا کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات خفگی کسی سے ہوتی ہے اور غصہ کسی اور پر بھی اتارنے لگتے ہیں۔ خوش وخرم ہوں یا محبت واحترام کا جذبہ کارفرما ہو تو ناگوار باتوں کو بھی پی جاتے ہیں۔

۷۔ جذبات میں مڑ جانے یا رخ تبدیل کرنے کی بھی صلاحیت ہوتی ہے۔ جو بچے ایک دوسرے کو چھیڑتے یا ایک دوسرے کی شکایت کرتے رہتے ہیں آپس میں گہرے دوست بھی ہو جاتے ہیں۔ ان کا چھیڑنا اور شکایت کرنا بھی دراصل تعلق خاطر کی دلیل ہوتا ہے۔ خصوصاً بچپن میں بہن بھائیوں کی آپس میں چھیڑ چھاڑ تو عموماً غیر معمولی لگاؤ ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

۸۔ ہمہ گیر ہوتے ہیں۔ بچے، جوان، بوڑھے سب کے جذبات مشتعل ہو سکتے ہیں۔ البتہ ننھے بچوں اور نوجوانوں میں یہ بہت شدید ہوتے ہیں۔ بچے جلد مشتعل ہو جاتے ہیں اور ان

کے جذبات اتنے شدید ہوتے ہیں کہ معمولی بات پر چیخنے چلانے اور زمین پر لوٹنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ کیفیت بہت عارضی ہوتی ہے وہ جلد ہی بہل بھی جاتے ہیں۔ آنسوؤں سے تر چہروں پر مسکراہٹ کھیلتے ہوئے غالباً سب نے مشاہدہ کیا ہوگا۔ جوانی میں جذبات کی شدت نتائج سے بے پروا کر کے خودکشی تک کر لینے پر آمادہ کر لیتی ہے۔

۹۔ جذبات کو بھڑکانے میں مزاج کو بھی بہت دخل ہوتا ہے۔ بلغمی مزاج کے لوگوں کے مقابلے میں دموی مزاج کے لوگ جلد مشتعل اور خفا ہو جاتے ہیں۔ سوداوی مزاج کے لوگ زود رنج اور حساس ہوتے ہیں اور سب کچھ اپنے ہی اوپر اوڑھ لیتے ہیں تو صفراوی مزاج کے لوگ اپنے جذبات کو بالکل دبا نہیں پاتے اور مایوسی یا بزدلی کا جلد شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ان جذبات کے طاری ہونے پر جسم کے اندر جو کیمیاوی تبدیلیاں ہوتی ہیں ان کا کچھ جز پہلے ہی سے برسر کار رہتا ہے اور معمولی تحریک ''سونے پر سہاگہ'' یا ''کریلہ کڑوا اس پر نیم چڑھا'' کا مصداق بنا دیتی ہے۔

۱۰۔ ایک ہی جذبہ بار بار طاری ہو تو جذباتی عادت ڈالنے کا موجب ہو جاتا ہے۔ ایک فرد کو بار بار چھیڑا جائے تو وہ چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ مایوسیوں اور ناکامیوں کا مسلسل شکار ہونے پر قنوطیت اور مسلسل کامیابیوں کی صورت میں رجائیت طاری ہوتی ہے۔ لگاتار تحقیر وتذلیل کے باعث احساس کمتری اور لگاتار ناز برداری کے نتیجے میں احساس برتری پروان چڑھتا ہے۔ مختلف امور میں ہمارے رویے، احساسات اور میلانات اسی کے نتیجے میں جنم لیتے ہیں۔

جبلتوں اور جذبات کی اہمیت

ہماری زندگی میں جبلتوں اور جذبات کی بڑی اہمیت ہے۔ یہی ہماری سیرت کی اساس، کردار کا سرچشمہ، اعمال کی محرک اور عادات واطوار کا مخزن ہیں۔ کارزار حیات میں مختلف قسم کی

مہمات سر کرنے کے لیے آلات وسامان اور گولہ بارود کا ذخیرہ ہیں۔ جہاد زندگانی میں یہی مردوں کی شمشیریں ہیں، ٹھیک ٹھیک استعمال ہوں تو مجاہد اور غازی بنا دیں ورنہ ظالم و جابر اور رہزن وقاتل۔ صحیح رخ پر پڑ جائیں تو اللہ کا صالح بندہ زمین پر اس کا خلیفہ اور صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات بنانے میں معاون ومددگار ہوں اور فلاح دارین سے ہم کنار کریں۔ غلط رخ اختیار کر لیں تو جانوروں سے بھی بدتر بنا کر رکھ دیں اور دونوں جہان کی رسوائی اور خسران کا موجب بنیں۔

اعتدال پر رہیں تو اخلاق حسنہ کہلائیں اور شخصیت کو چار چاند لگا دیں۔ اعتدال سے ہٹیں تو اخلاقی گناہ کہلائیں اور سب کی نظروں سے گرا دیں۔ اوصاف کے مندرجہ ذیل جوڑوں میں سے ہر ایک میں کوئی ایک ہی جبلت یا جذبہ کام کر رہا ہے مگر دیکھ لیجئے کہ اظہار کی مختلف شکلیں اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہیں۔

۱۔ محبت، شہوت

۲۔ حریت، لاقانونیت

۳۔ حزم واحتیاط، خوف وبزدلی

۴۔ مروت ورواداری، بے اصولا پن ومداہنت

۵۔ قوت وسرگرمی۔ جبر وتشدد

۶۔ تفکر وتدبر۔ افسردگی وقنوطیت

۷۔ کفایت شعاری وجزرسی۔ بخل وکنجوسی

۸۔ خوداعتمادی۔ خودرائی

۹۔ تعظیم وتکریم۔ تملق وکاسہ لیسی

۱۰۔ جرأت وہمت۔ تہور وناعاقبت اندیشی

۱۱۔ تعلیم پذیری۔ سریع الاثری

۱۲۔ خوش اعتقادی۔ توہم پرستی یا ضعیف الاعتقادی

غرض جبلتوں اور جذبات کے اظہار کے متعدد طریقے ہو سکتے ہیں۔ ان میں کچھ پسندیدہ ہوتے ہیں اور کچھ ناپسندیدہ۔ تعلیم وتربیت کا کام یہ ہے کہ ان پر قابو پانے کا ڈھنگ سکھائے، ان کو صحیح رخ پر ڈالے اور اگر غلط رخ پر پڑ گئے ہوں تو اصلاح کرنے کی کوشش کرے۔

قابل لحاظ امور:

جذبات کے ضمن میں مندرجہ ذیل امور قابل لحاظ ہیں:

☆ اساتذہ اور والدین کو چاہیے کہ بچوں کے ساتھ انتہائی شفقت اور محبت کا رویہ رکھیں، کبھی اگر جھڑکنے یا سزا دینے کی نوبت بھی آئے تو جلد ہی حسن سلوک سے اس کی تلافی کر دیں۔

☆ بہن بھائیوں، ہمجولیوں اور درجے کے ساتھیوں کو بھی ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک اور شفقت ومحبت کا برتاؤ کرنے پر برابر ابھارتے رہیں اور کبھی بدمزگی ہو جائے تو جلد ہی صلح وصفائی کرا دیا کریں۔ اس طرح بچوں میں والدین، اساتذہ، گھر، مدرسہ، بہن بھائیوں، ہم جولیوں وغیرہ سے جذباتی لگاؤ پیدا ہوگا۔ یہی لگاؤ تعلقات کو مستحکم کرنے اور ہر حال میں استوار رکھنے میں معاون ثابت ہوگا۔

☆ ناروا سلوک یا آپس کی بدمزگیاں، بچوں میں نفرت، کینہ، بغض وعداوت کے جذبات کو پالتی اور انہیں بغاوت یا مفارقت پر آمادہ کرتی ہیں۔ ان کے نتائج بسا اوقات انتہائی خطرناک ہوتے ہیں۔ دین دار گھرانوں اور دینی مدارس کے بچوں کا بڑے ہو کر ملحدوں اور خدا کے باغیوں کی صف میں شریک ہو جانا، شریف خاندان کی بہو بیٹیوں کا خودکشی یا عصمت فروشی تک پر اتر آنا، بڑے آدمیوں کی اولاد کا جرائم پیشگی پر مائل ہو جانا وغیرہ عموماً ناروا سلوک ہی کے شاخسانے ہوتے ہیں۔ اس لیے باہمی تعلقات کی استواری پر غیر معمولی توجہ دیں۔

☆ ذوق سلیم اور جذبات لطیف کی تربیت کے لیے گھر، درجے اور مدرسے کے ماحول کو حتی الامکان صاف ستھرا، دل کش اور جاذب نظر بنائیں۔ سامان کی ترتیب میں خوش سلیقگی،

بات چیت، سلوک، برتاؤ میں شائستگی کا لحاظ رکھیں، آداب کی پوری پابندی کریں۔ وضع داری کو حتی الامکان نبھائیں، دست کاریوں، آرٹ، کرافٹ اور باغبانی کی تعلیم کا بندوبست کریں۔

☆ پاکیزہ جذبات اور اعلیٰ تصورات کو پروان چڑھانے کے لیے معیاری شخصیتوں کے واقعات، ادبی شہ پاروں اور اصلاحی کہانیوں وغیرہ سے مدد لیں۔

☆ گھر کے کاموں اور مدرسے کے مضامین ومشاغل کے ساتھ خوشگوار تجربات وابستہ کرائیں۔ بچوں کی کوششوں کو سراہیں۔ اچھے نتائج پر دل کھول کر شاباشی دیں۔ نمبر دینے میں فراخ دلی برتیں۔ یہ سب باتیں چستی اور دل جمعی کا ذریعہ ہیں۔ ایسا کرنے سے بچوں کا دل بڑھتا ہے۔ وہ زیادہ محنت اور لگن سے کام کرتے ہیں، مایوسی یا بددلی کا شکار نہیں ہوتے۔

☆ قرآن مجید اور مساجد سے جذباتی لگاؤ پیدا کرائیں۔ قرآن مجید کی تعلیم خوشگوار فضا میں دیں۔ تلاوت کے لیے جو نسخہ فراہم کیا جائے، اس کا کاغذ، کتابت، طباعت حتی الامکان عمدہ ہو، جلد نفیس اور جزدان جاذب نظر ہو۔ نہایت ادب واحترام سے اٹھایا اور رکھا جائے۔ پڑھاتے وقت سختی سے گریز کریں۔ محبت وشفقت، ہمت افزائی اور مناسب رہنمائی کا پورا اہتمام کریں۔ قرآن حکیم کی تعلیم کو بار ہرگز نہ بننے دیں ورنہ جذباتی لگاؤ پیدا کرنے کی بجائے نفرت کا موجب بنیں گے۔

☆ مسجدیں صاف ستھری اور پرکشش ہوں۔ ماحول پرسکون اور سنجیدہ ہو۔ بڑے لوگ مسجد کے آداب کا پورا لحاظ رکھیں۔ ننھے بچوں کو تو خیر مسجدوں میں لے جانا نہیں چاہیے۔ البتہ پانچ چھ سال کے ہو جائیں تو صفائی اور ستر پوشی کا اہتمام کر کے انہیں کسی کسی وقت اپنے ساتھ مسجد میں لے جایا کریں۔ نمازیوں کو چاہیے کہ مسجد جانے پر بچوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں۔ ناک بھوں سکوڑنے یا جھڑکنے سے پرہیز کریں۔ آداب کی خلاف ورزی ہو

جائے تو محبت سے سمجھادیں۔ بڑے خود اگر مسجد کے آداب کا پورا لحاظ رکھیں گے تو رفتہ رفتہ بچے اپنے آپ پابند ہو جائیں گے بسا اوقات بڑے بوڑھے لوگ بچوں کو مسجدوں میں نہایت بے دردی سے ڈانٹ دیتے ہیں جس کے نتیجے میں بچے مسجد جانے سے گریز کرنے لگتے ہیں۔ یاد رہے اس طرح کی حرکات بچوں پر بہت برا اثر ڈالتی ہیں۔

☆ بچے جوں جوں بڑے ہوتے جائیں، انہیں اللہ تعالیٰ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کے احسانات، صحابہ کرامؓ صلحائے امتؒ، بزرگان دینؒ، مشاہیر ملت اور فلاحی ورفاہی اداروں کی خدمت کا احساس دلا کر ان سے جذباتی لگاؤ پیدا کرائیں۔ یہ لگاؤ انہیں حق سے محبت اور باطل سے نفرت پر آمادہ کرے گا۔ گمراہوں اور غلط کاروں سے رشتہ جوڑنے میں مانع ہوگا اور دین وملت کی خدمت پر برابر اکساتا رہے گا۔

☆ جذبات کے عین تلاطم کی حالت میں بچوں کو نہ چھیڑیں بلکہ جائز حدود میں تسکین کا موقع دیں۔ البتہ ناپسندیدہ رخ اختیار کرنے سے روکنے کے لیے نہایت حکمت اور تدبیر سے کام لیں۔

☆ گھر، مدرسے یا اعزہ واقارب کے یہاں منعقد ہونے والی تقریبات میں بچوں کو حصہ لینے اور اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے مواقع دیں۔ خصوصاً مہمانوں کی آمد پر مسرت اور ان کی خاطر تواضع کے اہتمام وغیرہ کے ضمن میں۔ اس سے بچوں کے جذبات کی تسکین ہوگی۔ پسندیدہ جذبات ابھریں گے اور جذباتی لگاؤ پیدا ہوگا۔

☆ بچوں کے جذبات اگر خدانخواستہ غلط رخ اختیار کرلیں تو صحیح اسباب کا پتہ لگا کر ازالے کی کوشش کریں تاکہ آئندہ اس کا موقع ہی پیش نہ آئے۔ اگر صحت کی خرابی کے باعث ایسا ہوا ہو تو مناسب علاج کرائیں۔ اگر باز رکھنے کے لیے سزا دینا ہی ناگزیر ہو تو بہت سوچ سمجھ کر سزا دیں اور پھر جلد ہی غبار دھو ڈالیں۔

باب ۱۰:

نشوونما کے مراحل

بچے بتدریج بلوغ تک پہنچتے ہیں۔ بڑوں کی دنیا میں داخل ہونے کے لیے انہیں مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔نشوونما کے یہ مراحل اپنی الگ الگ خصوصیات رکھتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم وتربیت میں اگر ان خصوصیات کا لحاظ رکھا جاتا ہے تب تو کوششیں نتیجہ خیز اور بارآور ہوتی ہیں۔ورنہ باوجود غیر معمولی محنت کے کامیابی مشتبہ رہتی ہے بلکہ بسا اوقات ان کوششوں کے نتائج الٹے نکلتے ہیں۔

مختلف مراحل:

ذہنی وجسمانی حیثیت سے بلوغ تک پہنچنے کے لیے بچوں کو مندرجہ ذیل مراحل طے کرنے پڑتے ہیں:

۱۔ طفولیت: (ابتدائی بچپن) پیدائش سے پانچ سال کی عمر تک۔

۲۔ بچپن: چھ سے نو سال کی عمر تک۔

۳۔ لڑکپن: نو دس سال سے بارہ تیرہ سال کی عمر تک۔

۴۔ عنفوان شباب: (نوجوانی) تیرہ چودہ سال سے سترہ اٹھارہ سال کی عمر تک۔

آب وہوا، ماحول اور معاشرتی حالات کا نشوونما پر غیر معمولی اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ ہر بچے کے مخصوص حالات کی وجہ سے ان ادوار کی مدت میں کچھ فرق ہو جاتا ہے اور تمام بچوں میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ اسی طرح ایک بچہ بتدریج ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں داخل ہوتا ہے۔ اس لیے اوپر ہر مرحلے کی جو مدت درج کی گئی ہے اسے ایک عام اندازہ ہی سمجھنا

ہے۔ بہرحال ہر بچے کو ان مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔

ا۔ طفولیت (پیدائش سے پانچ سال تک)

یہ مرحلہ مختلف حیثیتوں سے نہایت اہم ہے۔ پانچ سال کی عمر تک بچے جو کچھ اپنی ماؤں کی ودیا گھریلو ماحول میں سیکھ لیتے ہیں ان کی چھاپ ساری زندگی رہتی ہے۔ اس لیے اس مرحلہ کو بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، ملنا جلنا، بولنا چالنا، پہننا اوڑھنا، بچے اس مدت میں سیکھتے ہیں۔ محبت، نفرت، خوف، بے خوفی، آزادی، پابندی، ہمدردی وتعاون، ایثار وقربانی، سردی گرمی، سختی نرمی، دکھ سکھ وغیرہ کا تجربہ واحساس اسی مرحلے میں ابھرتا ہے۔

جسمانی لحاظ سے بھی یہ مرحلہ نہایت اہم ہے۔ پہلے دوسرے سال میں بعض ایسی جسمانی خامیاں پیدا ہوسکتی ہیں جن کی تلافی زندگی بھر ممکن نہیں ہے۔ خصوصاً دیکھنے سننے اور بولنے وغیرہ کی قوتوں میں مختلف نقائص جو نہ صرف جسم کو متاثر کرتے ہیں بلکہ ذہنی ارتقا پر بھی بہت برا اثر ڈالتے ہیں۔

اس مرحلے میں بالیدگی کی رفتار بھی بہت تیز ہوتی ہے۔ خصوصاً شیر خوارگی کے دور سے ساڑھے چار سال کی عمر تک تو بچے کا قد اتنا ہو جاتا ہے کہ جوان ہونے پر وہ زیادہ سے زیادہ جتنا لمبا ہوگا، ٹھیک اس کی آدھی لمبائی کو پہنچ جاتا ہے۔

خصوصیات:

اس مرحلے کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں:

ا۔ ذہنی وجسمانی حیثیت سے بچہ بہت ہی کمزور اور ہر کام میں بڑوں کا محتاج ہوتا ہے۔ خاص کر بھوک اور خطرے کے موقع پر بڑوں کی مدد کا بہت زیادہ طالب ہوتا ہے۔ ابتدائی دو ڈھائی سال تو شیر خوارگی میں گزرتے ہیں اور ماں کی گود ہی سب سے بڑا سہارا ہوتی ہے۔ بعد میں بھی بچہ ماں اور گھریلو ماحول ہی سے زیادہ مانوس ہوتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بچے کی

پرورش کے لیے جس محبت وشفقت، ہمدردی ودلسوزی، ایثار اور لگن کی ضرورت ہے وہ ماں اور خاندان کے دیگر افراد کے سوا بچے کو اور کہیں حاصل ہو بھی نہیں سکتی۔ جو بچے اس مرحلے میں کسی وجہ سے گھر کی شفقت ومحبت اور ناز برداری سے محروم ہو جاتے ہیں وہ لطیف انسانی جذبات سے بھی یکسر محروم ہی رہ جاتے ہیں۔ اس لیے بچے کی تعلیم وتربیت کے لیے گھریلو ماحول ہی کو بہتر بنانا چاہیے اور جب تک انتہائی مجبوری نہ ہو، یہ ذمہ داری نرسری اسکولوں (اطفال کے بدارس) پر نہ ڈالنی چاہیے چھوٹے بچوں کے معلمین ومعلمات کو اس کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ وہ شفقت ومحبت میں والدین کے مناسب بدل ثابت ہوں اور مدرسے کا ماحول، نیز درجے کی فضا ایسی بنانی چاہیے کہ گھر کے مقابلے میں اجنبیت نہ محسوس ہو۔ بعض لوگ بچوں کو باقاعدہ لکھنا پڑھنا شروع کرانے میں بڑی جلدی کرتے ہیں۔ یہ صحت اور ذہنی ارتقا دونوں کے حق میں مضر ہے۔ پانچ چھ سال کی عمر سے پہلے ایسا ہرگز نہ کیا جائے۔

۲۔ غیر مشروط اور بلا شرکت غیرے محبت کے بھوکے ہوتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ ان کی ذات سے محبت کی جائے نہ کہ ان کی صفات سے، اور تنہا ان سے محبت کی جائے۔ اسی لیے بہن بھائیوں یا گھر کے دوسرے بچوں سے رقابت کا جذبہ ابھرنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ بچوں کی ذات سے محبت کی جائے تاکہ ان کا اعتماد بحال رہے اور تمام بچوں سے یکساں محبت کی جائے۔ کسی بچے کو یہ محسوس نہ ہونے پائے کہ اسے نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ خصوصاً نئے بچے کی آمد پر تاکہ رقابت نہ پیدا ہو سکے۔

۳۔ طبعاً آزاد اور ہنگامہ پسند ہوتا ہے۔ جذبات میں بڑی شدت ہوتی ہے لیکن شدت کے ساتھ تلون بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ بآسانی اور بہت جلد بہل بھی جاتا ہے۔ معمولی بات پر زور سے چلانے اور زمین پر لوٹنے لگنا اور بہلانے والا ہو تو روتے روتے ہنس دینا اور بھیگے گالوں پر مسکراہٹ کھیل جانا ہم سب کا آئے دن کا مشاہدہ ہے۔ سخت کنٹرول بچوں کی

نشو ونما اور بالیدگی کے لیے بھی سخت مضر ہے اور اخلاقی اعتبار سے ریا کاری ومنافقت کے جراثیم پیدا کرسکتا ہے۔ اس لیے ہنگامے اور بے ضابطگی کو حتی الامکان برداشت کیا جائے۔ جذبات میں شدت ہو تو محبت سے بہلانے کی کوشش کی جائے۔ ڈانٹنا پھٹکارنا یا مارنا پیٹنا صحیح نہیں ہے۔ حکمت سے کام لیا جائے تو بآسانی بہل سکتے ہیں۔

۴۔ جبلتوں اور جذبات کا تابع ہوتا ہے اور ان کے تقاضوں کی فوری تکمیل چاہتا ہے، اگر تکمیل میں رکاوٹ ہو تو انتہائی پریشان ہوتا اور ضد کرتا ہے۔ حال میں مست رہتا ہے۔ مستقبل کی قطعاً کوئی فکر نہیں ہوتی۔ حیاتیاتی نقطہ نظر سے اس کے لیے یہی درست بھی ہے۔ اس لیے ان خصوصیات کی رعایت رکھی جائے۔ جبلتوں اور جذبات پر قابو پانے کی رفتہ رفتہ مشق کرائی جائے۔ تجربات کے ساتھ تفکر اور قوت ارادی میں بتدریج اضافہ ہوتا جائے گا اور جب تک یہ نہیں ہو جاتا، قابو پانا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اس ضمن میں جلدی نہ کی جائے۔

۵۔ بہت زیادہ چلبلا اور کھیل کا رسیا ہوتا ہے۔ کھانا، کھیلنا، سونا اور رونا یہی اس کے اہم کام ہوتے ہیں۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ بناتا بگاڑتا رہتا ہے۔ کھلونوں سے الگ کھیلنا پسند کرتا ہے۔ مل جل کر صرف ایسے کھیل کھیلتا ہے جن میں مقابلے کی نوبت نہ آئے۔ مسابقتی کھیلوں سے گھبراتا ہے۔ مبادا شکست کا منہ دیکھنا پڑے۔ کھیل کے طریقے بتا کر نیز طرح طرح کے خوش رنگ کھلونے فراہم کر کے کھیلنے کے مواقع دیے جائیں اور جو کچھ سکھانا ہو حتی الامکان کھیل کھیل میں سکھایا جائے۔

۶۔ اپنی ہی ذات سے محبت اس لیے بظاہر بہت خود غرض معلوم ہوتا ہے یہ حیاتیاتی تقاضا ہے اور بچے کی نشو ونما کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس پر ملامت نہ کی جائے اور نہ بہت زیادہ ایثار اور اونچے کردار کی توقع رکھی جائے۔ بڑوں کو چاہیے کہ وہ اپنے میں سے بھی اسے مزید حصہ دیں اور وہ بہت سی چیزوں میں سے اگر تھوڑا سا بھی دوسروں کو دے دے تو شاباشی دیں اور دل کھول کر سراہیں۔ اسی طرح وہ بتدریج ایثار کرنا سیکھے گا۔

۷۔ طرح طرح کے سوالات اور بہت زیادہ باتیں کرنے کا شوقین ہوتا ہے اس پر بچوں کو جھڑکنا نہیں چاہیے۔ سوالات کرنا صحت مند دماغ کی علامت ہے باتوں باتوں میں وہ بہت کچھ سیکھنے اور اپنی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں ان کے سوالات کے تشفی بخش جواب دیئے جائیں اور بات چیت کرنے اور کچھ پوچھنے پر اکسایا جائے۔

۸۔ مختلف قسم کی حرکات، آواز اور آہنگ کی غیر شعوری تقلید کرتا اور کھیلوں میں ان کی نقل اتارتا ہے۔ دوسروں کو جیسا کرتے دیکھتا ہے بے سوچے سمجھے ویسا ہی کرنے لگتا ہے، بری بھلی جو آوازیں کان میں پڑتی ہیں وہی اس کی زبان پر چڑھ جاتی ہیں۔ اس لیے بڑوں کو چاہیے کہ بچوں کے سامنے اچھا اسوہ پیش کریں اور ماحول کو پاکیزہ رکھیں۔ نقل کے کھیلوں کے ذریعے کھانے پینے، ملنے جلنے وغیرہ کے آداب سکھائیں۔ زبان کی صحت اور تلفظ مخارج کی اصلاح کے ضمن میں نقالی کے اس رجحان سے فائدہ اٹھایا جائے لیکن یہ سب کام زبانی یا عملی ہو، لکھنے پڑھنے یا قرأت کے قواعد وضوابط سکھانے کا بار ہرگز نہ ڈالا جائے۔ پرندوں اور جانوروں کی بولیوں کی نقل اتارنے کا بھی موقع دیا جائے، بچوں کو بڑی مسرت ہوتی ہے البتہ کسی کے عیب کی نقل اتارنے سے روکا جائے۔

۹۔ ناواقفیت اور ناتجربہ کاری کی بنا پر چونکہ ممکن و ناممکن میں فرق کر نہیں سکتا اس لیے قوت متخیلہ اپنے شباب پر ہوتی ہے۔ بھوت، پریت، جن، پری، دیوی، دیوتا، جانور، پرندے وغیرہ کی عجیب وغریب کہانیوں کو وہ بالکل سچ سمجھتا ہے اور فوراً یقین کر لیتا ہے۔ اس لیے ایسے قصے جن سے توہم پرستی کا شکار ہونے کا اندیشہ ہو اس عمر میں بچوں کو ہرگز نہ سنائے جائیں۔ انبیاء علیہم السلام کی کہانیوں میں سے خاص طور پر معجزات بتانے اور جانوروں کی کہانیوں کے ذریعے اخلاقی وذہنی تربیت کرنے نیز زبان سکھانے میں اس وقت سے مدد لی جائے۔

۱۰۔ شوخ رنگ، تیز آواز، غیر معمولی حرکت اور میٹھی چیزوں کا بہت زیادہ دلدادہ ہوتا ہے اور ان کی طرف بے اختیار کھنچتا ہے۔ اپنی بساط کے مطابق رنگین متحرک اور بجنے والے مٹی، لکڑی

اور پلاسٹک وغیرہ کے کھلونے فراہم کئے جائیں۔ استعمال کی اشیاء میں بھی رنگ کی شوخی وغیرہ کی رعایت رکھی جائے۔ چیزوں کا قیمتی یا لطیف ہونا ضروری نہیں صرف شوخ رنگ مطلوب ہے۔ اگر اس مرحلے میں بچے کی ان خواہشات کی رعایت نہ کی جائے یا تکمیل میں رکاوٹ ڈالی جائے تو ذہنی گتھیاں پڑتی ہیں جو بڑے ہونے پر سیرت وکردار کے لیے خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی رنگوں وغیرہ کے معاملے میں بچگانہ ذوق بعد میں بھی برقرار رہتا ہے کیونکہ اس مرحلے میں اس کی تسکین کا سامان نہیں ہو پاتا کہ خواہشات میں ارتقا ہو چنانچہ جسم میں بالیدگی کے باوجود ذہن کا ارتقا رک جاتا ہے اور جب تک بچگانہ خواہشات کی تکمیل نہیں ہو جاتی آگے نہیں بڑھتا۔

۱۱۔ گردو پیش کی عام اشیاء کو غور سے دیکھنے چھونے، برتنے اور ان کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا شوق اور تجسس ہوتا ہے۔ بچے کو تجربے اور مشاہدے کے کافی مواقع ملنے چاہئیں۔ قریبی ماحول کے پھل، ترکاریاں، درخت، پودے، جانور، پرندے، کیڑے مکوڑے وغیرہ کے دیکھنے اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے کبھی کبھی ساتھ ٹہلانے لے جانا چاہیے اور قابل مشاہدہ پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا چاہیے۔ البتہ حواس خمسہ کی صحت کے بارے میں اطمینان کر لینا چاہیے تاکہ اشیاء کا ادراک صحیح ہو۔

۱۲۔ تعمیریت کی جبلت برسرکار ہوتی ہے اور وہ کچھ بناتے بگاڑتے رہتے ہیں۔ مگر بنانے بگاڑنے میں بہت کم فرق کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک چیز کی ہیئت بدل دینا تعمیر ہے خواہ بنے یا بگڑے۔ مٹی، ردی کاغذ، خالی ڈبے، لکڑی کے ٹکڑے آسان اور سستے تعلیمی کھلونے وغیرہ فراہم کر کے انہیں بنانے، جوڑنے، ترتیب دینے وغیرہ میں مہارت حاصل کرنے کے مواقع دیئے جائیں۔ اس طرح وہ ہاتھ آنکھ اور دماغ کے مابین تعلق قائم کرنے اور تینوں سے بیک وقت کام لینے کی مشق کرتے ہیں۔

۱۳۔ ''نوادرات'' جمع کر کے جیب میں بھرنے کا شوق ہوتا ہے مگر نوادرات کے معاملے میں

ذوق بہت گھٹیا اور پست ہوتا ہے۔ چار پانچ سال کے بچے کی جیب کا کبھی جائزہ لیجئے۔ اس میں کاغذ کے ٹکڑے، ٹھیکرے، املی یا پھلوں کے بیج، شیشے اور چینی مٹی کے برتنوں کے ٹوٹے ہوئے خوش رنگ ٹکڑے وغیرہ ملیں گے۔ ذخیرہ اندوزی اور ملکیت کا شوق فطری ہے۔ اسے کچلنا نہیں چاہیے۔ بچے کو تھوڑی سی محفوظ جگہ ملنی چاہیے جہاں وہ اپنی پسند کی چیزیں ترتیب سے لگا سکے۔ اس طرح وہ رفتہ رفتہ خوش ذوقی کا بھی ثبوت دے گا اور چیزوں کو ترتیب سے رکھنا اور سجانا بھی سیکھے گا۔ جیب میں تو اس لیے بھرتا ہے کہ رکھنے کی مناسب اور محفوظ جگہ نہیں پاتا۔

۱۴۔ اجنبیوں سے ملنے میں جھجکتا ہے۔ بمشکل بے تکلف ہوتا ہے اور دوست بنانے میں بھی بہت سست رفتاری کا ثبوت دیتا ہے۔ اگر اس کے نجی معاملات پر گفتگو کی جائے۔ اس کے کھلونوں، چیزوں وغیرہ کی تعریف کی جائے، اس کو کھانے، کھیلنے کی چیزیں دی جائیں یا اس کے کھیل میں شرکت کی جائے تو رفتہ رفتہ بے تکلف ہوتا ہے پھر خوب باتیں کرتا اور اپنا دکھ درد، الجھنیں اور پریشانیاں بیان کرتا ہے۔

۱۵۔ جو کچھ سنتا یا سیکھتا ہے اسے بار بار دہرانے کی کوشش کرتا ہے اس لیے کہانیاں سنانے، کوئی واقعہ بتانے یا کچھ سکھانے کے بعد اعادے کے کافی مواقع دیئے جائیں اس طرح مشق کا موقع ملتا ہے۔ ایسی کہانیوں میں بڑا لطف لیتا ہے جن میں جملوں کی تکرار ہوتی ہے یا ایک شگفتہ جملہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بار بار دہرایا جاتا ہے۔

۱۶۔ ذخیرۂ الفاظ کی کمی اور اظہار خیال پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے اپنی خواہشات وضروریات یا تکالیف کو بتا نہیں سکتا۔ اس لیے اس کے اشارات کو سمجھئے اور اس کی ضروریات، علالت یا تکالیف کا خود اندازہ لگانے کی کوشش کیجئے اور اس کی جسمانی خرابیوں، امراض اور ذہنی الجھنوں کا جائزہ لیتے اور ان کے ازالے کی فکر کرتے رہیے۔

۱۷۔ اپنے بعض کاموں میں وہ دخل اندازی پسند نہیں کرتا، بلکہ خود انجام دینا چاہتا ہے۔ مثلاً

کپڑے یا جوتے پہننے کی کوشش، خود منہ ہاتھ دھونے، کھانے یا آب دست لینے کا شوق وغیرہ، یہ بہت مفید رجحان ہے، ایسا کرنے کا حتی الامکان موقع دیجئے اور دخل دینے کے بجائے حسب ضرورت صحیح طریقے سے انجام دینے کا ڈھنگ بتا دیجئے تا کہ وہ رفتہ رفتہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے اور ہر کام میں بڑوں کا محتاج نہ رہے۔ اعضا پر قابو، اور گرفت مضبوط نہ ہونے کی وجہ سے کوئی چیز پکڑتا یا اٹھاتا ہے تو ہاتھ سے چھوٹ جاتی یا گر کر ٹوٹ جاتی ہے اس میں اس کی مرضی یا ارادے کو دخل نہیں ہوتا۔ اس لیے ملامت کرنا اور ڈانٹنا پھٹکارنا نہ چاہیے ورنہ خود اعتمادی ختم ہو جائے گی۔ اس طرح کے حادثہ پر بچہ خود شرمندہ ہوتا ہے اور اگر بہت کمسن ہے تو خود اس چیز کو قصوروار ٹھہراتا ہے جو منہ تک پہنچے یا ہاتھ میں رہنے کے بجائے گر جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر ڈھارس بندھانی چاہیے تا کہ خود اعتمادی پیدا ہو۔

۱۸۔ نمایاں ہونے، محبوب بننے اور سب کی توجہ اپنی طرف کھینچنے کا بہت شوقین ہوتا ہے۔ اگر مناسب طریقے سے نمایاں ہونے کا موقع نہ ملے تو بعض نازیبا حرکات کر کے بھی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی کوشش کرے گا مثلاً چیخ چلا اور شور مچا کر یا بستر پر، کھڑے، بے جگہ پیشاب پاخانہ کر کے، چھوٹے بھائی بہنوں کو ستا کر۔ اس لیے اسے مناسب طریقے سے نمایاں ہونے کے مواقع دیجئے۔ دوسروں کے سامنے اس کے محاسن کی تعریف کیجئے اور اسے کچھ یاد ہو تو سنوائیے۔

۱۹۔ اندھیرے سے ڈرتا اور خوفناک آواز سے چونک پڑتا ہے۔ گر پڑنے کا بھی خوف ہوتا ہے۔ بچوں کو ڈرانا نہیں چاہیے اور نہ خود ان کے سامنے خوف کا مظاہرہ کرنا چاہیے کیونکہ جن چیزوں سے آپ ڈریں گے۔ بچے بھی آپ کی دیکھا دیکھی ان سے ڈرنے لگیں گے۔

۲۔ بچپن (۶ تا ۹ سال)

بچے کا یہ مرحلہ بھی جسمانی بڑھاؤ اور بالیدگی کا ہوتا ہے۔ اگر چہ رفتار اتنی تیز نہیں ہوتی جتنی

شیر خوارگی کے دور میں ہوتی ہے۔ اب بچے کی دنیا گھر کی چہار دیواری تک محدود نہیں رہتی بلکہ وہ گھر سے باہر نکلتا اور نئے نئے دوست بنانے لگتا ہے۔ ذہنی وجسمانی حیثیت سے کسی حد تک اپنی مدد آپ کرنے پر قادر ہو جاتا ہے اور ہر معاملے میں بڑوں کا دست نگر نہیں رہتا۔ آب دست لے سکتا ہے، ازار بند باندھ سکتا ہے۔ باتیں سمجھ سکتا اور اپنی ضروریات بتا سکتا ہے، ہم جولی ملیں اور دلچسپ مشاغل ہوں تو گھنٹوں والدین سے دور رہ سکتا ہے۔ اس لیے مدرسے میں داخل کر کے باقاعدہ تدریس شروع کرا دینی چاہیے۔

اس مرحلے کی چند نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں۔ تعلیم میں ان کا لحاظ ضروری ہے۔

۱۔ چلبلے پن میں اضافہ، بھاگ دوڑ، اچھل کود میں روز افزوں دلچسپی، محلے، پڑوس اور مدرسے میں ساتھی بنانے اور ان کے ساتھ مل کر کھیلنے کا شوق بڑھنے لگتا ہے۔ گھر نیز گھر کے افراد سے دلچسپی کچھ کم ہونے لگتی ہے۔ ہم جولیوں کی نظروں میں مقام حاصل کرنے کی فکر ہوتی ہے۔ یہ سب رجحانات مفید ہیں۔ ان کی نشو ونما کے مواقع دیئے جائیں اور ان امور پر روک ٹوک کرنے اور بہت زیادہ پابندیاں عائد کرنے سے گریز کیا جائے۔ ہم جولیوں کے ساتھ کھیلنے کودنے اور شور وغل کرنے میں بچوں کو جو حقیقی مسرت محسوس ہوتی ہے اس سے محروم کر دینے سے بچوں کی شخصیت کے مختلف پہلو متاثر ہوتے ہیں۔ البتہ ہم جولیوں پر نظر رکھنی چاہیے۔ انہیں کبھی کبھی گھر بلا کر ان کی تواضع کا موقع دینا چاہیے۔ اس سے بچے کا وقار بڑھتا ہے اور ساتھیوں پر بھی اچھا اثر پڑتا ہے۔

۲۔ تجسس اور گرد وپیش کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے شوق میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ بچے کی دنیا اب وسیع ہونے لگتی ہے۔ اس لیے اس کے تجربے اور مشاہدے کا میدان بھی پھیل جاتا ہے۔ وہ معلومات حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے سوالات کرتا اور بہت زیادہ بولتا ہے۔ بچوں کو کبھی کبھی پکنک یا تعلیمی سیر وسیاحت پر لے جا کر قریبی ماحول کی اشیاء کا بغور مشاہدہ کرانا نیز تجربات کا موقع دینا چاہیے۔ ان کے سوالات سے تشفی

بخش جوابات دے کر انہیں مطمئن کرنے اور مزید سوالات پوچھنے پر اکسانا چاہیے۔ کبھی کبھی اپنی طرف سے مسائل رکھ کر انہیں حل کرنے کی دعوت دینی چاہیے۔

۳۔ کھیل میں بتدریج نظم پیدا ہونے لگتا ہے اور قواعد وضوابط کی پابندی کی ضرورت کا احساس بھی بڑھنے لگتا ہے۔ چنانچہ مل جل کر کھیلنے کی اہمیت کے پیش نظر اپنی خواہش کے خلاف طرح طرح کی پابندیاں برداشت کرنے پر وہ آمادہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً باری کا لحاظ، داؤں دینا، جو پارٹ مل جائے وہی ادا کرنا وغیرہ۔ اس رجحان سے معاشرتی زندگی میں ضوابط کی پابندی اور آداب معاشرت کا لحاظ کرانے، نیز پسندیدہ عادات ڈلوانے میں مدد لینی چاہیے۔

۴۔ گھر اور مدرسے کی وفاداری کا جذبہ ابھرتا ہے۔ دونوں کو اپنا سمجھتا اور ان کا فرد ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری کا احساس رکھتا ہے۔ اپنے مدرسے یا گھر کی برائی اور شکایت سن نہیں سکتا۔ اپنے والدین اور کلاس ٹیچر کا دل سے احترام کرتا ہے اور ان کی توہین برداشت نہیں کرتا۔ دونوں جگہ بچوں کو اپنایت محسوس کرنے کے پورے مواقع دیئے جائیں اور کچھ ہلکی پھلکی ذمہ داریاں بھی سونپی جائیں۔ اس طرح احساس ذمہ داری بھی ابھرے گا اور تعاون وانہماک کی تربیت بھی ہوگی۔ تقریبات اور مہمانوں کی آمد وغیرہ پر بچے کے سپرد کوئی نہ کوئی کام ضرور ہونا چاہیے۔

۵۔ قوت حافظہ میں باقاعدگی پیدا ہونے لگتی ہے۔ بہت کچھ بے سمجھے بوجھے بھی رٹ سکتا ہے۔ لیکن اب سادہ مفہوم سمجھا دیا جائے تو یاد کرنے میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے اس لیے جو کچھ یاد کرانا ہو اس کا مقصد اور مفہوم بھی سمجھا دیا جائے۔ سورتیں، اذکار ودعائیں، نظمیں، پہاڑے وغیرہ بتدریج زیادہ سے زیادہ یاد کرائے جائیں۔ اس وقت کا یاد کیا ہوا زندگی بھر نہیں بھولتا۔

۶۔ اپنے جسم، لباس اور استعمال کی دیگر اشیاء کی طرف سے لاپرواہ ہوتا ہے۔ سامان رکھنے کے

لیے بکس، الماری وغیرہ کوئی جگہ متعین کر دی جائے جس پر بچے کا پورا تسلط ہو اور رفتہ رفتہ اسے اپنا سامان ترتیب، حفاظت اور باقاعدگی سے رکھنے کا عادی بنایا جائے۔ استعمال کے بعد چیزیں بچے عموماً اِدھر اُدھر ڈال دیتے ہیں اور پھر جب دوبارہ استعمال کی ضرورت ہوتی ہے تو پریشان ہوتے ہیں۔ بڑوں کو چاہیے کہ اِدھر اُدھر پڑی ہوئی چیزیں ان کی مقررہ جگہ پر رکھ دیں تا کہ عین موقع پر انہیں مل سکیں۔ خصوصاً لکھنے پڑھنے کی اشیاء ورنہ بہت حرج ہوتا ہے۔ اس کے عمر کے بچوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنی تمام چیزوں کی خود دیکھ بھال اور حفاظت کر سکیں گے قبل از وقت ہے۔ ضرورت پر وہ روئیں گے یا ابا اماں سے پوچھیں گے۔

۷۔ تقلید میں اب کسی حد تک شعور کو دخل ہونے لگتا ہے۔ پھر بھی بیشتر تقلید غیر شعوری ہوتی ہے۔ اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، ملنے جلنے وغیرہ کے طریقے اور مختلف مواقع کے آداب نقل کے کھیلوں کے ذریعے سکھائے جائیں۔ خوشخطی، تلفظ، ماڈل وغیرہ کی نقل اتروائی جائے۔ گھر اور مدرسے کا ماحول پاکیزہ بنانے کی پوری کوشش کی جائے اور اچھا اسوہ پیش کیا جائے تاکہ غیر شعوری تقلید کے لیے بچوں کو اچھے نمونے مل سکیں۔

۸۔ تخیل عملی شکل اختیار کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ممکن و ناممکن میں کچھ فرق محسوس ہونے لگتا ہے۔ عجیب وغریب قصے کہانیوں میں لطف تو لیتا ہے لیکن اب وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ غلط ہیں۔ تخیل کو عملی جامہ پہنانے کے لیے گندھی ہوئی مٹی، سلیٹ یا کالی تختی، رنگین چاک، رنگ، برش، معمولی کاغذ وغیرہ فراہم کرنا چاہیے۔

۹۔ تعمیری کاموں کے ذریعے مہارت حاصل کرنے کی خواہش ابھرتی ہے۔ اور وہ اکثر کچھ نہ کچھ بناتا بگاڑتا رہتا ہے۔ تعمیری مشاغل مثلاً آرٹ کرافٹ، مٹی کا کام، باغبانی وغیرہ کا موقع دے کر مہارت حاصل کرائی جائے۔ سامان کے مناسب استعمال کے سلسلے میں رہنمائی اور مدد کی جائے تا کہ تعمیری صلاحیتیں ابھریں اور مہارت پیدا ہو۔ خصوصی میلانات

کا جائزہ بھی لیتے رہنا چاہیے۔ اگرچہ اس عمر میں جن چیزوں کی طرف رجحان رہتا ہے ضروری نہیں کہ وہ بعد کے مراحل میں بھی برقرار رہے۔

۱۰۔ مسابقت کا جذبہ اور ساتھیوں میں نمایاں ہونے کا داعیہ ابھرتا ہے۔ اب رفتہ رفتہ مقابلے کے کھیلوں میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ مگر ناکامی سے اب بھی گھبراتا ہے۔ اس لیے آسانی سے ہار نہیں مانتا۔ اور کبھی کبھی بے ایمانی کر بیٹھتا ہے۔ کھیل اور کام میں مسابقت کے مواقع دیئے جائیں لیکن ناکامی کا شدید احساس اور مدمقابل سے نفرت نہ پیدا ہونے پائے۔ تیز کھیل کود میں ایمانداری کو ہار جیت پر مقدم رکھنے کی اسپرٹ پیدا کی جائے۔ ہار جیت کو بچے کھیل کے معمول میں شمار کرنے لگیں، نہ ہار جانے پر مایوس ہوں اور نہ جیت جانے پر مدمقابل کو چڑائیں اور ذلیل کریں۔

۱۱۔ ذخیرہ اندوزی کی جبلت بھی زوروں پر ہوتی ہے، مدرسے کے عجائب خانے کے لیے بچوں سے پھول پتیاں، چڑیوں کے پر، گھونگے، سیپ، مختلف ممالک کے ٹکٹ وغیرہ جمع کرائے جائیں اور انہیں ترتیب اور سلیقے سے رکھوایا جائے۔

۱۲۔ توجہ جلد جلد بھٹکتی رہتی ہے چنانچہ وہ کسی ایک چیز پر زیادہ دیر تک جم نہیں سکتا۔ اس لیے کسی ایک چیز یا مسئلہ پر زیادہ دیر تک متوجہ رکھنے کی کوشش بے کار ہوگی۔ اس کی بہتر شکل یہ ہوگی کہ اس چیز کے مختلف پہلوؤں پر توجہ دلائی جائے مثلاً کسی پھول کی طرف متوجہ کرنا ہے تو اس کی شکل، رنگ، خوشبو، حصے وغیرہ پر الگ الگ بات چیت ہو تو بحیثیت مجموعی پھول ہی پر دیر تک متوجہ رہ سکتے ہیں ورنہ ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد توجہ ہٹ جائے گی۔

۱۳۔ کسی کوتاہی یا غلطی پر تنقید کرنا، کسی عیب پر چڑانا، بلاوجہ چھیڑنا، کسی حرکت کی نقل اتارنا اور مزے لینا یہ سب باتیں بھی اس مرحلے میں شروع ہو جاتی ہیں۔ اس میں بڑے چھوٹے یا ہم جولی اور ہم جماعت کی قید نہیں رہتی۔ غلط بات یا غلط برتاؤ پر اگر تنقید کریں تو خندہ پیشانی سے سن لینا چاہیے البتہ چڑانے یا چھیڑنے سے جو تکلیف ہوتی ہے اس کا احساس دلا کر باز

رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے، مگر اس پر سختی کے بجائے سمجھانا بجھانا زیادہ مفید ہوتا ہے۔ چڑنے پر اور چڑ اتا ہے۔

۱۴۔ براہ راست اخلاقی درس، پند ونصائح اور واعظانہ انداز کی باتوں میں نہ تو دلچسپی لیتا اور نہ اثر قبول کرتا ہے۔ آداب معاشرت کا لحاظ، اخلاقی ضوابط اور نماز کی پابندی کرانے کا سب سے مؤثر طریقہ بڑوں کا اچھا اسوہ ہے جس کی غیر شعوری طور پر بچہ تقلید کرتا ہے۔ نیز تاریخی واقعات، اخلاقی کہانیوں، جانوروں کی کہانیوں کی مدد سے پسندیدہ تصورات پیدا کرائے جائیں۔ بچے کہانی کے ہیرو کی جگہ اپنے کو رکھ کر کہانی سنتے ہیں۔ اس لیے ویسا ہی بننا چاہتے ہیں۔ اخلاقی درس کا یہ سب سے موثر طریقہ ہے لیکن کہانی کے آخر میں خواہ مخواہ نتیجہ نکال کر بچوں پر تھوپنا سارا مزہ کرکرا کر دیتا ہے۔ اور بسا اوقات مخالفانہ جذبہ پیدا کرتا ہے اس لیے کہانی سنا دینے پر اکتفا کریں، نتیجہ نکال کر نصیحت نہ کریں، غیر محسوس طور پر وہ خود متاثر ہوں گے۔

۱۵۔ مدرسے پہنچنے اور نئے نئے ساتھیوں سے سابقہ پیش آنے کے بعد بچے کو ایک تلخ تجربہ اپنی چیزوں کے چرائے جانے کا ہوتا ہے۔ گھر پر وہ اپنی چیزیں ادھر ادھر ڈال دیتا تھا پھر بھی محفوظ رہتی تھیں۔ وہاں ایسا کرے تو چیزیں ضائع ہو جاتی ہیں چنانچہ اپنے سامان کے بارے میں دوسروں پر سے اس کا اعتماد اٹھ جاتا ہے اور ہر ایک کو وہ شک وشبہ کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ مدرسے میں فضا ایسی بنانی چاہیے کہ بچے بغیر پوچھے ایک دوسرے کی چیزیں نہ لیں اور بچوں کے اعتماد کو ٹھیس نہ لگے ورنہ یہی چیز آگے چل کر ساری دنیا سے بدگمان بنا دیتی ہے۔

۱۶۔ اندھیرے سے ڈر تو کسی حد تک کم ہونے لگتا ہے لیکن اب بھی بہت سی خیالی باتوں سے ڈرتے ہیں۔ سوتے وقت ڈراؤنے قصے کہانیاں ہرگز نہ سنائی جائیں۔ بچوں کا ڈر چھڑانے کی پوری کوشش کی جائے۔ ورنہ اگر خوف برقرار رہا تو بزدلی پیدا ہوگی۔

۳۔ لڑکپن (نو دس سال سے بارہ تیرہ سال تک)

بچے کا یہ دور استحکام، پائیداری اور کارکردگی کا دور کہلاتا ہے کیونکہ بالیدگی کی رفتار سابقہ مرحلے کے مقابلے میں بہت سست ہو جاتی ہے اور اب تک ذہنی و جسمانی حیثیت سے جتنا کچھ بڑھ چکا ہوتا ہے اس میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔

بالیدگی کے زمانے میں بچہ جلد جلد تھکتا اور اکثر بیمار ہو جاتا تھا۔ لیکن اب وہ کافی محنت کر سکتا ہے۔ اس لیے ذہنی و جسمانی دونوں طرح کے کام بخوبی لیے جاسکتے ہیں۔ محنت سے پڑھنے لکھنے کے لیے دراصل یہ مرحلہ بہت ہی موزوں ہے۔

اس مرحلے کی اہم خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ شوروغل، تیزی وطراری، چلبلاپن اور مستعدی وچالاکی میں نمایاں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے مختلف قسم کے مفید مشاغل اور دلچسپ مصروفیات میں لگائے رکھنا چاہیے۔ ورنہ یہ ساری قوتیں شرارت کی طرف لگ جاتی ہیں۔ انہیں بہر حال ہر وقت کچھ نہ کچھ کام ملنا چاہیے۔ کام نہیں ہوگا تو لامحالہ شیطانی کریں گے۔

۲۔ قوت حافظہ اپنے شباب پر ہوتی ہے۔ دس گیارہ سال کی عمر میں لڑکیوں کا اور بارہ تیرہ سال کی عمر میں لڑکوں کا دماغ اپنے پورے سائز اور پیدائش کے وقت سے چار گنا ہو جاتا ہے۔ یادداشت بہت بڑھ جاتی ہے مگر سمجھ کر یاد کرنے کا رجحان غالب ہوتا ہے اس لیے جو کچھ یاد کرانا ہو اس کی افادیت اور مفہوم ضرور ذہن نشین کرا دیا جائے۔ کلام پاک، اذکار، دعائیں، چٹکلے، مقولے، کہاوتیں، اشعار وغیرہ زیادہ سے زیادہ یاد کرائے جائیں۔

۳۔ تلفظ، طرز ادا وغیرہ میں دوسروں کی نقل اتارنے کا شوق ہوتا ہے۔ اس لیے الفاظ کا تلفظ، اتار چڑھاؤ کے ساتھ نثر و نظم پڑھنے یا تقریر کرنے کی مشق بہم پہنچائی جائے۔ غیر زبان مثلاً عربی، ہندی، انگریزی، قرأت وغیرہ اس مرحلہ کے اوائل ہی میں ضرور شروع کرا دیں۔

البتہ قواعد اور کتب کا بار زیادہ نہ ڈالیں بلکہ زیادہ تر کام زبانی یا عملی ہو۔

۴۔ تجسس کی فراوانی اور گرد و پیش کی اشیاء نیز سماجی وفطری ماحول کا غائر مشاہدہ کر کے معلومات کو وسعت دینے کی فطری تحریک ہوتی ہے اس کے انہیں مواقع ملنے چاہئیں۔ عام سائنس جغرافیہ اور سماجی علوم کے سلسلے میں تعلیمی سیر وسیاحت پر لے جانا اور مختلف چیزوں کا تجربہ ومشاہدہ کرانا چاہیے۔ مشاہدے کے نتائج کو مضمون کی شکل میں قلم بند کرایا جائے یا ان اشیاء کی شکلیں اور ماڈل بنوائے جائیں۔ تدریس میں اپنے بیان کو واضح کرنے کے لیے گرد وپیش کی اشیاء اور سماجی وفطری ماحول کا زیادہ سے زیادہ حوالہ دیا جائے۔ بسا اوقات تجسس غلط رخ اختیار کرنے لگتا ہے اور وہ لغو اور خراب باتوں یا لوگوں کی نجی زندگیوں کی ٹوہ میں پڑ جاتے ہیں۔ ایسی باتوں سے بچایا جائے۔

۵۔ مختلف ذہنی قوتوں مثلاً تفکر، استدلال اور تخیل میں کسی حد تک باقاعدگی شروع ہو جاتی ہے۔ تجربات کی وجہ سے ممکن وناممکن میں بچہ فرق کرنے لگتا ہے۔ بھوت، پریت، جن وپری اور دیومالائی قصے کہانیوں کو مہمل اور لغو باور کرا کے توہم پرستی سے بچایا اور ڈر چھڑایا جا سکتا ہے۔ عقائد کی اصلاح میں مدد لی جا سکتی ہے اور اس طرح کے قصے کہانیوں کے سننے یا ان کے مطالعہ میں دلچسپی لینے سے باز رکھ کر مفید مطالعہ پر لگانا آسان ہوتا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

۶۔ اصل چیزوں یا ان کے ماڈلوں کے بجائے ان کی تصویروں اور خاکوں کی مدد سے بات سمجھ لینے اور صحیح تصورات قائم کر لینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جغرافیہ، تاریخ اور معلومات عامہ وغیرہ میں تصاویر اٹلس اور خاکوں وغیرہ سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ بچوں کے اخبارات، ورسائل سے اب وہ بخوبی استفادہ کر سکتا ہے اس کا موقع ملنا چاہیے تاکہ معلومات میں وسعت ہو۔

۷۔ خود بھی مہمات سر کرنے، نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے یا ڈھونڈ نکالنے کا خواہش مند ہوتا ہے اور

مہماتی قصے کہانیوں اور روایات میں بھی دلچسپی لینے لگتا ہے۔ البتہ ایسی کہانیاں زیادہ پسند آتی ہیں جن میں ہیرو کو غیر معمولی مشکلات سے دوچار ہونا پڑے لیکن بالآخرہ کامیابی سے ہمکنار ہو۔ سیاحوں کے سفرناموں اور موجدین ومکتشفین کی کوششوں سے متعارف کرانے کا بہترین دور ہے۔ ان میں وہ لطف بھی لے گا اور اس طرح کے کارنامے انجام دینے کا اس کے دل میں شوق بھی پیدا ہوگا۔ لیکن جن کہانیوں میں ہیرو کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑے وہ بچوں پر رنج اور مایوسی طاری کرتی ہیں۔ اس لیے حتی الامکان ان سے گریز کریں اور اگر سنانا یا پڑھانا ہی پڑے تو ناکامی میں بھی کامیابی کا پہلو نمایاں کیا جائے۔

۸۔ تقلید سے زیادہ تحقیق وایجاد کا دلدادہ ہوتا ہے۔ اس لیے کھیل اور کام میں ذمہ داریاں اور پارٹ خود سوچنے یا انجام دینے کا طریقہ خود بتا دینے کے بجائے بچوں کو انتخاب کی حتی الامکان آزادی دی جائے اور تحقیق وایجاد کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ کبھی کبھی بچوں کو ایسی باتیں سوجھ جاتی ہیں جن کا ہم کو وہم وگمان بھی نہیں ہوتا دوسرے وہ رفتہ رفتہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بنتے ہیں اور اپنی پسند شامل ہونے کے باعث محنت اور انہماک سے کام کرتے ہیں۔

۹۔ اپنے اندرون اور گھر نیز مدرسے سے زیادہ بیرونی دنیا سے دلچسپی ہوتی ہے اگر اس کی دلچسپیوں کا لحاظ نہ رکھا جائے تو مدرسے سے بھاگنے اور گھر سے غائب رہنے کی عادت پڑتی ہے۔ مدرسے میں اس کی کوشش ہونی چاہیے کہ کبھی کبھی پکنک اور سیر وسیاحت کا موقع ملے اور جغرافیہ، سائنس نیز سماجی علوم کی تعلیم حتی الامکان موقع پر لے جا کر دی جائے۔ گھر کے افراد کو بھی چاہیے کہ دوست احباب سے ملنے ٹہلنے یا بازار جاتے وقت بچوں کو ساتھ لے لیا کریں تا کہ مناسب طریقے سے اس کی اس خواہش کی تسکین ہو جائے اور وہ بھگوڑے پن یا آوارہ گردی کا شکار نہ ہو۔

۱۰۔ گہرے غور وفکر اور مسائل سے نمٹنے کا شوق ابھرتا ہے۔ اس لیے بچوں کے سامنے مسائل

رکھ کران کے حل پر اکسانا چاہیے اور سب کچھ خود بتا دینے کے بجائے غور وفکر اور تجربہ ومشاہدہ کر کے معلومات حاصل کرنے کا بچوں کو موقع دینا چاہیے۔

۱۱۔ گھر اور مدرسے کا ماحول اگر اچھا ہو، لوگ برائیوں سے بچتے اور بھلائیوں کو اپناتے ہوں، ایک دوسرے سے محبت اور ہمدردی سے پیش آتے ہوں تو بچے میں بھی برائی بھلائی کی تمیز اور محبت وہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ بھی بھلائیوں کو اپنانے اور برائیوں سے بچنے لگتا ہے۔ اپنے محسنوں اور ساتھیوں سے محبت اور کمزوروں معذوروں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنے لگتا ہے۔ جن باتوں کو بڑے اہمیت دیتے ہیں ان کو وہ بھی اہمیت دینے لگتا ہے۔ مثلاً نماز روزہ خیر خیرات وغیرہ۔ لیکن ماحول اگر ان اوصاف سے خالی ہو تو بچے سے اس مرحلے میں ان اوصاف کی توقع فضول ہے۔ اس لیے گھر اور مدرسے کا ماحول اور بڑوں کا اسوہ بہر حال سازگار اور مناسب ہونا چاہیے۔

۱۲۔ خیالات وتصورات اور دلچسپیوں میں استقلال کے بجائے تغیر پذیری ہوتی ہے۔ آج خیالات وتصورات کچھ ہیں کل کچھ، آج کسی چیز مضمون یا کام میں دلچسپی ہے تو کل کسی دوسرے میں، اس لیے مختلف مشاغل ومصروفیات کے مواقع فراہم کر کے مناسب وموزوں کے انتخاب میں رہنمائی وامداد کرنی چاہیے، پسندیدہ عادات واطوار ڈلوانے کے بعد مطمئن نہ ہو جانا چاہیے بلکہ فکر رکھنی چاہیے کہ خلاف ورزی کے مواقع نہ ملیں، ورنہ کئے دھرے پر پانی پھر سکتا ہے۔

۱۳۔ سات آٹھ سال تک بچے عموماً انہی چیزوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ جن کی طرف ان کا میلان فطری طور پر ہوتا ہے لیکن اب وہ ان چیزوں میں بھی دلچسپی لینے لگتے ہیں جن سے ہم جولیوں میں نمایاں ہو سکیں، بڑوں کی خوشی اور شاباشی حاصل کر سکیں اور ان کی ناخوشی سے بچ سکیں۔ فرائض کی پابندی، آداب کے لحاظ اور پسندیدہ عادات واطوار ڈلوانے میں اس رجحان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ بلند آواز سے نظمیں پڑھنے، مہماتی قصے کہانیاں پڑھنے،

درجے میں کامیاب ہونے کے لیے محنت کرنے، اپنا خط ٹھیک کرنے کے لیے مسلسل مشق کرنے، اسٹیج پر کامیابی کے ساتھ اپنا پارٹ ادا کرنے کے لیے تقریر وغیرہ محنت سے تیار کرنے کے لیے وہ آمادہ رہتا ہے۔ حکمت کے ساتھ اس سے محنت لینی چاہیے۔ بعض لوگ بچوں پر بار بار خفا ہوتے اور ڈرا دھمکا کر کام لینا چاہتے ہیں۔ اس کا بہت زیادہ استعمال بچوں کو بے غیرت اور آپ کی خوشی و ناخوشی کی طرف سے لاپرواہ بنا دے گا اس لیے ڈرانے دھمکانے کا حربہ کم سے کم استعمال کیا جائے۔

۱۴۔ گروہی جبلت بڑی شدت کے ساتھ برسر کار ہوتی ہے۔ ٹولیاں بنا کر گلی کوچوں، کھیتوں، میدانوں میں پھرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ بچہ ٹولی کے قواعدہ ضوابط کا بے حد احترام اور ان کی سختی سے پابندی کرتا ہے۔ اپنی ٹولی میں نمایاں ہونے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ صحبت اچھی ہو تو بچے اس طرح مل جل کر رہنے، قواعد وضوابط کی پابندی کرنے، ٹولی کے سربراہ کی اطاعت کرنے، ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرنے نیز تعاون و ہمدردی کا برتاؤ کرنے کا طریقہ سیکھ لیتے ہیں ورنہ ٹولیاں بنا کر ہنگامہ کرنے اور دوسری ٹولیوں سے ٹکر لینے کی کوشش کرنے لگتے ہیں اور اپنی ٹولی یا اس کے لیڈر کو خوش رکھنے کے لیے نازیبا حرکات کرنے لگتے ہیں اور گھر یا مدرسے کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بچوں کی گروہی جبلت اور اپنی ٹولی میں نمایاں ہونے کی خواہش کی تسکین کے لیے کھیلنے کودنے نیز درجے اور مدرسے کی مختلف ذمہ داریوں کو انجام دینے کے لیے طلبہ کو مختلف ٹولیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہر ٹولی کا الگ الگ سربراہ کار ہو مثلاً مانیٹر، کھیل کا کپتان، اجتماعات، پکنک، دارالمطالعہ وغیرہ کے انچارج یا مختلف انتظامی و مسابقتی ٹولیوں کے افراد کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالنے کے مواقع دیئے جائیں، مسابقت کو غلط رخ پر پڑنے اور گروہی جبلت کو تعصب وتحزب (پارٹی بندی) کی شکل اختیار کرنے سے بچایا جائے۔ ٹولیوں کے افراد یا سربراہ کار کی حیثیت سے کام اور کھیل کے کافی مواقع

ملیں تو تربیت بھی ہوگی اور اس جبلت کی تسکین بھی اور وہ بری صحبت سے محفوظ بھی رہیں گے۔ کسی کو ٹولی کا سربراہ کار ماننے یا کسی کو دوست یا ہمجولی بنانے وغیرہ میں اس مرحلے کے بچوں کو اونچ نیچ امیر غریب وغیرہ کا بالکل خیال نہیں ہوتا صرف صلاحیت پیش نظر ہوتی ہے۔ مساوات کے اس جذبہ کو پروان چڑھانا چاہیے۔

۱۵۔ سادگی، لاپروائی اور بے باکی نمایاں ہوتی ہے۔ ان امور پر زیادہ روک ٹوک کے بجائے سمجھا بجھا کر صفائی ستھرائی، سامان کی حفاظت وغیرہ کی بتدریج عادت ڈلوائی جائے، یہ اوصاف بھی بہرحال اگر حدود میں ہوں تو ضروری ہیں۔

۱۶۔ آوارہ گردی، تعلیم سے بھاگنے، ڈینگ مارنے، گھر سے غائب رہنے، بیڑی سگریٹ پینے، چیزیں چرانے، جھوٹ بولنے، گالی بکنے، دھوکا دینے اور تجسس میں آ کر بعض ناپسندیدہ حرکات کرنے کے بہت اندیشے ہوتے ہیں۔ ان سب خامیوں کے پیدا ہونے میں بہت کچھ دخل بری صحبت یا بچے کے ساتھ ناروا سلوک کو ہوتا ہے، حتی الامکان بری صحبت سے بچانے اور ان کے ساتھ شفقت ومحبت کا برتاؤ کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔ البتہ بری صحبت سے بچانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم جولیوں ہی سے محروم کر دیا جائے یا جائز حدود میں ان کی دلچسپیوں کا انتظام نہ کیا جائے۔ یہ رویہ بھی خطرناک ثابت ہوتا ہے اور ان کی شخصیت کی ہم آہنگ تربیت نہیں ہو پاتی۔ اس دور کی ذہنی گتھیاں شخصیت پر دور رس اثرات ڈالتی ہیں اس لیے بڑی احتیاط سے تربیت ہونی چاہیے۔ جائز خواہشات کو کچل دینا ذہنی گتھیوں کا موجب ہوتا ہے۔

۴۔ عنفوان شباب: (تیرہ چودہ سال سے سترہ اٹھارہ سال کی عمر تک)

یہ زندگی کا موسم بہار ہے۔ اس مرحلے میں معصوم کلی چٹک کر شگفتہ پھول بنتی ہے۔ قد تیزی سے بڑھتا اور سرعت کے ساتھ ذہنی وجسمانی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ دیکھتے دیکھتے ایک دبلا پتلا

کا، توانا وتندرست مرد اور ایک چھریرے بدن کی لڑکی معزز خاتون نظر آنے لگتی ہے۔ لاابالی پن اور بے پروائی رخصت ہو جاتی ہے۔ اور ان کی جگہ رکھ رکھاؤ اور بناؤ سنگار لے لیتے ہیں۔ شکل صورت، رفتار گفتار ہر چیز میں بڑا پن اور نمایاں فرق محسوس ہونے لگتا ہے۔ رنگ و روپ میں نکھار آجاتا ہے۔ چہرے پر ہمہ وقت مسکراہٹ کھیلنے لگتی ہے۔ عضو عضو میں تناؤ اور غیر معمولی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ جامہ زیبی کا یہ عالم ہوتا جاتا ہے کہ معمولی لباس بھی اطلس و کمخواب سے زیادہ پھبنے لگتا ہے۔ طبیعت میں کیف و مستی اور آنکھوں میں خمار آجاتا ہے۔ سادہ پانی میں بھی مئے رنگین کا لطف آنے لگتا ہے۔ نئی زندگی، نئی امنگیں، نئے احباب اور نئے عہد و پیمان شروع ہو جاتے ہیں۔ غرض ہر طرف بہار اور شگفتگی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ یہ ہے عنفوان شباب کی ایک ہلکی سی جھلک۔

اس دور کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱۔ عمر کا نازک ترین دور، جنسی جذبات میں شدت اور جنسی جبلت برسرکار ہوتی ہے، ناتجربہ کاری اور ناعاقبت اندیشی کے باعث جسمانی اور اخلاقی حیثیت سے بہت خطرناک نتائج سے دوچار ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے غیر معمولی توجہ دینے اور ان کے عادات واطوار پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ البتہ اپنے برتاؤ اور رویہ سے ایسا محسوس نہ ہونے دیا جائے کہ شک وشبہ اور تجسس کی نظر سے دیکھا جارہا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی صحت کی فکر کی جائے۔ جنسی جبلت قدرت کا نہایت اہم اور زبردست عطیہ ہے۔ اسے کچلنے کی کوشش دراصل فطرت سے جنگ اور شخصیت کے لیے انتہائی مضر ہے۔ مردانگی کے اس جوہر کی حفاظت کرنے، جذبات پر قابو پانے اور اس جبلت کے جائز رخ اختیار کرنے میں معاون ہونا چاہیے۔ دلچسپ تعمیری مشاغل و مصروفیات، مسابقت کے کھیل اور فنون لطیفہ کے جائز اصناف میں عملی حصہ لینے کے مواقع فراہم کیے جائیں تو اس جبلت کی تسکین بھی ہوتی اور فنی مہارت بھی حاصل ہوتی ہے۔

۲۔ حیا اور شرمیلے پن کی فراوانی ہوتی ہے۔ اور سماج کا غیر معمولی پاس ولحاظ رہتا ہے۔ نوعمروں

کے یہ وہ فطری ہتھیار ہیں جن سے وہ ناعاقبت اندیشی اور ناتجربہ کاری کے اس مرحلے میں اپنے چال چلن کی حفاظت کرتے ہیں۔ کردار کو بے داغ اور صحت کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ بے حد مفید اور ضروری ہیں۔ اس لیے ان جذبات واحساسات کو ہرگز مجروح نہ ہونے دیا جائے کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ اس عمر میں اگر شرم وحیا اٹھ جائے یا سماج کا پاس ولحاظ نہ رہ جائے تو نوعمر جو کچھ نہ کر گزریں کم ہے۔

۳۔ فرصت کے اوقات یا تنہائی میں عموماً گندے جنسی خیالات وجذبات ابھرتے ہیں اور شیطان مختلف قسم کے وساوس میں مبتلا کرتا ہے۔ "خانہ خالی را دیوی گیرند" کے لیے فرصت کے اوقات کے لیے دلچسپ مفید مشاغل ومصروفیات کا زیادہ سے زیادہ بندوبست ہونا چاہیے تاکہ وہ ہمہ وقت مصروف رہے۔ ذہنی وجسمانی ہلکے بھاری دونوں طرح کے مشاغل میں منہمک رہنے کے برابر مواقع ملتے رہنے چاہئیں۔

۴۔ خودرائی، خودمختاری، اپنے امور خود انجام دینے، اپنے معاملات پر خود غور وفکر اور فیصلہ کرنے کا شوق اور والدین نیز بڑوں کی مداخلت سے آزاد ہونے کا خیال ابھرتا ہے۔ جائز حدود میں انہیں آزادی ملنی چاہیے تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں، ہمیشہ اپنا محتاج نہ رکھا جائے جیسا کہ لاڈ پیار میں اکثر والدین کرتے ہیں۔ ان سے متعلق امور میں ان سے مشورہ کر لینا چاہیے اور روک ٹوک سے حتی الامکان گریز کرنا چاہیے ورنہ باغی بننے کا اندیشہ رہتا ہے۔ نرمی اور ملاطفت سے راستے پر لانے کی کوشش کی جائے۔

۵۔ خیالی پلاؤ پکانے، ہوائی قلعے تعمیر کرنے اور شیخ چلی جیسے منصوبے بنانے میں خاصا لطف آتا ہے۔ اس لیے دنیا کی حقیقتوں سے اکثر گریز کر کے جاسوسی ناولوں یا خدائی فوجدار جیسے قصے کہانیوں میں پناہ ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ حل طلب مسائل ومشکلات سے نبرد آزما ہونے کے مواقع دیئے جائیں۔ مختلف امور کی انجام دہی کے لیے انہی سے منصوبے بنوا کر عملی جامہ پہنانے پر اکسایا جائے تاکہ ممکن وناممکن میں فرق کرنا بھی سیکھیں اور رفتہ رفتہ حقیقت

پسندی پیدا ہو، ناکامی سے بچانے اور مسلسل جدوجہد کر کے کامیابی تک پہنچنے میں امداد ورہنمائی کی جائے تاکہ وہ دنیا کی تلخ حقیقتوں سے آنکھیں چار کرنے لگیں۔

٦۔ مہمات پسندی اور ٹولیوں میں سیر وسیاحت کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ تعلیمی سیر وسیاحت کے مواقع دیئے جائیں۔ سفر کے انتظامات وہ خود کریں۔ اسی طرح ٹولیوں میں تقسیم کر کے مختلف تقریبات میں ان سے کام لیے جائیں۔ خدمت خلق سے متعلق مختلف کاموں کے لیے بھی ان کی ٹولیاں بنا دی جائیں اور خوب کام لیا جائے، مقابلے کے کھیلوں میں حصہ لینے سے مہمات پسندی کے جذبے کو تسکین ہوتی ہے اور خدمت خلق سے شفقت ونگہبانی کے جذبات ابھرتے ہیں۔

٧۔ سابقہ دوستوں اور ساتھیوں کو بھول جاتے اور نئے قلبی اور جگری دوست بناتے ہیں۔ یہ دوستی نہایت گہری اور پائیدار ہوتی ہے۔ دل کے راز بھی ان دوستوں سے بیان کر دیتے ہیں۔ ان کی معیت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کرتے اور ان کی صحبت کا غیر معمولی اثر قبول کرتے ہیں۔ ظاہر ہے احباب اگر اچھے ہوئے تو بے حد مفید ورنہ حد درجہ مضر ہو سکتے ہیں لیکن دوستی کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ انتخاب میں بچے کے اپنے ارادے ہی کو دخل ہو سکتا ہے۔ بڑوں کی پسند سے دوست نہیں چنا کرتے۔ ایسی صورت میں انتخاب کی کسی نہ کسی حد تک آزادی ملنی چاہیے۔ البتہ کوشش اس کی ہو کہ ماحول اچھا ملے تاکہ احباب بھی اچھے مل سکیں۔ ان کے احباب کے عادات واطوار اور دلچسپیوں پر نظر رکھی جائے، ان کو کبھی کبھی گھر پر مدعو کرنے کا موقع دیا جائے، ان کی عزت کی جائے اور محبت وشفقت اور اچھے برتاؤ سے ان کو پسندیدہ مشاغل ومصروفیات میں دلچسپی لینے کے مواقع دیئے جائیں۔ ایسی صورت میں ان کی بھی اصلاح ہو گی اور بچہ بھی بری صحبت سے محفوظ رہے گا۔ زیادہ روک ٹوک مضر ہوتی ہے۔

٨۔ مثالی کردار اور شہرہ آفاق شخصیتوں سے لگاؤ اور ان کے اوصاف خصوصیات کو اپنانے کا شوق

ابھرتا ہے۔ اب تک وہ اپنے والدین اور اساتذہ وغیرہ ہی کو مثالی اور بہت اونچا سمجھتا رہا ہے لیکن اب اسے بعض پہلوؤں سے ان میں خامیاں نظر آنے لگتی ہیں اور وہ شہرۂ آفاق شخصیتوں کے کردار کو اپنے لیے مثالی بنانا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی جامع ومکمل شخصیت جس کا ہر پہلو مثالی اور جس کا اسوۂ حسنہ ہر ایک کے لیے قیامت تک قابل تقلید ہو، صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوے کی اتباع پر ابھارنے کی پوری کوشش ہونی چاہیے۔ اس طرف سے غفلت برتی گئی تو اندیشہ ہے کہ وہ ظالم وجابر لیڈر یا کسی فلمی اسٹار وغیرہ کو اپنا ہیرو بنالے گا۔

۹۔ ایک ایسے نصب العین (آدرش) کی ضرورت بھی شدت سے محسوس ہونے لگتی ہے جس کے لیے وہ اپنی زندگی وقف کر سکے۔ انسان کی زندگی کا واحد صحیح نصب العین تو یہی ہے کہ وہ اپنے خالق کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ وقف کر دے، خود بھی زندگی کے تمام شعبوں میں اس کی مرضی پر چلے اور سارے انسانوں کو اس کی مرضی پر چلانے کی جدوجہد کرے لیکن انسانوں نے اپنے لیے طرح طرح کے آدرش اور نصب العین گھڑ لیے ہیں اور خدا پرستی کی جگہ مادہ پرستی، نفس پرستی، وطن پرستی، قوم پرستی وغیرہ مختلف ''پرستیوں'' اور ''ازموں'' کے غلبے نے گردوپیش ایسی فضا بنا رکھی ہے کہ آدرش کے انتخاب میں بھٹکنے کے شدید اندیشے لگے رہتے ہیں اس لیے اسے نہایت حکمت، تدبیر اور محبت ودل سوزی کے ساتھ صحیح نصب العین کو اپنانے پر آمادہ کرنا چاہیے اور اس کی قوتوں صلاحیتوں اور فطری میلانات ورجحانات کا لحاظ رکھ کر اس نصب العین کے حصول کی جدوجہد میں مناسب رہنمائی کرنی چاہیے۔ اس نصب العین کی جس جہت سے وہ زیادہ بہتر خدمت انجام دے سکتا ہے اس جہت کی واضح نشاندہی ہونی چاہیے۔

۱۰۔ مذہبی جوش اور اس کے لیے ایثار وقربانی کا جذبہ اور اخلاقی قدروں کا پاس ولحاظ ہوتا ہے مگر اعتقادات کے ضمن میں اکثر شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں اور ان کے اسرار ومعارف

جاننے کی خواہش ہوتی ہے۔

مذہبی جوش کو اعتدال کے ساتھ پروان چڑھانا چاہیے اور جوش کے ساتھ ہوش کی بھی فکر ہونی چاہیے شکوک وشبہات پر برہمی کا ہرگز مظاہرہ نہ کیا جائے بلکہ ہمدردی کے ساتھ تشفی بخش جواب دیئے جائیں۔ دلائل سے مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے اور شریعت کے اسرار ورموز بتائے جائیں۔ اس عمر میں چونکہ جسم کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں۔ روح کے کچھ اور، معاشرتی واخلاقی قدروں کا کچھ اور تقاضا ہوتا ہے اور خواہشات نفسانی کا کچھ اور۔ دونوں کے تقاضوں میں تضاد پیدا ہونے کی وجہ سے وہ ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے اور شرعی احکام کی معقولیت پر شک وشبہ کرنے لگتا ہے۔ اگر دونوں کے تقاضوں میں تطبیق سمجھا دی جائے تو بآسانی مطمئن ہو سکتا ہے۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے جسم کے فطری تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتا کہ عیسائیت یا دیگر مذاہب کی طرح اس کی تعلیمات نوجوانوں کو خلاف فطرت محسوس ہوں۔

۱۱۔ مطالعہ کا غیر معمولی ذوق ہوتا ہے اور گھنٹوں مسلسل مطالعہ کرتا ہے۔ مشاہیر اور غیر معمولی کردار کے حاملین، صحابہ کرامؓ، مجددین، ائمہ، صلحائے امتؒ اور انقلابی شخصیتوں کے سوانح حیات اور کارناموں سے متعارف کرانے والی کتب اور پاکیزہ تاریخی ناولوں کے مطالعہ پر اکسایا جائے اور مناسب کتب فراہم کی جائیں۔

۱۲۔ بے لوث محبت کا شدید جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس جذبے کو خدمت خلق اور حق وانصاف سے محبت وغیرہ کی طرف منتقل کرنے کی کوشش کی جائے اور اس کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

۱۳۔ اندھی تقلید سے نفرت اور ہر بات پر آمنا وصدقنا کہنے سے گریز کرنے لگتا ہے۔ اس لیے حکم دینے میں احتیاط ملحوظ رکھی جائے۔ آمر اور ڈکٹیٹر بن کر حکم دینے کے بجائے مشیر بن کر رہنمائی کی جائے۔ آمادگی دیکھ کر حکم دیا جائے تاکہ خلاف ورزی کا اندیشہ نہ رہے۔

۱۴۔ روک ٹوک اور نکتہ چینی سے سخت برہمی اور بغاوت کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے کسی بھی کوتاہی پر کھلم کھلا ٹوکنے اور نکتہ چینی کرنے کے بجائے تنہائی میں نرمی اور دلسوزی سے سمجھانا چاہیے۔

۱۵۔ محبت کے معاملے میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بچپن پھر لوٹ آیا۔ اس مرحلے کی ابتدا میں تو اسے اپنی ہی ذات سے محبت ہوتی ہے، بناؤ سنگار کی طرف غیر معمولی توجہ رہتی ہے۔ پھر اپنے ہم جنسوں سے محبت، اگاؤ اور آخر میں جنس مخالف میں کشش، والہانہ محبت اور مکمل طور پر حوالگی اور سپردگی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ یہ فطری ہے، ان جذبات کو کچلنے کے بجائے اعتدال پر لانے اور صحیح رخ پر لگانے کی ضرورت ہے۔ بلوغ کے بعد شادی میں جلدی کرنی چاہیے۔

۱۶۔ سیرت و کردار میں مد و جزر اور غیر معمولی اتار چڑھاؤ محسوس ہوتا ہے۔ گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ، کبھی بہت زیادہ تندہی و توانائی کا ثبوت تو کبھی انتہائی کاہلی اور سستی کا مظاہرہ، کبھی بہت زیادہ پُر امید، کبھی حد سے زیادہ مایوس، نہ بڑوں میں گنجائش، نہ چھوٹوں میں سمائی، اکثر ذہنی انتشار کا شکار۔ لعنت ملامت کے بجائے ہمدردی و دل سوزی کا مستحق ہوتا ہے۔

۱۷۔ عمر کا سنہری دور، نئی امنگیں، نئے عزائم، مستقبل میں اپنے مقام کا تعین اور ترقی کرنے کا حوصلہ ابھرتا ہے۔ ان خصوصیات سے فائدہ اٹھانا چاہیے ان کے ذریعے اعلیٰ صفات پیدا کرنے اور ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہنچانے میں مدد و رہنمائی کرنی چاہیے ورنہ غلط رخ پر پڑ جانے سے بے حد نقصان پہنچ سکتا ہے۔

یہ ہیں مختلف مراحل اور ہر مرحلے کی خصوصیات، تعلیم و تربیت میں ان خصوصیات کا پورا لحاظ رکھنا چاہیے۔ بچہ جس مرحلے سے گزر رہا ہو اس مرحلے کی خصوصیات کا بغور مشاہدہ کیا جائے اور ان کے لیے جو مضامین، مشاغل یا مصروفیات فراہم کی جائیں ان میں ان خصوصیات کی پوری رعایت رکھی جائے اگر ان خصوصیات کو نظر انداز کیا گیا یا فطری تقاضوں کو کچلا گیا تو بچے کی شخصیت کی ہم آہنگ نشو و نما نہ ہو سکے گی اور اس کا نتیجہ بہر حال بھگتنا پڑے گا۔ محبت و شفقت، ہمدردی و دل سوزی کو شعار بنا کر ہی بچوں کی تربیت ہو سکتی ہے۔ ماحول کو پاکیزہ رکھنا اور اپنا اچھا اسوہ سامنے لانا ہی سب سے مفید حربہ ہے۔

☆☆☆

باب 11:

چند اہم جبلتیں

جبلتیں اور فطری داعیات یوں تو متعدد ہیں مگر تعلیم و تربیت کے نقطہ نظر سے مندرجہ ذیل چند بہت اہم ہیں۔ اس لیے ان کے بارے میں قدرے تفصیل سے بحث کی جاتی ہے۔

ا۔ تجسّس:

یعنی ٹوہ لگانے یا معلومات حاصل کرنے کی خواہش۔ یہ ایک نہایت ہی اہم جبلت اور تمام علوم کی ماں ہے۔ اسی کی بدولت انسان اپنے فطری اور سماجی ماحول سے بخوبی واقف ہوتا اور کھلی آنکھوں اور کھلے کانوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لائق بنتا ہے۔ شیر خوارگی ہی سے یہ جبلت اپنا کام شروع کر دیتی ہے۔ جو چیز بھی سامنے آتی ہے بچہ ہمہ تن سوالیہ جملہ کا نشان بن کر اسے دیکھتا ہے اور نظریں گاڑے مسلسل دیکھتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ چیز نظروں سے اوجھل ہو جائے۔ جب ذرا بولنے پر قدرت حاصل ہوتی ہے تو ہر نئی چیز کے بارے میں سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دیتا ہے۔ وہ کیا ہے؟ یہ کیا ہے؟ یہ کون ہے؟ وہ کیسا ہے؟ ایسا کیوں ہے؟ وغیرہ۔ اس طرح وہ اپنے گرد و پیش کی مختلف اشیاء کے بارے میں معلومات حاصل کر لیتا ہے۔ اس جبلت کے ساتھ حیرت و استعجاب کا جذبہ مل کر اس کی دلچسپی میں مزید اضافہ کر دیتا اور اسے تلاش و جستجو اور تحقیق و تفتیش پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔ اسی جبلت کے طفیل انسان کائنات کے رازہائے سربستہ سے واقف ہوا اور اس کی معلومات میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن یہی جبلت جب غلط رخ اختیار کر لیتی ہے تو بچہ فضول، مضر اور لایعنی باتوں یا افراد کی نجی زندگیوں کی ٹوہ میں پڑ کر اپنا وقت اور قوت ضائع کرنے لگتا ہے اور بعض بری عادتوں اور ناپسندیدہ حرکات و سکنات کا مرتکب محض اس لیے ہوتا ہے

کہ وہ ان کے نتائج وعواقب سے واقف ہونا چاہتا ہے۔

اس جبلت کے ضمن میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

☆ نئی معلومات بہم پہنچانے کے لیے اس جبلت کو ابھار دیا جائے تو بچے خود ہمہ تن متوجہ ہو کر پوری دلچسپی اور انہماک سے سبق میں حصہ لینے لگیں گے۔ اس لیے معلوماتی اسباق کی تدریس میں اس جبلت سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے۔ البتہ اس کا لحاظ رہے کہ نئی معلومات کو سابقہ سے مربوط کر کے نیز قابل فہم بنا کر پیش کیا جائے۔ کیونکہ چیز اگر بالکل ہی نامانوس یا نا قابل فہم ہو تو متوجہ نہ ہوں گے یا اس سے وحشت محسوس کریں گے۔

☆ بچوں کے سوالات کا تشفی بخش جواب دیا جائے اور بہت زیادہ سوالات کرنے پر انہیں جھڑکا نہ جائے۔ بعض لوگ اکتا کر بچوں کو جھڑک دیا کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں یہ جبلت رفتہ رفتہ کمزور یا مردہ ہو جاتی ہے۔ اسے ساری زندگی زندہ رکھنے کی کوشش کرنا چاہیے اور عمر، فہم اور دلچسپی کا لحاظ کر کے اس کی تسکین کے مناسب مواقع فراہم کرنے چاہئیں۔

☆ بچوں کو نکمی، غیر مفید یا مضر صحت واخلاق باتوں کی ٹوہ میں پڑنے سے بچایا جائے۔ سوالات قائم اور مواقع فراہم کر کے بچوں کو عام سائنس، تاریخ، جغرافیہ، ادب وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل کرنے یا تحقیق وتفتیش کی چاٹ لگانے کی فکر کی جائے۔

☆ تجسس کے تین مدارج ہوتے ہیں۔

(الف) جسمانی تجسس: بچہ جسم کے اعضاء اور گردوپیش کی اشیاء کو غور سے دیکھتا بھالتا، چھوتا ٹٹولتا، منہ میں ڈالتا اور ہاتھ میں لے کر ان کی شکل وصورت، رنگ، سائز، وزن، آواز، مزہ، سختی، نرمی، سردی، گرمی اور دیگر خواص کے بارے میں اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ جس بچے کا ماحول مالا مال اور مختلف النوع اشیاء سے جتنا زیادہ معمور ہوتا ہے اور اسے مشاہدے وتجربے کا جتنا زیادہ موقع ملتا ہے، اس کی معلومات بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہیں۔ اس لیے اس کا انتظام ہونا چاہیے۔

(ب) سماجی تجسّس: جن اشیاء یا واقعات ومناظر کو بچہ اپنے مشاہدہ وتجربے سے بخوبی سمجھ نہیں پاتا۔ان کے متعلق والدین، اساتذہ اور اپنے ہم جولیوں وغیرہ سے پوچھتا ہے۔ بچے کے سوالات صحت مند دماغ کی علامت ہوتے ہیں۔اس لیے ہمدردی سے اطمینان بخش جواب ملنا چاہیے۔

(ج) عقلی تجسّس: عنفوان شباب میں داخل ہونے پر اس کا اظہار ہوتا ہے۔بعض اہم مسائل، معاملات اور واقعات جن کے سمجھنے یا حل کرنے میں دوسروں سے مدد نہیں مل سکتی، بچہ ان کے متعلق خود گہرے غور وفکر سے کام لیتا ہے اور اپنی بساط کے مطابق توجیہہ یا حل تجویز کرتا ہے جو کم سنی یا ناتجربہ کاری کے باعث اکثر انتہائی بچگانہ ہوتے ہیں۔بچوں کی ان کوششوں کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے۔بلکہ صحیح طریقے سے غور وفکر کرنے میں مدد اور راہنمائی کرنی چاہیے۔

☆ گھر اور مدرسے میں تجسس کی تسکین کا مناسب بندوبست ہونا چاہیے اور اس میلان کو صحیح رخ پر ڈالنے کی کوشش کرنی چاہیے ورنہ یا تو یہ جبلت کمزور پڑ جائے گی یا اپنے اظہار اور تسکین کے لیے غلط رخ اختیار کرے گی جس کے نتیجے میں بچے گھر اور مدرسے سے غائب رہنے لگیں گے اور بری عادات اور ناپسندیدہ حرکات وسکنات کا شکار ہوں گے۔

۲۔ ذخیرہ اندوزی:

یعنی کچھ جمع کرنا۔یہ بھی ایک بنیادی خواہش اور نہایت اہم جبلت ہے۔اس کے ساتھ ملکیت کا جذبہ کارفرما رہتا ہے۔اسی کی بدولت انسان اپنے آڑے وقت کے لیے کچھ پس انداز کرتا اور محتاجی وگداگری سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتا ہے۔فلاحی اداروں کے قیام اور اجتماعی مفاد کے کاموں کے لیے فنڈ، نوادرات وغیرہ جمع کرتا ہے، عجائب خانے اور کتب خانے قائم کرتا ہے۔ احادیث، آثار اور اقوال کی جمع وترتیب، لغات اور حوالہ جاتی کتب کی تالیف وغیرہ بہت کچھ اس جبلت کی رہین منت ہے لیکن یہی جبلت غلط رخ اختیار کر کے افراد کو حرص وطمع، دھوکہ دہی، غبن،

چوری، راہزنی، احتکار اور اکتناز اور سرمایہ داری کی ان متعدد لعنتوں میں گرفتار کرتی ہے جس کے نتیجے میں اشتراکیت جیسی بڑی لعنت کے لیے زمین ہموار ہوتی ہے۔ اس جبلت کا اظہار اوائل عمری ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ ایک بچے کی جیب، بستے یا بکس کا جائزہ لے کر دیکھئے، پھلوں کے بیج، کاغذ کے ٹکڑے، خالی ڈبے اور نہ جانے کیا کیا چیزیں ملیں گی۔ یہ سب اسی جبلت کا کرشمہ ہے۔ اس پر تنبیہ کرنے یا ان نوادرات کو اٹھا کر پھینک دینے کے بجائے صحیح تربیت کے لیے مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا جائے۔

- ☆ چھوٹے بچوں کو اکسایا جائے کہ وہ مدرسے کے عجائب خانے اور درجہ کی آرائش کے لیے مختلف قسم کے بیج، پھول پتے، چڑیوں کے پر، شیشے اور پتھر کے ٹکڑے سیپ، گھونگھے، خالی ڈبے، ٹکٹ، نقشے، تصاویر، سکے وغیرہ جمع کریں اور تاریخ، جغرافیہ، عام معلومات اور آرٹ کرافٹ وغیرہ کی تعلیم میں ان سے مدد لی جائے۔ ان کے اکٹھا کئے ہوئے سامان کو ترتیب وسلیقہ سے سجانے کا اہتمام کیا جائے۔
- ☆ بڑے بچوں کو احادیث، اقوال، ضرب الامثال، پسندیدہ اشعار، اچھی کتابیں وغیرہ اکٹھا کرنے پر اکسایا جائے۔
- ☆ جیب خرچ اور عیدی وغیرہ میں سے کچھ پس انداز کرنے کی عادت ڈلوائی جائے۔ اور جب کچھ اکٹھا ہو جایا کرے تو کسی مفید اور مناسب کتاب یا سامان کے خریدنے یا کسی کی امداد کرنے پر صرف کرائی جائے۔
- ☆ نادار طلبہ کی امداد کے لیے فنڈ یا پرانی کتب کی فراہمی کی مہم میں حصہ لینے کے مواقع دیئے جائیں۔
- ☆ اپنی لغت کی کتاب اور منتخب اشعار کی بیاض تیار کرنے نیز مختصر کتب خانہ قائم کرنے پر بچوں کو اکسایا جائے۔ اس طرح یہ جبلت مردہ بھی نہیں ہوگی اور اظہار کے لیے صحیح رخ اختیار کرے گی۔

۳۔ تعمیریت:

دنیا میں جتنے تعمیراتی کام ہوئے یا ہو رہے ہیں وہ بیشتر اس جبلت کے رہین منت ہیں۔ جھونپڑیوں اور لکڑی پتھر کے اوزاروں سے لے کر عالی شان عمارتوں، بھاری مشینوں، ریل، جہاز کے کارخانوں تک سب اسی کے کرشمے ہیں لیکن یہی جبلت غلط رخ اختیار کر لیتی ہے تو بڑی تباہی بھی مچاتی ہے۔

عاد وثمود کی تعمیرات، اور منگولوں، تاتاریوں کی غارت گری سب کچھ اسی کا نتیجہ تھیں۔ اس جبلت کا اظہار بھی بچپن ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ بچوں کے سامنے جو چیز بھی آئے وہ ہاتھ لگانے کی کوشش کرتے ہیں نتیجہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ بگاڑتے بناتے رہتے ہیں۔ یہ ان کے لیے ہے بھی نہایت ضروری اس طرح وہ بآسانی بہت کچھ سیکھ لیتے ہیں۔ چونکہ بناؤ اور بگاڑ دونوں اسی جبلت کے دو رخ ہیں، ہر بناؤ کے ساتھ کچھ نہ کچھ بگاڑ بھی ہوتا ہی ہے اور بچے ان دونوں میں کوئی خاص فرق بھی نہیں کر پاتے۔ چیزوں کی ہیئت بدل دینے ہی کو تعمیر سمجھتے ہیں، نیز بناؤ کے مقابلے میں بگاڑ آسان ہوتا ہے۔ اس لیے بچے شروع بگاڑ ہی سے کرتے ہیں۔ دوسروں کے کھلونے یا گھروندے توڑ دینا، گھر کے سامان کی توڑ پھوڑ، بچپن کے معمولی مشاغل ہیں۔ اگر اسے اپنی بساط کے مطابق کچھ بنانے کا موقع ملے خواہ وہ مٹی کے کھلونے ہی کیوں نہ ہوں تو وہ محنت کی قدر سیکھتا ہے، اور چیزوں کو بگاڑنے کے بجائے ان کی حفاظت کرنے لگتا ہے۔

ابتدا ہی سے بچوں کی اس جبلت کو صحیح رخ پر ڈالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ورنہ تعمیر کے بجائے تخریب میں زیادہ لطف آنے لگے گا۔

اس ضمن میں مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہیں۔

☆ مدارس میں آرٹ کرافٹ، مٹی کے کام، باغبانی وغیرہ کا اہتمام کیا جائے اس سے بچوں کی اس جبلت کی تسکین بھی ہوگی۔ وہ محنت ومشقت کے عادی بھی ہوں گے اور ان کی تعمیری

صلاحیتیں ابھریں گی۔

☆ بچے اپنے ہاتھوں سے کچھ بنا کر بہت خوش ہوتے ہیں خواہ وہ دوسروں کی نظروں میں بہت ہی حقیر، بھدی اور ناقص ہی کیوں نہ ہوں۔ اپنی بنائی ہوئی چیزیں بہت محبوب ہوتی ہیں۔ وہ ان کو بہت حفاظت سے رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر دیکھنے والا ان کی بنائی ہوئی چیز کی تعریف کرے۔ اس لیے بچوں کو اس کے مواقع ملنے چاہئیں اور ان کی بنائی ہوئی چیزوں کا مذاق اڑانے کے بجائے حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ تنقید اگر کرنی ہی پڑے تو حوصلہ افزا اور تعمیری ہونی چاہیے تاکہ حوصلہ شکنی نہ ہو اور وہ اسے اور بہتر بنا سکیں۔

☆ بعض لوگ دھول مٹی، کیچڑ پانی میں کھیلنے اور گھر گھروندے وغیرہ بنانے سے بچوں کو روکتے ہیں تاکہ جسم اور لباس گندہ نہ ہونے پائے۔ اس طرح وہ بچوں کو ان حقیقی مسرتوں سے بھی محروم کرتے ہیں جو وہ ان تعمیری کھیلوں کے ذریعے حاصل کرتے ہیں اور ان فائدوں سے بھی انہیں محروم کر دیتے ہیں جو وہ اپنی محنت سے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ ان مصروفیات کے لیے بھی مواقع دیئے جائیں اور فراغت کے بعد جسم اور لباس کی صفائی کا بھی اہتمام کیا جائے۔ محض صفائی کی خاطر ان سرگرمیوں سے محروم نہ کیا جائے۔ بستر پر پیشاب کرنے اور اپنے پیشاب پاخانے سے کھیلنے کی عادت بھی اسی طرح چھڑائی جا سکتی ہے جو کبھی اس وجہ سے بھی پڑ جاتی ہے کہ کیچڑ مٹی سے بچے کھیلنے نہیں پاتے۔

☆ آج کل طرح طرح کے تعلیمی کھلونے ملتے ہیں جن میں لکڑی یا پلاسٹک وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں اور جن کو ترتیب دینے یا جوڑنے سے مختلف قسم کے ماڈل بن جاتے ہیں ان کی فراہمی کا بندوبست کیا جائے اور ان کے استعمال کے مواقع دیئے جائیں۔

☆ عنفوان شباب میں لڑکے لڑکیوں دونوں کے لیے جائز حدود میں مفید دلچسپ اور رنگین تعمیری مشاغل کا اہتمام کیا جائے۔ اس سے وہ فرصت کے اوقات میں مصروف رہیں گے

ان کے جذبات کی تسکین بھی ہوگی اور فنی مہارت بھی حاصل کرلیں گے۔

۴۔ خود ادعائی:

یعنی نمود ونمائش اور دوسروں کی نظروں میں بڑا بننے اور اپنے کو برتر ثابت کرنے کی خواہش: یہ بھی ایک بنیادی اور نہایت اہم جبلت ہے۔ دین وملت یا ملک وقوم کی سربلندی کے لیے کارہائے نمایاں انجام دلانے میں جہاں اس جبلت کا بہت زیادہ ہاتھ رہا ہے۔ وہیں بدترین شرارتیں اور غنڈہ گردیاں اور چھیلا پن اور ٹیڈی ازم بھی اس جبلت کے غلط رخ اختیار کرنے کے نتیجہ میں رونما ہوتی ہیں۔ اس جبلت کا اظہار بھی بچپن ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اپنی ذہنی وجسمانی صفات کا احساس ہونے کے بعد ہی سے بچہ دوسروں کی نظروں میں نمایاں ہونے کی کوشش کرتا ہے، وہ دوسروں کی تعریف اور شاباشی حاصل کرنے کے لیے اپنی بساط بھرپوری جدوجہد کرتا ہے اور اگر ہم جولیوں یا بڑوں کی نظروں میں اپنے اوصاف کی وجہ سے قابل تعریف قرار نہیں پاتا تو یا تو مایوسی اور احساس کمتری کا شکار ہوتا ہے یا پھر شرارتوں اور غلط کاموں کے ذریعے نمایاں ہونا چاہتا ہے۔ مثلاً دوسروں کو ستانا، شور مچانا، بیماری کا بہانہ کرنا وغیرہ۔ اس جبلت کی مناسب نشوونما کے لیے مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہیں۔

- بچوں کے اچھے کاموں پر شاباشی دی جائے اور دل کھول کر سراہا جائے۔
- گھر اور مدرسے میں بچوں کی عمر، صلاحیت اور میلان کے مطابق کچھ ایسی ذمہ داریاں سپرد کی جائیں جن میں انہیں نمایاں ہونے کا پورا موقع ملے مثلاً درجے کے مانیٹر، کھیل کے کپتان، جمعیۃ کے صدر سیکرٹری، اجتماعات کے ناظم وغیرہ کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع دیا جائے۔
- مدرسے میں مختلف مصروفیات ومشاغل کا اہتمام کیا جائے اور ان میں نمایاں کام کرنے والے بچوں کو شیلڈ، پوزیشن اور انعامات دینے یا ان کے ناموں کی فہرست نمایاں جگہ پر

آویزاں کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

☆ ہر فرد اپنے ہی طبقے اور اپنی ہی جماعت کے افراد میں نمایاں ہونے کی کوشش کرتا ہے۔اس لیے وہ ہم جولیوں کی صحبت سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے اور انہی کے خیالات و جذبات اور رائے کا لحاظ کر کے نمایاں ہونا چاہتا ہے۔اس لیے کوشش کی جائے کہ بچوں کو اچھی صحبت ملے۔جو بچے اپنے اوصاف کی بنا پر بڑوں کی نظروں میں نمایاں ہوتے ہیں اکثر وہ اپنے ہم جولیوں کے حسد اور بدخواہی کا شکار ہو جاتے ہیں اور طرح طرح سے پریشان کیے جاتے ہیں۔کوشش کی جائے کہ تمام بچوں کو ان کی صلاحیت اور میلان کے مطابق نمایاں ہونے کا موقع ملے تا کہ وہ نمایاں ہونے کے لیے غلط رویہ نہ اپنائیں اور نہ اچھے بچوں کو ستانے کے درپے ہوں۔

☆ عنفوان شباب میں داخل ہونے والے بچوں کو رفتہ رفتہ انبیائے کرامؑ وصلحائے امتؒ اور مشاہیر اسلام کی سیرتوں اور کارناموں کے ذریعے یہ بات ذہن نشین کرائی جائے کہ وہ خدا اور رسول ﷺ کی نظروں میں اچھا بننے کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیں۔اسی میں دونوں جہان کی فلاح ہے۔نمود ونمائش یا ریاکاری ان کے اجر کو بھی ضائع کر دے گی اور وہ دوسروں کے حسد و بدخواہی کا بھی شکار ہوں گے اور شاباشی نہ ملنے پر مایوس ہو جائیں گے۔

۵۔ خود تحقیری:

یہ خود ادعائی کی ضد ہے۔یعنی بڑوں کے سامنے اپنے کو کمتر اور حقیر سمجھنا اس جبلت کے ساتھ حوالگی وسپردگی، رضا جوئی اور اطاعت کا جذبہ کام کرتا ہے، یہ بھی نہایت اہم اور بنیادی جبلت ہے۔اسی کی بدولت ایک فرد اپنی انانیت، خود رائی، آزادروی اور اجڈ پن سے دست بردار ہو کر بڑوں کے سامنے ادب اور سلیقے سے رہتا ہے۔اجتماعی اور عائلی زندگی میں ذمہ داروں کی اطاعت وفرمانبرداری کرتا، بڑوں کا احترام ملحوظ رکھتا اور خدا کی خوشنودی، رسول ﷺ کی اطاعت اور اصول

پسندی وحق پرستی کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کرتا ہے۔لیکن یہی جبلت جب غلط رخ اختیار کر لیتی ہے تو تملق و چاپلوسی، مداہنت اور ہر ظالم و جابر اور زبردست کے آگے سر تسلیم ختم کر دینے پر آمادہ کر کے شخصیت کو بری طرح مجروح کرتی ہے یہاں تک کہ انسان کو حیوانات سے بدتر مقام پر پہنچا دیتی ہے۔گھر اور مدرسے میں نظم وضبط برقرار رکھنے کے لیے اساتذہ اور والدین کو چاہیے کہ وہ بچوں کو اس جبلت کو ابھار کر انہیں مختلف مواقع کے آداب کا لحاظ اور بڑوں کا احترام کرنا سکھائیں۔ لیکن اس کی احتیاط رکھیں کہ بچوں کی شخصیت وانفرادیت مجروح نہ ہونے پائے اور رفتہ رفتہ انہیں اس مقام پر لائیں کہ ادب واحترام ملحوظ رکھنے کے باوجود وہ خدا اور رسول ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی کر کے،کسی کی اطاعت کو صحیح نہ سمجھیں **لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق** بلکہ ساری اطاعتوں کو ان کے احکام کے تابع کر دیں۔بچوں کی اس جبلت سے فائدہ اٹھانے کے لیے۔

۱۔ بڑوں کو بہت زیادہ بے تکلفی سے گریز کرنا چاہیے۔

۲۔ ہر حال میں اصولوں کا پابند ہونا چاہیے اور چھوٹوں کے سامنے اپنے کو لیے دیئے رکھنا چاہیے۔

۳۔ بچوں کو رفتہ رفتہ یہ محسوس کرانا چاہیے کہ آپ جو کچھ کرانا چاہتے ہیں وہی خدا اور رسول ﷺ کے احکام کا تقاضہ ہے اور اسی میں ہم سب کی فلاح ہے۔

۴۔ جبر وتشدد یا اپنی زوردار شخصیت کے دباؤ کو اطاعت کرانے کے لیے بہت زیادہ استعمال کرنا بچوں کی شخصیت کو متاثر کر دیتا ہے اسی سے حتی الامکان گریز کرنا چاہیے۔

۶۔ جنگ جوئی یا جدلی جبلت:

یہ بھی ایک نہایت اہم جبلت ہے۔صحیح رخ اختیار کرتی ہے تو انسان کو مرد مجاہد،بطل جلیل اور شہید وغازی کے مقام پر پہنچا دیتی ہے۔غلط رخ اختیار کرتی ہے تو ظالم وجابر، ڈاکو اور رہزن بنا کر چھوڑتی ہے،مردانگی،شجاعت،اولوالعزمی،حق کی حمایت، باطل کی بیخ کنی،معروف کا قیام،منکر کا

استیصال، مظلوم کی پشت پناہی، ظالم کی سرکوبی، کشمکش حیات سے نبرد آزمائی اور عزت نفس کا تحفظ جیسے اعلیٰ اوصاف، جہاں اسی کی بدولت پروان چڑھتے ہیں، وہیں تنگ مزاجی، دل آزاری، چڑچڑاپن، ظلم وفساد، جبر وتشدد، قتل وخون ریزی، دھاندلی وبدعنوانی، بغض وعداوت، نفرت وحسد جیسی مذموم حرکات بھی اسی کی وجہ سے سرزد ہوتی ہیں۔ چونکہ بالعموم اس جبلت کا اظہار ناپسندیدہ طریقوں سے ہوتا ہے اس لیے لوگ بچوں کی اس جبلت کو صحیح رخ پر ڈالنے کے بجائے اسے کچلنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے نتیجے میں بچے کے اندر بزدلی، پست ہمتی، بے غیرتی، دوں حوصلگی، مایوسی اور کمزوری پرورش پاتی ہے۔ اس لیے نہایت احتیاط سے اسے پروان چڑھانا چاہیے۔

اس جبلت کے ساتھ غصہ واشتعال کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ ایک فرد کی شدید فطری خواہشات کی تکمیل یا اہم جبلی تقاضوں کی تسکین میں جب رکاوٹ پیدا ہوتی ہے یا اس کی جان مال یا عزت نفس پر حملہ ہوتا ہے تو وہ مشتعل ہو جاتا ہے اور اس رکاوٹ کو دور کرنے اور حملے کا دفاع کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ اس کے جسم کا ایک ایک عضو مضرت کو دفع کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور جب تک وہ مدمقابل کو پچھاڑ نہیں دیتا غصہ فرو نہیں ہوتا۔

اس جبلت کی تربیت کے ضمن میں مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہنے چاہئیں۔

☆ گھر اور مدرسے کی فضا ایسی بنائی جائے کہ باہم شفقت ومحبت، حسن ظن، میل جول، تعاون ویگانگت کے جذبات پروان چڑھیں، اشتعال انگیزی، طنز وتعریض، سوءظنی، بدمزگی، ڈانٹ پھٹکار، مار پیٹ، نام بگاڑنے، نقل اتارنے، ایک دوسرے کو چڑانے اور ستانے کے نتائج بد سے آگاہ کرتے ہوئے ان کی روک تھام کی جائے۔

☆ بچگانی حرکات پر زیادہ سے زیادہ عفو ودرگزر اور چشم پوشی سے کام لیا جائے اور بچوں کو اعتراف قصور اور غلطیوں پر جلد از جلد معافی مانگ لینے پر اکسایا جاتا رہے۔ اکثر اشتعال ونزاع کی نوبت اسی لیے آتی ہے کہ لوگ قصور کرنے پر بھی معافی کے خواستگار نہیں ہوتے اور خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بناتے ہیں۔ اگر بچپن سے اس کی عادت ہو تو نزاع کی

نوبت کم ہی آئے۔

☆ جب کسی پر اشتعال، غصہ یا خفگی کا موڈ طاری ہو تو افہام و تفہیم یا ڈانٹ پھٹکار کارگر ہونے کے بجائے عموماً شدید ردِ عمل کا موجب اور خطرناک نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ جب تک غصہ فرو نہ ہو اس سے گریز کیا جائے۔ البتہ اگر مشتعل کرنے والے کو فوراً ہتھیار ڈالنے اور معافی مانگنے پر آمادہ کر لیا جائے یا مزاحم قوت اور مضرت رساں چیز کو سامنے سے ہٹا دیا جائے تو غصہ جلد فرو ہو جاتا ہے۔ غصہ فرو ہونے کے بعد تلقین و تفہیم موثر ہوتی ہے۔

☆ کشتی، بنوٹ اور مقابلے و مسابقت کے کھیلوں کا انتظام کیا جائے تو اس جبلت کی تسکین کے مناسب مواقع ہاتھ آ جاتے ہیں۔ اس سے بچے مار پیٹ، دنگا فساد سے بھی محفوظ رہتے ہیں اور یہ جبلت مردہ بھی نہیں ہونے پاتی۔

☆ اگر دو بچے آپس میں لڑ پڑیں تو احتیاط سے مجرم کا پتہ لگایا جائے اور جس کی غلطی ہو اسے معافی مانگنے پر آمادہ کیا جائے۔

☆ جھگڑالو، شریر اور لڑاکا بچوں کو کمزوروں کا حلیف بنا دیا جائے اس طرح ان کی قوت حق کی حمایت اور کمزوروں کی پشت پناہی پر صرف ہونے لگے گی۔

☆ دھاندلی، بے ضابطگی، ظلم و عدوان، حق تلفی، عزت نفس پر حملے اور منکرات وغیرہ پر خود بھی ناپسندیدگی کا اظہار کیا جائے اور ان کے ازالے میں سرگرمی دکھائی جائے اور اگر بچے ان پر خفگی کا مظاہرہ کریں تو ملامت نہ کی جائے بلکہ پامردی سے ان کا مقابلہ کرنے اور استقلال سے ان کا ازالہ کرنے کی تدابیر بتائی جائیں۔

☆ اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں سے لڑنے اور ان پر قابو پانے نیز مختلف مضامین سے متعلق مشکل مسائل سے پنجہ آزمائی کرنے کے مواقع دیئے جائیں اور زندگی کی مشکلات کا پامردی سے مقابلہ کرنے کی تلقین کی جاتی رہے۔

☆ غصہ کی حالت میں پانی پی لینے، کھڑے ہوں تو بیٹھ جانے، بیٹھے ہوں تو لیٹ جانے،

اشتعال کے مقام سے ٹل جانے یا کسی محنت مشقت کے کام پر لگ جانے سے غصہ جلد فرو ہو جاتا ہے۔ان تدابیر پر عمل کیا جائے اور کرایا جائے۔

یہ ہیں چند جبلتیں اور جذبات۔ان کے علاوہ چند اہم فطری خواہشات اور بنیادی میلانات ہیں۔جو تعلیم وتربیت کے نقطہ نظر سے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں اور جو بچے کے عادات واطوار اور سیرت وکردار پر بہت دوررس اثرات ڈالتے ہیں۔مثلاً تقلید، ہمدردی، تکرار، کھیل وغیرہ۔

۷۔ نقالی یا تقلید:

یہ بہت ہی موثر اور فطری خواہش ہے۔چھوٹے بڑے سب تقلید کرتے ہیں۔چار پانچ سال کی عمر تک یہ خواہش اپنے شباب پر ہوتی ہے۔بچوں کا بیشتر وقت دوسروں کی نقالی میں گزرتا ہے وہ اپنے گردوپیش جو کچھ دیکھتے ہیں اس کی شعوری یا غیر شعوری تقلید کرتے ہیں۔اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، کھیلنا کودنا، بولنا بات چیت کرنا، سلوک برتاؤ، آداب سلیقے، مختلف فنون میں مہارت، جبلتوں اور جذبات کے اظہار کے طریقے، حتیٰ کہ ذوق ورجحان، مذہبی معتقدات اور اخلاقی ومعاشرتی وروحانی اقدار تک ہم اسی کے زیر اثر سیکھتے ہیں۔اوائل بچپن میں عقل وتجربہ اور برے بھلے کی تمیز نہ ہونے کے باعث بچے، مضر مفید اور غلط صحیح میں فرق نہیں کرسکتے۔چنانچہ وہ غیر شعوری طور پر متعدد ایسی باتیں سیکھ لیتے ہیں جو ان کے عادات واطوار کو گھناؤنا اور سیرت وکردار کو داغدار بنا کر رکھ دیتی ہیں۔اسی لیے ماحول کو پاکیزہ بنانے، بچوں کو بری صحبت سے بچانے، اچھے لوگوں کی صحبت میں پروان چڑھانے اور ان کے سامنے قابل تقلید نمونہ پیش کرنے پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ والدین اور اساتذہ کو چاہیے کہ وہ بچوں کے سامنے اچھا اسوہ پیش کریں تاکہ بچے پسندیدہ عادات واطوار کے مالک بنیں۔ورنہ اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو بچوں میں منتقل کرنے کے مجرم ہوں گے اور اس طرح ان کی خرابیوں کا وبال بھی اپنے سر لیں گے۔

تقلید اور دوسروں کی نقالی کو عموماً حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے حالانکہ ہر فرد اس کے لیے

مجبور ہے اور متعدد اوصاف اس کے اندر اسی کی وجہ سے نشو ونما پاتے ہیں۔ اسلام کا ورثہ ہمیں اسی کی بدولت نصیب ہوتا ہے۔ اسوۂ حسنہ اور مثالی کردار کی نقل اتار کر ہی ایک فرد اعلیٰ مقام حاصل کر سکتا ہے۔ جدت یا ایجاد بھی اسی وقت ممکن ہے جب تقلید کے ذریعے سابقہ ایجادات و معلومات پر عبور حاصل کر لیا جائے۔ البتہ تقلید جامد صحیح نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ عقل کو کام میں لا کر مفید، معقول اور مناسب کے انتخاب پر اکسانا چاہیے۔

تقلید کی تربیت کے ضمن میں مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہیں:

☆ گھر اور مدرسے کا ماحول پاکیزہ بنانے اور دونوں جگہ مہذب طور طریق کو رواج دینے کی پوری کوشش کی جائے تا کہ بچوں کو تقلید کے لیے اچھے نمونے ملیں۔

☆ ننھے بچوں کو ابتدا ہی سے کھیل کھیل میں اور محبت و پیار سے بتدریج پسندیدہ آداب وسلیقے اور طور طریقے سکھائے جائیں۔ اٹھنے بیٹھے کھانے پینے، ملنے جلنے بات چیت کرنے، صاف ستھرے رہنے، وقت کی پابندی کرنے وغیرہ کے ضمن میں شروع ہی سے دیکھ بھال رکھی جائے اور ضرورت ہو تو عملی نمونہ دے کر کرایا جائے۔

☆ معلم بلند خوانی، خوش خوانی، تقریر، تلفظ، خوشخطی اور آرٹ کرافٹ وغیرہ کے اچھے نمونے پیش کر کے بچوں کو ان کی تقلید پر ابھارتا رہے۔ تو تلے، ہکلے اٹک اٹک کر پڑھنے والے بچوں سے درجے کے سامنے نہ پڑھوایا جائے بلکہ ان پر انفرادی توجہ دی جائے۔

☆ تقلید میں ارتقا کو ملحوظ رکھا جائے تا کہ اپج ختم نہ ہو اور مناسب حد میں ردوبدل کی گنجائش دی جائے۔ مثلاً آرٹ کے کسی نمونے کی نقل میں رنگ سائز یا ترتیب میں اختلاف کا موقع دیا جائے۔

☆ غیر شعوری تقلید بہت زیادہ موثر ہوتی ہے خصوصاً ہم جولیوں اور اساتذہ کی۔ اس لیے بچوں کو بری صحبت سے بچانے اور اچھی صحبت اختیار کرنے کے مواقع دیئے جائیں۔ انہیں ایسے مدرسے یا معلمین کے حوالے کیا کیا جائے جو مختلف حیثیتوں سے مناسب ہوں ورنہ

بچے ہاتھ سے جاتے رہیں گے۔ سگریٹ نوشی، سینما بینی، بدچلنی وغیرہ جیسی مذموم عادتیں بری صحبت کے نتیجے میں پیدا ہو جاتی ہیں۔

۸۔ اعادہ وتکرار کی خواہش:

یہ بھی ایک فطری داعیہ ہے۔ اعادہ وتکرار میں بچوں کو بڑا مزہ آتا ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے یا سنتے ہیں اسے اپنی زبان یا عمل سے بار بار دہراتے ہیں۔ کوئی نقطہ یا جملہ کوئی مصرعہ یا گیت زبان پر چڑھ جائے پھر کیا ہے، مطلب سمجھ میں آئے یا نہ آئے بار بار ادا کریں گے، بری بھلی جس قسم کی حرکات بھی نظروں کے سامنے سرزد ہو گئی ہوں، اپنے کھیلوں میں ان کی بار بار نقل اتاریں گے۔ ایک ہی کھیل متعدد بار کھیلیں گے مگر کیا مجال جو اکتا جائیں، روزانہ اور مہینوں بلکہ برسوں تک کھیلتے رہیں گے۔ کچھ بنائیں گے اور مٹائیں گے۔ پھر بنائیں گے اور مٹائیں گے اور یہ سلسلہ لامتناہی برابر چلتا رہے گا۔ دادی اماں سے ایک ہی کہانی کئی بار سنیں گے اور کوئی کہانی اگر الٹی سیدھی یاد ہو گئی تو سب کو سناتے پھریں گے کسی کہانی میں اگر ایک ہی شگفتہ جملے کی وقفہ وقفہ کے بعد تکرار ہو تو پھر دیکھیے وہ جملہ آتے ہی باچھیں کھل جائیں گی اور اگر وہ جملہ ہر بار کچھ بڑھتا اور پھیلتا بھی جا رہا ہو پھر تو کچھ نہ پوچھیے۔ تکرار میں ندرت کی چاشنی لطف ومسرت کو دوبالا کر دیتی ہے۔

اعادہ اور تکرار میں بچوں کی غیر معمولی دلچسپی انہیں نئی باتیں سیکھنے اور ان پر عبور حاصل کرنے میں بہت زیادہ معاون ثابت ہوتی ہے۔ جو بات وہ بار بار دہراتے ہیں وہ بخوبی ذہن نشین اور اچھی طرح یاد ہو جاتی ہے۔ جس کام کو وہ کئی بار کرتے ہیں اس میں انہیں مشق ومہارت حاصل ہو جاتی ہے۔ اعادے اور تکرار ہی سے بہت سی باتیں عادات ومعمولات میں داخل ہو کر فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں اور پھر ان کے کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

بچے جو کچھ سیکھتے ہیں اعادہ وتکرار ہی سے سیکھتے ہیں۔ مختلف مضامین میں مشق ومہارت اس کی بدولت حاصل ہوتی ہے اور چونکہ اس میں بچوں کو لطف بھی آتا ہے اور وہ بڑوں کی طرح جلد

اکتاتے بھی نہیں اسی لیے مدرسے میں اعادہ وتکرار پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ ریاضی میں گنتیاں، پہاڑے اور گر زبانی یاد کرائے جاتے ہیں اور جو قاعدہ بھی بنایا جاتا ہے اس کی خوب مشق کرائی جاتی ہے تاکہ سوالات ٹھیک ٹھیک اور تیز رفتاری سے حل کیے جا سکیں۔ زبانوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کا بار بار اعادہ کرایا جاتا ہے تاکہ پڑھنے میں روانی آئے۔ الفاظ کا تلفظ ہجے اور املا اور نظموں کو روانی کے ساتھ پڑھنا اور زبانی یاد کرنا بار بار کی مشق ہی سے آتا ہے۔ خوش نویسی، آرٹ کرافٹ اور دستکاریوں میں صحت وصفائی، مختلف فنون میں مہارت، جغرافیہ میں مقامات کے نام یاد کرنا اور نقشہ کشی کی مشق، تاریخ میں مشاہیر کے نام اور واقعات کے سنین یاد کرنا۔ قرأت اور مخارج کی صحت، ناظرہ میں روانی، اذکار، دعائیں اور سورتوں کا یاد کرنا۔ یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب خوب تکرار اور اعادہ کا موقع ملے۔

اس ضمن میں مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہیں:

☆ چھوٹے بچے بے سمجھے بوجھے بھی بار بار دہراتے ہیں اور انہیں اس میں بھی لطف آتا ہے لیکن جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے اعادہ وتکرار میں لطف کم ہوتا جاتا ہے، بڑے بچے صرف انہی چیزوں کو دہرانے اور یاد کرنے میں لطف لیتے ہیں جن کا مقصد مفہوم اور افادیت ان کی سمجھ میں آجائے اس لیے یاد کرانے سے پہلے مقصد ومفہوم بخوبی سمجھا دیا جائے۔

☆ دس گیارہ سال کی عمر تک تو مشق واعادہ اور زبانی یاد کرنے پر زیادہ زور دیا جائے لیکن اونچی جماعتوں میں بتدریج رٹنے کا کام کم اور غور وفکر کا کام زیادہ ہونا چاہیے۔

☆ تکرار واعادہ میں اگر قدرے ندرت وتنوع کی چاشنی ملا دی جایا کرے تو لطف دوبالا ہو جائے۔ بہت زیادہ یکسانیت سے اکتاہٹ اور بیزاری کا اندیشہ رہتا ہے۔

☆ نادانی میں بچے بہت سی ناپسندیدہ حرکات اور ناشائستہ کلمات وغیرہ کا اعادہ کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح بعض بری عادتوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ازالے کی بروقت فکر ہونی چاہیے۔ اور ماحول کو لغویات سے پاک رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

۹۔ کھیل:

بچے کھیل کے رسیا ہوتے ہیں۔ جی جان سے لگ لپٹ کر کھیلتے ہیں۔ کھیل سے زیادہ شاید دنیا کی کوئی چیز انہیں محبوب نہیں۔ کھیل میں ان کا انہماک دیکھئے۔ تن بدن کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ ہمہ تن مصروف نظر آتے ہیں۔ بھوک لگی ہو، لگی رہے۔ کپڑے خراب ہو رہے ہوں ہوتے رہیں۔ تھک کر چور ہو گئے ہوں کوئی پرواہ نہیں۔ سردی ہو، گرمی ہو، کیچڑ ہو، پانی ہو، ہوا کرے۔ ان کا کھیل جاری رہے گا۔ کھیل کے لیے کسی وقت یا جگہ کی قید نہیں۔ جب بھی اور جہاں بھی موقع ملے کھیلنے کے لیے تیار ہیں۔ درجے سے چھوٹتے اور بستر سے اٹھتے ہی کھیل میں لگ جائیں گے، والدین کی خفگی، اساتذہ کی سختی، ہم جولیوں کی بے رخی، کوئی چیز بھی انہیں کھیل سے باز نہیں رکھ سکتی۔ وہ ہر دکھ جھیلیں گے اور بہر حال کھیلیں گے۔

بچے نچلے نہیں بیٹھ سکتے۔ نچلا بیٹھنا بیماری یا بدھو پن کی علامت ہے۔ بھاگ دوڑ، اچھل کود، توڑ پھوڑ، شور وشغب۔ یہ سب تو بچپن کے لوازمات ہیں۔ صحت وتوانائی اور ذہانت وزندگی کی علامات ہیں، جو بچے ان صفات سے محروم رہتے ہیں وہ بچے نہیں بوڑھے ہیں۔ یہ ساری حرکات تو ان کے پیدائشی حقوق ہیں۔ ان حقوق سے انہیں محروم نہیں کیا جا سکتا۔

حقیقی مسرت بچوں کو کھیل ہی میں حاصل ہوتی ہے۔ کھیل کا سامان اور کھیلنے کے لیے چند ساتھی مل جائیں پھر کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوگا کہ ان کی مرادیں بر آئیں۔ جنت کے یہ پھول کھل اٹھیں گے۔ چہرے پر مسکراہٹ اور شگفتگی کھیلنے لگے گی۔ ان کو تو خیر لطف آتا ہی ہے۔ ہنستے کھیلتے، بچوں کو دیکھ کر کون انسان باغ باغ نہیں ہو جاتا۔ کھیل میں بچوں کا غیر معمولی انہماک اور کھیل سے ان کا والہانہ عشق دراصل اس بات کا ثبوت ہے کہ کھیل ایک زبردست خواہش اور فطری داعیہ ہے جس کی بہر حال جائز حدود میں تکمیل ہونی چاہیے۔ جو لوگ بچوں کو کھیل سے محروم رکھتے ہیں۔ وہ دراصل فطرت سے جنگ اور بچوں پر ظلم کرتے ہیں۔ قدرت نے یہ زبردست داعیہ بلاوجہ نہیں رکھا

ہے۔ بچوں کی ذہنی و جسمانی، معاشرتی و اخلاقی نشو و نما کے لیے کھیل نہایت ضروری ہیں۔

بچے کیوں کھیلتے ہیں؟

اس ضمن میں متعدد رائیں ہیں۔ مثلاً:

۱۔ کھیلوں کے ذریعے بچے اپنی فاضل توانائی خارج کرتے ہیں۔ بچوں میں اپنے قد کے لحاظ سے بہت زیادہ توانائی ہوتی ہے۔ اس توانائی کو کسی سنجیدہ کام میں لگانے کی انہیں ضرورت پیش نہیں آتی کیونکہ جہاں تک ضروریات زندگی کی تکمیل کا تعلق ہے یہ کام ان کے سرپرست انجام دے دیتے ہیں۔ بچے تو ہر حال میں مست رہتے ہیں۔ کل کی انہیں فکر نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ اپنی فاضل توانائی کھیلوں میں صرف کرتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو جس طرح بھاپ کی فالتو مقدار انجن کو نقصان پہنچا سکتی ہے اسی طرح فالتو قوت بچوں کے جسم کو متاثر کر سکتی ہے۔

۲۔ کھیلوں کے ذریعے بچے اپنے کو مستقبل کی ذمہ داریوں کے لیے تیار کرتے ہیں۔ بچیاں گڑیاں کھیل کر امور خانہ داری سے واقفیت حاصل کرتی ہیں اور بچے نقل کے کھیلوں کے ذریعے مختلف قسم کے فرائض کی انجام دہی کا سلیقہ سیکھتے ہیں۔

۳۔ بچے کھیل کھیل میں ترقی کے ان مراحل کا اعادہ کرتے ہیں جن سے گزرتے ہوئے نسل انسانی موجودہ مقام پر پہنچی ہے۔ بچوں کا دوڑنا، بھاگنا، اچھلنا، کودنا، پیچھا کرنا، پیڑ پر چڑھنا، غار میں اترنا، شکار کرنا، مچھلیاں پھنسانا، گھر گھروندے بنانا وغیرہ، یہ تمام حرکات ابتدائی دور کے انسانوں کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ اس طرح وہ متعدد تجربات اور طرح طرح کی مہارتیں حاصل کرتے ہیں۔

۴۔ بچوں کی اپنی الجھنیں اور پریشانیاں ہوتی ہیں، ان کے متعدد جبلی تقاضوں اور بنیادی خواہشات کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔ ان کے جذبات بھی اکثر مجروح ہوتے رہتے ہیں۔ ان

کلفتوں سے چھٹکارا پانے کے لیے بچے کھیلتے اور کھیل کود کر اپنی طبیعت کا بار ہلکا کرتے ہیں۔

۵۔ ہر بچے میں رشک ورقابت اور مقابلے ومسابقت کے جذبات ہوتے ہیں۔ چونکہ کھیل ان کے اظہار کے کافی مواقع بہم پہنچاتے ہیں اس لیے کھیلوں کے ذریعے بچے اپنے ان جذبات کی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔

۶۔ بچوں کے کھیل ان کی تخلیقی سرگرمیوں کا مظہر ہیں۔ بچے اپنی طبیعت سے مجبور ہیں، نچلے بیٹھ نہیں سکتے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہتے ہیں، کھیل ان کی اس خواہش کی تکمیل کا بہترین ذریعہ ہے۔

۷۔ بالیدگی اور نشوونما کے مختلف مراحل پر جسم اور ذہن مختلف قسم کی حرکات کا تقاضا کرتے ہیں۔ مختلف قسم کے کھیل ان تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ اس لیے بچے طرح طرح کے کھیل کھیلتے ہیں۔

یہ ہیں بچوں کے کھیل کی مختلف توجیہات جو مختلف ماہرین نفسیات نے اپنے اپنے مشاہدات یا قیاس سے پیش کی ہیں۔ ان کی آراء سے کلی اتفاق ضروری نہیں لیکن اس بات سے بہرحال اختلاف ممکن نہیں کہ بچوں کی مناسب نشوونما کے لیے کھیل انتہائی ضروری اور مفید ہیں۔

کھیلوں کی قسمیں

بچے مختلف قسم کے کھیل کھیلتے ہیں۔ ایک بچہ کب کس قسم کے کھیل کھلونوں میں دلچسپی لے گا یہ اس کی عمر، جنس، مزاج، ماحول، موسم اور وسائل وذرائع وغیرہ پر موقوف ہے۔ ننھے بچے اکیلے کھیلنا پسند کرتے ہیں تو ان سے بڑے ٹولیاں بنا کر۔ بچوں کو نقل کے کھیلوں میں مزہ آتا ہے۔ تو نوجوانوں کو مقابلے کے کھیلوں میں۔ لڑکے گیند بلا کھیلتے ہیں تو لڑکیاں گڑیوں سے جی بہلاتی ہیں۔ کمزور گھریلو کھیلوں میں دلچسپی لیتے ہیں تو قوی میدانی کھیلوں میں، ذہین بچے زیادہ کھیلتے مل کر

کھیلتے یا سوچ بچار والے کھیل پسند کرتے ہیں تو غبی بچے کھیلوں سے دور رہتے، جھگڑا کرتے یا کم عمر بچوں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ شہری بچوں کے کھیل میں تنوع ہوتا ہے تو دیہاتی بچوں کے کھیلوں میں سادگی و یکسانیت۔ گرمی برسات میں گھریلو کھیل کھیلے جاتے ہیں تو بارش تھمنے پر کیچڑ پانی اور تیراکی کے، جاڑے میں پکنک میں مزہ آتا ہے تو بہار میں دوڑ بھاگ اور آنکھ مچولی میں۔

ذیل میں مختلف عمر کے مختلف کھیلوں کے متعلق مختصر معلومات دی جارہی ہیں:

ا۔ اپنے جسم سے کھیلنا:

بچوں کے ابتدائی کھیل ان کے اپنے جسم سے متعلق ہوتے ہیں۔ پیدائش کے چند دن بعد ہی سے وہ ہاتھ پاؤں مارنا اور چیخنا چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ ان حرکات سے ان کے اعصاب وعضلات نشو ونما پاتے ہیں۔ اس کے بعد رینگنے، بیٹھنے، کھڑے ہونے اور چلنے کی کوشش کرتے ہیں ان کوششوں کے نتیجے میں رفتہ رفتہ وہ اپنے جسم اور اس کے مختلف اعضا پر قابو حاصل کرتے ہیں۔ ننھے بچوں کو ہاتھ پاؤں مارنے اور اپنے جسم کو سنبھالنے کا پورا موقع ملنا چاہیے۔ جو لوگ نادانی یا لاڈ پیار کے باعث بچوں کو گود کا عادی بنا دیتے ہیں وہ سخت غلطی کرتے ہیں۔ اس سے بچوں کی نشو ونما رک جاتی ہے اور اعضا کمزور ہو جاتے ہیں۔

۲۔ اشیاء سے کھیلنا:

اپنے جسم پر کسی حد تک قابو پالینے کے بعد بچے اپنے گردو پیش کی چیزوں سے کھیلنا اور بے تکی آوازیں نکالنا شروع کرتے ہیں۔ جو چیز بھی ہاتھ لگ جائے اسے چھونے پکڑنے اپنی طرف کھینچنے، اٹھانے، منہ میں ڈالنے، پھینکنے، توڑنے پھوڑنے اور اس میں سے آوازیں نکالنے، سوراخوں میں انگلیاں ڈالنے اور ناخن سے کھودنے کریدنے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح وہ متعدد چیزوں کی ساخت، رنگ، سائز، مزے، وزن وغیرہ کے متعلق غیر ارادی طور پر بہت سی معلومات حاصل کرتے ہیں۔ اس مرحلے میں بچوں کو خوش رنگ، بجنے اور حرکت کرنے والے

لکڑی، ربڑ، پلاسٹک کے ایسے کھلونے اور خالی ڈبے وغیرہ ملنے چاہئیں جن کا رنگ پختہ ہوتا کہ منہ میں ڈالنے یا پانی میں بھگونے سے رنگ نہ چھوٹے اور جو آسانی سے ٹوٹ نہ جائیں۔ اور نہ جلد میلے اور خراب ہوں، نیز ایسی چیزیں بچوں کی دسترس سے باہر ہونی چاہئیں جن کو ہاتھ لگانا یا منہ میں ڈالنا بچوں کے لیے مضر ہو یا جن کے ٹوٹنے پھوٹنے اور خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو، مثلاً شیشے، چینی کے برتن، گھڑی، عینک قلم وغیرہ۔ اسی عمر میں بعض بچوں کو کوئلہ، مٹی، راکھ وغیرہ کھانے یا پاخانہ پیشاب سے کھیلنے کی گھناؤنی عادت پڑ جاتی ہے اس لیے کافی دیکھ بھال ہونی چاہیے۔

البتہ توڑ پھوڑ کے ان کھیلوں سے گھبرانا نہیں چاہئے اور نہ بہت زیادہ روک ٹوک اور ملامت کرنی چاہیے۔ کیونکہ تعمیر کی طرف بچوں کا یہی پہلا قدم ہے اسی سے وہ رفتہ رفتہ جوڑنے اور بنانے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور گھر گھروندے اور مٹی کے کھلونے وغیرہ بنانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔ مدرسے میں مٹی کاغذ اور دفتی کا کام رائج کر کے اور تعلیمی کھیلوں مثلاً لکڑی اور پلاسٹک کے بلاک میکنوسٹ وغیرہ کا بندوبست کر کے کھیل میں بچوں کی تعمیری صلاحیتوں کو ابھارا اور صحیح رخ پر ڈالا جاسکتا ہے۔

۳۔ مل جل کر کھیلنا:

چار پانچ سال کی عمر تک کے بچے عموماً یا تو تنہا کھیلتے ہیں یا دوسرے بچوں کے پاس بیٹھ کر اپنے اپنے کھلونوں سے الگ کھیلنا پسند کرتے ہیں بچے بچیوں کے کھیلوں میں بھی کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ مل جل کر ٹولیوں میں کھیلنے لگتے ہیں۔ لڑکے لڑکوں کے ساتھ اور لڑکیاں لڑکیوں کے ساتھ۔ اب کئی بچے جمع ہو کر ایک ساتھ غل مچائیں گے۔ مہمل آوازیں نکالیں گے۔ فضول بولیں گے۔ سر میں سر ملا کر بے معنی فقرے دہرائیں گے، آوازوں کی نقل اتاریں گے۔ مختلف سوانگ بھریں گے، شادی بیاہ رچائیں گے۔ کھیل کھیل میں مختلف تقریبات منائیں گے۔ دوڑنا بھاگنا، اچھلنا کودنا، ایک دوسرے کا پیچھا کرنا، چھپنا، ڈھونڈنا، جانوروں کے پیچھے

انہیں طرح طرح سے ستانا اور ان پر سواری گانٹھنا، ٹولیاں بنا بنا کر ادھر ادھر پھرنا، درختوں پر چڑھنا۔ گڑھوں اور غاروں میں اترنا وغیرہ بتدریج ان کے پسندیدہ کھیل ہوتے ہیں۔ ابتدا میں ٹولیاں چھوٹی ہوتی ہیں تاکہ ہر ایک کو کھیلنے اور اپنے کرتب دکھانے کا پورا موقع مل سکے۔ مقابلے اور مسابقت کے کھیلوں سے بھی شروع میں گھبراتے ہیں کیونکہ وہ ہارنا نہیں چاہتے۔ اگر مقابلہ پڑ ہی جائے اور اتفاق سے وہ ہار جائیں تو یا تو رونے اور جھگڑنے لگیں گے یا دھاندلی، بے ایمانی اور غلط بیانی سے کام لیں گے۔ اس مرحلے میں بچوں کو خاص طور پر سنبھالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ ان میں کھلاڑیوں کی اسپرٹ پیدا کرائی جائے اور ہار جیت کی پرواہ کیے بغیر ایمانداری سے کھیلنے کی ترغیب دی جائے۔ ابتدا میں ایسے کھیل کھلائے جائیں جن میں مل کر کھیلنا ہو اور مقابلے اور مسابقت کی نوبت کم آئے۔ مثلاً نقل کے کھیل، جن میں ہر بچے کا پارٹ جدا ہوتا ہے۔ کوئی ڈاکٹر بنتا ہے، کوئی مریض، کوئی کمپاؤنڈر بنتا ہے۔ کوئی تیماردار۔ کچھ بچے مہمان بنتے ہیں۔ کچھ میزبان وغیرہ، رفتہ رفتہ بچے مقابلے کے کھیلوں میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ اور پٹ پٹا کر قاعدوں ضابطوں کے پابند اور ٹولی کے سربراہ کار کے مطیع فرماں بردار بن جاتے ہیں شروع میں انہیں کرسی دوڑ، چمچہ دوڑ، جلیبی دوڑ، نارنگی دوڑ، چیتا چیتل، رومال جھپٹ، چھپنا ڈھونڈنا، آنکھ پر پٹی باندھ کر کھیلے جانے والے مختلف کھیل کھلائے جائیں۔ آٹھ نو سال سے بارہ تیرہ سال کی عمر تک مختلف قسم کے دوڑ، اونچی لمبی کود، گیند بلا، کبڈی، رسہ کشی وغیرہ میں حصہ لینے کے مواقع فراہم کیے جائیں، کبھی کبھی تعلیمی سیر وسیاحت یا پکنک کے لیے باہر لے جائیں۔ کمزور اور بے بس کے ساتھ شفقت وہمدردی کا برتاؤ اور ان کی نگہبانی و پرداخت کا جذبہ بھی فطری ہے۔ اس جذبے کو ابھارنے کے لیے کوئی پرند یا جانور مثلاً مرغیاں، کبوتر، بکری، خرگوش وغیرہ پالنے، پھول پودے اگانے، چھوٹے بھائی بہنوں یا کمزور ہم جولیوں کی نگہبانی کا کام ان کے سپرد کیا جائے تو بچے کھیل کھیل میں جانوروں کو ستانے، کمزوروں کو دبانے اور آپس میں لڑنے جھگڑنے سے گریز کرنے لگیں گے۔

عنفوان شباب میں داخل ہونے کے بعد بچوں کے کھیل زیادہ منظم ہونے لگتے ہیں۔

مسابقت اور مقابلے کی اسپرٹ بھی بڑھ جاتی ہے شور و شغب کم اور حرکت زیادہ ہونے لگتی ہے۔ مستقل ٹیمیں اور کلب بننے لگتے ہیں اور دوسری ٹیموں اور کلبوں کو چیلنج دینے اور ان سے ٹکر لینے کی فکر ہوتی ہے۔ پرواز بھی بلند ہو جاتی ہے اور ٹولیاں بنا کر سیر و سیاحت کے لیے گھر سے بہت دور نکل جانے کا شوق ابھرتا ہے۔ ذہنی کشتی، معمہ بازی، ہاتھ کی صفائی اور مہارتی کھیلوں میں دلچسپی ہونے لگتی ہے۔ اب لڑکوں کو فٹ بال، والی بال، رنگ بال، بیڈمنٹن، پنگ پانگ، کرکٹ، ہاکی، رسہ کشی، کبڈی، بنوٹ، تیراکی، سائیکل سواری، پی ٹی کی ورزشیں، جمناسٹک اور میچوں کے مقابلوں وغیرہ میں حصہ لینے کا موقع ملنا چاہیے اور لڑکیوں کو ہنڈ کلھیا، ہوم پکنک، ان ڈور گیمز اور ہلکی ورزشوں کا۔ رفتہ رفتہ محنت مشقت اور فنی مہارت کے کاموں میں کھیل کی اسپرٹ پیدا کرا کے لڑکے لڑکیوں کو ان کا عادی بنانا چاہیے تاکہ صحت بھی ٹھیک رہے اور ان کا وقت مفید اور کار آمد کاموں میں صرف ہو۔

کھیل، کام اور بیگار:

ان تینوں کی نوعیت اور ان میں فرق سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل مثالوں پر غور کرنا مفید ہوگا۔

۱۔ ایک بچی اپنی گڑیوں کے لیے جوڑے تیار کر رہی ہے۔ وہ سینے پرونے میں منہمک ہے یا اس نے اپنی گڑیاں کا بیاہ رچا رکھا ہے اور باراتیوں کے لیے ہنڈ کلھیا پکا رہی ہے۔

۲۔ وہی بچی مدرسے گئی ہے۔ مدرسے میں سینے پرونے یا کھانا پکانے میں مہارت حاصل کرنے کے لیے گھنٹے رکھے گئے ہیں۔ سلائی کے گھنٹے میں وہ سینے پرونے میں یا طباخی کے گھنٹے میں وہ کھانا پکانے میں مصروف ہے۔

۳۔ وہی بچی اپنی گڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ اس کی سہیلی بھی پاس ہی بیٹھی اس کی گڑیوں کا ساز و سامان دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں ماں نے اسے اٹھا کر کھانا پکانے یا چھوٹے بھائی کا پاجامہ سینے پر لگا دیا۔ اب وہ کھانا پکانے یا سینے پرونے میں مصروف ہوگئی ہے۔

مندرجہ بالا تینوں صورتوں میں مشاغل ایک ہی نوعیت کے ہیں۔یعنی سینا پرونا یا کھانا پکانا۔لیکن تینوں صورتوں میں مصروفیت کے وقت اس بچی کے دل ودماغ کی کیفیت یکساں نہیں ہوتی بلکہ جدا جدا ہوتی ہے۔ذہنی وقلبی کیفیات کے اختلاف ہی کی وجہ سے وہی مشغلہ پہلی صورت میں بچی کے لیے کھیل ہے تو دوسری صورت میں کام اور تیسری صورت میں بیگار۔

اس سے بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ کھیل، کام یا بیگار کا انحصار مشغلے کی نوعیت پر موقوف نہیں ہے بلکہ دل ودماغ کی اس کیفیت پر ہے جو کسی مشغلے میں مصروفیت کے وقت ہوا کرتی ہے۔

کھیل:۔ وہ مشغلہ ہے جس میں غیر ارادی توجہ، فطری دلچسپی وآزادی اور مسرت محسوس ہوتی ہے۔

کام:۔ وہ مشغلہ ہے جس میں توجہ اور دلچسپی ارادی یا بالواسطہ ہوتی ہے، براہ راست اس مشغلہ میں فطری کشش نہیں ہوتی، آزادی بھی محدود ہو جاتی ہے۔ایک خاص انداز ہی سے اسے انجام دینا ہوتا ہے اور اس کی انجام دہی میں مسرت کا ہونا بھی ضروری نہیں۔

بیگار:۔ ان کے برعکس بیگار وہ مشغلہ ہے جو کسی فرد کی دلچسپی کو نظر انداز اور اس کی آزادی کو سلب کر کے اس پر خارج سے تھوپ دیا جاتا ہے اور اپنی مرضی کے خلاف اسے چار وناچار انجام دینا پڑتا ہے۔

کھیل ایک ایسا مشغلہ ہے جو بذات خود مقصود ہوتا ہے۔کام بذات خود مقصود نہیں ہوتا بلکہ کسی ایسے شعوری مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے جس پر ہر وقت کرنے والے کی نظر جمی رہتی ہے۔بیگار میں فرد کو کسی اور کی مقصد براری کا آلہ کار بننا پڑتا ہے یا مقصد اس کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے اور دوسروں کا کام سمجھ کر مجبوراً انجام دینا پڑتا ہے۔

مشاغل کی یہی خصوصیات بسا اوقات کھیلوں کو بھی کام بلکہ بیگار بنا دیتی ہیں یا کام کو کھیل میں تبدیل کر دیتی ہیں۔مثلاً ایک بچہ مدرسے میں ہونے والے سہ پہر کے کھیلوں میں اپنے شوق سے شریک ہوتا ہے، ایسی صورت میں کھیل اس کے لیے واقعی کھیل ہے۔دوسرا اس لیے شریک

ہوتا ہے کہ کھیلنے سے صحت ٹھیک رہتی ہے یا ساتھیوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ظاہر ہے یہ کھیل اس کے لیے کام ہے،ایک تیسرا بچہ ہے جس کی دلچسپیاں کسی اور طرف ہیں لیکن وہ ضابطے کی وجہ سے پابند ہے اور سزا کے ڈر سے ان کھیلوں میں شرکت کرتا ہے تو یہ کھیل اس کے لیے بیگار ہے، اسی طرح کھیل کے نگراں کی سختی،اس کی طرف سے عائد کردہ غیر معمولی پابندیاں بھی کھیل کو عموماً کام یا بیگار بنا دیتی ہیں۔

اس کے برعکس کاموں میں اگر کھیل کی اسپرٹ پیدا کر دی جائے یعنی بچوں کی دلچسپی آزادی اور مسرت کا حتی الامکان لحاظ رکھا جائے۔خارجی دباؤ اور حد بندیاں کم سے کم ہوں تو وہ کام کو بھی کھیل ہی سمجھیں گے۔پوری توجہ اور انہماک اور یکسوئی سے حصہ لیں گے اور جبر کی وجہ سے ان کی شخصیت اور کارکردگی پر جو برے اثرات پڑتے ہیں ان سے بھی وہ محفوظ ہو جائیں گے۔

کھیل کھیل میں تعلیم:

چھوٹے بچے کھیل کے بہت دلدادہ ہوتے ہیں وہ کام سے گھبراتے ہیں اور بیگار تو ان کی حریت پسند طبیعت پر انتہائی گراں گزرتی ہے۔کھیل میں وہ جی جان سے لگتے اور پوری دلچسپی اور انہماک سے حصہ لیتے ہیں۔باقی ہر کام سے وہ جی چراتے ہیں۔کھیل بچوں کا محبوب ترین مشغلہ ہی نہیں بلکہ زندگی کی علامت،صحت وعافیت کا ضامن،نشوونما میں معاون اور تعلیم وتربیت کا موثر ترین ذریعہ بھی ہے اس کے برعکس باقاعدہ یا رسمی تدریس عموماً ان کے لیے بیگار اور ان کی طبع نازک پر گراں بار ہوتی ہے۔لکھنے پڑھنے جیسے خشک کام سے ان کی فطرت ابا کرتی ہے۔چنانچہ بہت ہی مارے جی سے اور مارے باندھے وہ اس میں شرکت کرتے ہیں۔اسی لیے چھوٹے بچوں کو کھیل کھیل میں تعلیم دینے اور مدرسے کے مختلف کاموں میں کھیل کی اسپرٹ پیدا کرنے پر غیر معمولی زور دیا جاتا ہے۔لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ بچوں کو زندگی بھر کے لیے لہو ولعب کا عادی بنا دیا جائے بلکہ ننھے بچوں کو کھیل کے زیادہ مواقع دیئے جائیں حتی الامکان کھیلوں کو بھی تعلیم وتربیت کا

ذریعہ بنایا جائے اور کاموں میں کھیل ہی کی اسپرٹ پیدا کر کے رفتہ رفتہ محنت مشقت اور توجہ وانہماک سے کام کرنے کا عادی بنایا جائے۔ مقصود تو تعلیم وتربیت ہے۔ کھیل اس کے حصول کا صرف ذریعہ ہے۔

کھیل سے فائدے

کھیلوں سے بچوں کو حقیقی مسرت نصیب ہوتی ہے، ان کا غم غلط ہوتا ہے، ان کی الجھنیں اور پریشانیاں دور ہوتی ہیں۔ ان کے چہرے شگفتہ رہتے ہیں، ان کے جذبات کی تسکین ہوتی ہے اور بحیثیت مجموعی ان کی شخصیت کو ہم آہنگی کے ساتھ پروان چڑھانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کھیلوں سے بچوں کو مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

ا۔ جسمانی فائدے:

کھیلوں میں جسم کو کافی حرکت دینی پڑتی ہے اور جسمانی محنت ومشقت کی ضرورت پیش آتی ہے اس لیے سانس کی آمدورفت، دوران خون، نظام انہضام، اخراج فضلہ وغیرہ میں باقاعدگی رہتی ہے۔ اعصاب اور عضلات پر کنٹرول حاصل ہوتا ہے، اعضاء وجوارح اپنی اپنی جگہ ٹھیک کام کرتے ہیں۔ محنت ومشقت کے لیے جسم میں توانائی اور امراض کا مقابلہ کرنے کے لیے قوت مدافعت پیدا ہوتی ہے۔ بحیثیت مجموعی صحت ٹھیک رہتی ہے اور نشوونما اور بالیدگی میں بڑی مدد ملتی ہے۔

۲۔ ذہنی فائدے:

کھیلوں میں بچوں کو مختلف قسم کے حالات اور طرح طرح کے ہم جولیوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ان سب سے نمٹنے کے لیے انہیں سوچنے سمجھنے اور بروقت فیصلہ اور اقدام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماحول اور مختلف اشیاء کے بارے میں طرح طرح کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

چیزوں کو بنانے بگاڑنے اور توڑنے جوڑنے نیز نقل کے کھیل کھیلنے سے قوت متخیلہ کی نشو ونما ہوتی ہے اور اختراع وایجاد کی صلاحیت ابھرتی ہے۔ اپنی صلاحیتوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانے کا موقع ملتا ہے۔ توجہ اور انہماک کی تربیت ہوتی ہے۔ تجربات ومشاہدات میں اضافہ ہوتا ہے۔ حقیقی دنیا میں بچوں کے اکثر جبلی تقاضوں اور فطری خواہشات کی تکمیل نہیں ہو پاتی جس سے وہ خلجان اور ذہنی انتشار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کھیلوں کے ذریعے وہ خیالی دنیا میں ان کی تکمیل کر لیتے ہیں اور اس طرح الجھنوں سے انہیں نجات ملتی اور ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے۔

۳۔ معاشرتی فائدے:

اجتماعی کھیلوں کے ذریعے بچے اپنے ہم جولیوں کے ساتھ تعاون وہمدردی، قاعدوں، ضابطوں کی پابندی، مقابلہ ومسابقت میں اعتدال، اطاعت وقیادت، حق تلفیوں اور دھاندلیوں کا مقابلہ اور اپنی باری کا انتظار کرنے کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ ہم جولیوں کا پاس ولحاظ کرنا، لاقانونیت کی حد تک بڑھی ہوئی آزادی کو دوسروں کی خاطر محدود کرنا اور اپنی خواہشات اور ذاتی دلچسپیوں کو اجتماعی مفاد پر قربان کرنا بھی وہ منظم کھیلوں کے ذریعے سیکھتے ہیں۔

۴۔ اخلاقی فائدے:

کھیلوں کے ذریعے بچوں میں متعدد اخلاقی اوصاف بھی پروان چڑھتے ہیں مثلاً استقلال وپامردی، ضبط نفس، خود اعتمادی، وفاداری واطاعت شعاری وغیرہ۔

غرض کھیلوں کے ذریعے بچوں کی ہم آہنگ نشو ونما میں بڑی مدد ملتی ہے، ان کی وجہ سے سالم شخصیت پروان چڑھتی ہے لیکن واضح رہے کہ اگر ان اوصاف کے بجائے کھیلوں ہی کو مقصود بنا لیا جائے گا تو ان کا مظاہرہ صرف کھیل کے میدانوں ہی میں ہوگا۔ ضروری نہیں کہ روزمرہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ان اوصاف کا مظاہرہ ہو۔ اس لیے ضروری ہے کہ کھیل کو صرف ذریعہ سمجھا جائے اور مختلف کاموں میں کھیل کی اسپرٹ پیدا کر کے رفتہ رفتہ ان اوصاف کو پروان چڑھانے کی

فکر کی جائے۔

یہ ہیں بچوں کی چند اہم جبلتیں اور فطری داعیات، بچوں کو ہم آہنگ نشوونما اور متوازن سیرت وکردار کی تشکیل کے لیے ان کو صحیح رخ پر ڈالنے کی پوری کوشش ہونی چاہیے، ان کو کچلنے، دبانے یا غلط رخ پر ڈالنے سے بچوں کی شخصیت مجروح ہوتی اور ان کے اندر طرح طرح کی خرابیاں جڑ پکڑتی ہیں۔ بچوں کی تعلیم وتربیت میں ان کا پورا لحاظ رکھنا چاہیے۔

..........☆☆☆..........

باب ۱۲:

بچوں کی تربیت

تربیت کے لغوی معنی پالنا پوسنا کے ہیں لیکن اصطلاح میں سیرت و شخصیت کو سنوارنا تربیت کہلاتا ہے۔ تربیت کا مقصود دراصل بچوں کو بتدریج ان اوصاف کا حامل بنانے میں مدد دینا ہے جو دونوں جہان میں ان کی فلاح و کامرانی کے لیے ضروری ہیں۔

ظاہر ہے یہ کام بہت ہی ہمہ گیر محنت طلب اور صبر آزما ہے۔ اس کے لیے بتدریج:

۱۔ بچوں کا طرزِ فکر، نظریۂ حیات اور معیارِ امتیاز و انتخاب ایسا بنانا ہوگا جو ان کے مقصدِ وجود اور نصب العین سے مطابقت رکھتا ہو۔ یعنی مختلف معاملات میں سوچنے کا ڈھنگ، زندگی کے بارے میں ان کا تصور اور برائی بھلائی کو پرکھنے کے لیے ان کا معیار وہی بنانا ہوگا جو اللہ کے ایک صالح بندے کا ہونا چاہیے۔

۲۔ ان کے تخیلات اعلیٰ، تصورات واضح، تفکر منظم، استدلال مربوط، عقائد صحیح، تیقنات پختہ اور ارادے مضبوط بنانے ہوں گے۔ کیونکہ یہی پختہ سیرت کی اساس اور پاکیزہ کردار کے محرکات ہیں۔

۳۔ ان کی جبلتوں و جذبات اور خواہشات و میلانات میں انضباط پیدا کر کے ان قوتوں کو صحیح رخ پر ڈالنا ہوگا۔

۴۔ ان کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کی مناسب طریقے سے اصلاح کرنی ہوگی اور ان پر قابو پانے کے لیے ان کے اندر خود اعتمادی اور ندامت کا جذبہ پروان چڑھانا ہوگا۔

۵۔ انتہائی صبر و استقلال سے پسندیدہ عادات ڈلوانی اور ناپسندیدہ ترک کرانی ہوں گی۔

۶۔ محبت اور شفقت سے مختلف آداب اور طور طریقے سکھانے ہوں گے۔

ے۔ ان کی استعداد کے مطابق مصروفیات ومشاغل اوران کی فطری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے مواقع فراہم کرنے ہوں گے تاکہ مناسب عملی تربیت ہو۔

جبلتوں اور جذبات کی تربیت کے ضمن میں کچھ باتیں اوپر گزر چکی ہیں۔ ذیل میں فطری خواہشات اوران کی تربیت کے ضمن میں کچھ مزید معلومات فراہم کی جارہی ہیں۔

بنیادی خواہشات اوران کی تربیت

ہر فرد کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ:

☆ وہ آرام وآسائش سے رہے اوراسے اچھا کھانے اوراچھا پہننے کو ملے۔

☆ سب اس کو پیار کریں، اسے اچھی نظروں سے دیکھیں اوراس کے کاموں کو سراہیں۔

☆ وہ جنس مخالف کو اپنی طرف راغب کرے، شادی بیاہ رچائے اور بال بچوں والا ہو (عنفوان شباب کے بعد بلوغ کے قریب)

☆ اہل وعیال اور کمزوروں اور معذوروں کی خبر گیری کرے (یہ خواہش نسبتاً کمزور ہوتی ہے)

☆ دوسروں پر اسے برتری اور فوقیت حاصل ہو، چھوٹے اور کمزور اس کا حکم مانیں اوراس کا ادب واحترام کریں۔

☆ موثر ومقتدر ہستیوں کا وہ خود ادب واحترام اور مختلف امور میں ان کی اطاعت اور پیروی کرے۔

☆ ہم جنسوں کی دوستی، رفاقت اور ہمدردی اسے حاصل ہو۔

☆ کچھ چیزوں کا وہ مالک ہو جو بلا شرکت غیرے اس کے قبضے اور تصرف میں رہیں۔

☆ اپنے کو کسی کے حوالے کردے اس کی رضا اور خوشنودی چاہے اور مصیبت میں اس کا سہارا لے۔

چونکہ افراد میں یہ خواہشات ان کے فطری داعیات یا جبلی تقاضوں کے تحت ابھرتی ہیں اور ہوتی بڑی زوردار ہیں۔ نیز ان کی تکمیل پر ایک خاص قسم کی لذت وکیفیت بھی محسوس ہوتی ہے۔

اس لیے ہر فرد ان کے ضمن میں غیر معمولی سرگرمی دکھاتا ہے۔ ان کی تکمیل کے لیے کافی دوڑ دھوپ اور جدوجہد کرتا ہے، اگر اس کی یہ بنیادی خواہشات پوری ہو جاتی ہیں تو وہ خوش وخرم رہتا ہے، اسے ذہنی سکون اور قلبی طمانیت حاصل ہوتی ہے اور سالم ومتوازن شخصیت پروان چڑھتی ہے۔ لیکن اگر ان کی تکمیل میں مزاحمت ہوتی ہے تو اسے دور کرنے کے لیے پورا زور لگا دیتا ہے، پھر بھی پوری نہ ہوں تو افسردہ وغمگین اور کھویا کھویا سا رہتا ہے اور ہر وقت کی کڑھن سے اس کی صحت وشخصیت متاثر ہو جاتی ہے۔

ان خواہشات کی تکمیل کے متعدد طریقے ہوتے ہیں، کچھ پسندیدہ، خوشگوار اور جائز، کچھ ناپسندیدہ، ناگوار اور ناجائز۔ ہر فرد فطرتاً تکمیل کے پسندیدہ طریقے کو ترجیح دیتا ہے اور ناپسندیدہ سے ہر ایک کا ضمیر ابا کرتا ہے لیکن جب جائز طریقے سے تکمیل محال نظر آتی ہے تو وہ ناجائز یا ناپسندیدہ طریقوں کو اپنانے کی سوچنے لگتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ عجیب ذہنی کشمکش کا شکار ہوتا ہے۔ خواہش ایک طرف گھسیٹتی ہے اور ضمیر دوسری سمت میں لے جانا چاہتا ہے۔ اس طرح کی کشمکش سے ہر فرد کو روانہ متعدد بار سابقہ پیش آتا ہے۔ کشمکش کے ان مواقع پر تربیت، تجربات، عقل، قوت ارادی، معتقدات اور نصب العین آڑے آتے ہیں۔ یہ چیزیں جس درجے میں فرد کو حاصل ہوتی ہیں۔ اسی حد تک وہ مقابلہ ومزاحمت کرتا ہے۔ اگر پچھاڑ لیتا ہے تو دامن بچا لے جاتا ہے اور سرخرو ہوتا ہے۔ اگر مات کھا جاتا ہے تو دامن بھی داغدار ہوتا ہے اور بدی کے جنجال میں پھنس کر روسیاہ ہوتا ہے۔

چھوٹے بچوں کی یہ خواہشات زیادہ شدید ہوتی ہیں۔ وہ ان کے تقاضوں کی بروقت تکمیل چاہتے ہیں۔ چونکہ وہ نادان ہوتے ہیں۔ برے بھلے کی انھیں تمیز نہیں ہوتی۔ ساتھ ہی تجربہ، عقل اور قوت ارادی کی بھی کمی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے مات کھا جانے اور غلط رخ اختیار کر لینے کے ہر وقت امکانات رہتے ہیں۔ ایک بچہ اپنی کسی خواہش کی تکمیل کا جائز راستہ نہیں پاتا تو ناپسندیدہ طریقہ اپنا لیتا ہے۔ اس طرح اسے جو لذت وفرحت ملتی ہے وہ ایسا ہی کرنے پر اسے بار بار اکساتی

ہے۔کئی بار کرنے سے وہ اس قبیح حرکت کا عادی ہو جاتا ہے، عادتیں پختہ ہو کر فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں اور پھر بڑی مشکل سے چھوٹتی ہیں بلکہ عموماً زندگی بھر چمٹی رہتی ہیں۔

خواہشات کی تربیت:

یہ خواہشات فطری ہیں، ہر ایک میں پائی جاتی ہیں، تکمیل کے لیے بڑا زور لگاتی ہیں۔ جائز طریقے سے پوری نہ ہوں تو ناجائز طریقہ اختیار کر لینے کا اندیشہ برابر لگا رہتا ہے۔ عدم تکمیل کی صورت میں ذہن الجھن کا موجب ہوتی ہیں۔اور شخصیت پر بہت ہی برا اثر ڈالتی ہیں۔اس لیے سالم شخصیت پروان چڑھانے اور ناجائز یا ناپسندیدہ طرز عمل سے بچانے کے لیے جائز حدود میں حتی الامکان ان کی تکمیل کا بندوبست ہونا چاہیے۔

☆ اگر کسی وجہ سے تکمیل ممکن یا مناسب نہ ہو مثلاً بچے کا کسی ایسی چیز کی ضد کرنا جو بہت قیمتی ہو یا دستیاب ہی نہ ہو سکتی ہو یا اس عمر میں فراہم کرنا مناسب ہی نہ ہو تو نہایت دلسوزی سے حقیقی معذوری بتا دی جائے اور اگر کسی درجے میں کوئی بدل فراہم ہو سکے تو انتظام کر دیا جائے۔ امید ہے بچہ مطمئن ہو جائے گا۔اس ضمن میں سختی نہ کی جائے۔ ورنہ نظر بچا کر ناجائز اور ناپسندیدہ طریقہ اختیار کرنے کا اندیشہ رہے گا اور وہ آپ سے متنفر بھی ہو جائے گا۔

☆ یہ بات بچوں کو ابتداء ہی سے ذہن نشین کرائی جائے کہ دنیا میں کسی کی بھی تمام خواہشات پوری ہو نہیں سکتیں اور نہ ہر خواہش کی تکمیل کا ہر وقت امکان ہوتا ہے۔ جنت ہی میں ایسا ہو سکے گا۔ دنیا میں تو خواہشات کی راہ میں طرح طرح کی حد بندیاں ہیں۔ان سب کا لحاظ خود ہمارے اپنے مفاد میں بہت ضروری ہے۔اگر خواہشات پر قابو نہ ہو تو انسان کو بڑی تکلیف ہوتی ہے اور وہ گر کر حیوان کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے بلکہ ان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے اس لیے ضبط نفس کی بڑی اہمیت ہے۔ فرض ونفل عبادات خصوصاً نماز روزے اس کا بہترین ذریعہ ہیں۔ جو بچے اس عمر کو پہنچ جائیں کہ پابندی کر سکتے ہوں، ان کو آمادہ کیا جائے کہ روزانہ وہ اپنی کسی ایک ایسی جائز خواہش کو بھی جس کی تکمیل آسان ہو۔تھوڑی دیر کے لیے

موخر کر دیا کریں۔ مثلاً پیاس لگی ہے۔ درس چھوڑ کر پانی پینے نہیں جائیں گے بلکہ گھنٹہ بجنے پر پئیں گے۔ وقفہ میں جیب خرچ سے مٹھائی لینے کو جی چاہتا ہے اس کے بجائے سنترہ لیں گے وغیرہ۔ بچوں کی عمر اور استعداد کے مطابق ابتدا ہی سے خواہشات پر بتدریج قابو پانے کی مشق کرائی جائے۔ اس طرح وہ رفتہ رفتہ قابو پانا سیکھ جائیں گے اور شخصیت پر برے اثرات بھی نہیں پڑیں گے۔ مقابلے اور مسابقت کی اسپرٹ پیدا کر کے بھی یہ کام بعض صورتوں میں بطور کھیل بھی کرائے جاسکتے ہیں۔

☆ بچوں کی فطری خواہشات کی تکمیل میں یکا یک بہت زیادہ رکاوٹ نہ ڈالی جائے بلکہ رفتہ رفتہ ان پر قابو پانے کی تربیت دی جائے۔ مثلاً آپ بازار جاتے ہیں، بچہ ساتھ ہوتا ہے۔ پھل مٹھائیاں آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ وہ کچھ لینا چاہتا ہے۔ آپ اپنی بساط کے مطابق اس کے لیے کچھ خرید دیتے ہیں۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ چیز ہاتھ میں آتے ہی منہ میں پہنچ جائے۔ سڑکوں پر کھڑے کھڑے کھانا آپ کو پسند نہیں۔ آپ بچے کو سمجھا دیجیے کہ ایسا کرنا ٹھیک نہیں، تھوڑی دیر صبر و ضبط سے کام لے اور کہیں اطمینان سے بیٹھ کر کھائے۔ ابتدا میں زیادہ دیر آزمائش میں نہ ڈالیے کیونکہ اس کا دل برابر اس چیز میں لگا رہے گا اور وہ زیادہ دیر تک صبر نہ کر سکے گا۔ اس لیے جلد ہی اسے کسی اطمینان کی جگہ پہنچا دیجیے تاکہ وہ اپنی خواہش کی تکمیل کر لے اور بڑا ہو تو اتنی دیر صبر کرایئے کہ گھر پہنچ کر اطمینان سے کھائے۔ پھر رفتہ رفتہ بہن بھائیوں کو شریک کرنے اور مل بانٹ کر کھانے پر آمادہ کیجیے اور خریدتے وقت بتا دیجیے کہ اس میں سب کا حصہ ہے، پھر روزانہ کے بجائے ناغے دے کر چیزیں دلوایئے اور عمر کے ساتھ یہ ناغے بڑھاتے جایئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ بچے خواہشات پر قابو حاصل کرنا سیکھ لیں گے۔

☆ نفس کے بہرحال اپنے حقوق ہیں۔ جائز حدود میں ان کی ادائیگی ضروری ہے۔ ضبط نفس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ رہبانیت اختیار کر لی جائے بلکہ نفس کو خواہشات کا غلام بنانے اور

خواہشات کو الٰہ کا درجہ دینے کی ممانعت ہے، کوشش یہ کرنا ہے کہ خواہشات ہمیشہ نفس کے تابع رہیں تاکہ ان کی تکمیل جائز اور مناسب طریقے سے ہوا کرے۔ خواہشات کو بالکل کچل دینے کا بھی فطرت زبردست انتقام لیتی ہے۔

☆ بھوک مٹانے، جان بچانے، فوقیت جتانے یا بڑا بننے نیز جنس وملکیت کی خواہشات بڑی زوردار ہوتی ہیں۔ ان کو پورا کرنے کے لیے انسان نہ جانے کیا کیا کر گزرتا ہے۔ ان پر قابو نہ ہو تو بے راہ روی کے زیادہ امکانات اور اندیشے رہتے ہیں۔ مختلف اخلاقی معائب انہی کے ضمن میں بھٹکنے سے جڑ پکڑتے ہیں۔ جھوٹ، چوری، غیبت، حرص، خودغرضی، مکروفریب رشوت، غبن، سود، سٹہ، چور بازاری وذخیرہ اندوزی، خوشامد، ضمیر فروشی، دوسروں کے سامنے جھکنا، فضول خرچی ومردم آزادی، شہوت رانی کی متعدد شکلیں وغیرہ کے پیچھے یہی کام کرتی ہیں۔ اس کے برعکس یہی خواہشات مفید کاموں اور نمایاں کارناموں کے لیے انسان سے زبردست جدوجہد کراتی ہیں۔ دنیا میں جتنے یادگار کارنامے سرانجام پاتے ہیں۔ ان کی پشت پر بھی عموماً یہی خواہشات کارفرما رہتی ہیں۔ اس لیے ان کی تربیت پر خاص طور سے توجہ دینی چاہیے اور انہیں کچلنے کے بجائے ان پر قابو پانے اور ان کو صحیح رخ پر لگانے کی کوشش کرنی چاہیے، مثلاً:

۱۔ اپنی بساط بھر کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، کھیلنے کودنے میں بچوں کی خواہشات کا لحاظ رکھا جائے اور معذوریوں کی صورت میں دل سوزی سے سمجھا دیا جائے۔ نیز ان کی سہار سے زیادہ انہیں آزمائش میں مبتلا نہ کیا جائے اور نہ جائز خواہشات پر بہت زیادہ پابندیاں عائد کی جائیں۔

۲۔ موت کا ڈر بچوں میں بڑوں کی نقل میں پیدا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں خود بھی ایمان مضبوط رکھا جائے اور بچوں کو بھی بخوبی ذہن نشین کرا دیا جائے کہ موت وحیات اور رزق رسانی اللہ نے خالصتاً اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ ان میں کسی اور کا بس نہیں چل سکتا۔ اسے سمجھانے کے لیے کہانیوں اور واقعات سے مدد لی جائے اور اپنے قول اور عمل سے شہادت دی جائے۔

۳۔ شرم وحیا اور غیرت وندامت کے فطری جذبات کو مردہ نہ ہونے دیا جائے بلکہ انہیں زیادہ سے زیادہ بیدار رکھا جائے۔ یہ زبردست ہتھیار ہیں جو حالات کا پامردی سے مقابلہ کرنے اور آزمائشوں میں پورا اترنے میں بڑے معاون اور مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ ڈانٹ پھٹکار، مار پیٹ اور دوسروں کے سامنے شکایت یا توہین کرنے سے یہ جذبات مردہ ہوجاتے ہیں۔اس ضمن میں پوری احتیاط کی جائے۔

۴۔ گھر کے ایک حصے میں تھوڑی سی جگہ اور ایک صندوق یا الماری وغیرہ بچے کے لیے مخصوص کر دی جائے جس پر تنہا اس کا تصرف ہو اور جہاں وہ اپنی چیزیں ترتیب، سلیقے اور حفاظت سے رکھ سکے۔ وقتاً فوقتاً جو پیسے ملیں انہیں کفایت سے خرچ کرنے ،اس میں سے کچھ بچا کر مفید اشیاء خریدنے یا کسی کو کچھ تحفہ وغیرہ دینے پر صرف کرنے کی ترغیب دی جائے۔ کبھی کبھی بچوں کے ہاتھوں سے معذوروں اور مسکینوں کی امداد کرائی جائے اور خدمت خلق کے کچھ کام کرائے جائیں۔

۵۔ کچھ اور بڑے ہوں تو چھوٹے بہن بھائیوں یا گھریلو جانوروں کی دیکھ بھال کا کچھ کام ان کے سپرد کیا جائے۔ عنفوان شباب میں ان کے علاوہ ہلکے پھلکے مفید اور دلچسپ مشاغل میں مصروف رکھنے کا اہتمام کیا جائے۔ بری صحبت، سینما بینی اور فحش لٹریچر کے مطالعہ سے روکا جائے، دوستی کے لیے اچھے احباب اور مطالعے کے لیے اصلاحی ومعاشرتی ناول، سیرت النبیؐ سیر انبیاء وصلحا اور مشاہیر کے سوانح حیات اور کارناموں پر مشتمل کتب بطور بدل فراہم کی جائیں۔ خوشنما چیزیں بنانے، آرٹ کرافٹ، سینے پرونے یا دوسری دستکاریوں میں مہارت پیدا کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ان سے جنسی خواہش کی تسکین کا جائز راستہ حاصل ہوجائے گا۔ بالغ ہونے کے بعد شادی میں جلدی کی جائے اور جب تک اس کا اہتمام نہ ہو نفلی عبادات خصوصاً روزے رکھنے، تلاوت کرنے اور شریعت کے اسرار سمجھنے میں معاون کتب کے مطالعہ کی ترغیب دی جائے۔ان سے خواہشات پر قابو پانے میں مدد ملے گی۔

باب ۱۳:

والدین اور تربیت

قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم:٦)

''اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو (جہنم کی) آگ سے بچاؤ۔''

اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ (بخاری)

''یادرکھو! تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی۔''

بچوں کے بناؤ بگاڑ پر سب سے زیادہ اثر انداز والدین ہوہوتے ہیں کیونکہ بچوں کی شخصیت میں وہی رنگ وروغن بھرتے ہیں۔شکل وصورت کی طرح ان کے اخلاق وعادات، خیالات ومعتقدات، جذبات ومیلانات تک پر والدین ہی کا پرتو پڑتا ہے۔ بچے جو کچھ والدین خصوصاً ماں کی گود میں سیکھ لیتے ہیں، ساری زندگی اس کی گہری چھاپ برقرار رہتی ہے۔اسی لیے تربیت کی اصل ذمہ داری انہی پر ڈالی گئی ہے اور اس ضمن میں براہ راست اور سب سے زیادہ انہی سے باز پرس بھی ہوگی۔

ذمہ داریاں:

والدین کو چاہیے کہ:

☆ پیدا ہونے کے بعد بچہ کو صاف ستھرا کر کے اس کے کانوں میں اذان دیں۔

☆ اچھا سا نام رکھیں۔

☆ ساتویں دن عقیقہ کریں۔(بشرط استطاعت)

☆ شفقت وکشادہ دلی سے اسے پالیں، پوسیں۔

☆ حلال اور طیب روزی سے اس کی پرورش کریں۔
☆ کھیلنے اور خوش رہنے کے کافی مواقع دیں۔
☆ پیار محبت سے آداب وسلیقے سکھائیں۔
☆ پانچ چھ سال کا ہو تو شفیق اور صاحب کردار معلمین کے حوالے کر کے بتدریج علم وہنر سکھائیں۔
☆ کھانے کھیلنے، نہانے دھونے، کام اور آرام کرنے کا ایسا پروگرام بنائیں جو صحت وبالیدگی میں معاون ہو۔
☆ رفتہ رفتہ اس پروگرام کا خوگر اور معمولات کا پابند بنائیں۔
☆ سات سال کا ہو تو نماز پر اکسائیں۔
☆ دسویں سال اس کا بستر الگ کر دیں۔
☆ بارھویں سال سے اس کی حرکات وسکنات پر پوری نظر رکھیں۔
☆ غلطیوں اور کوتاہیوں کے صحیح اسباب کا پتہ لگا کر ازالے کی فکر کریں۔
☆ عام طور پر اپنا رویہ نرم اور مشفقانہ رکھیں۔
☆ حتی الامکان عفو ودرگزر سے کام لیں۔
☆ ناگزیر ہو تو سزا سے بھی گریز نہ کریں لیکن جلد ہی حسن سلوک سے اس کی تلافی کر دیا کریں۔
☆ اور بڑا ہو تو بہادری، پامردی اور مقابلے کے فنون سکھائیں۔
☆ لڑکے کو کسی جائز باعزت پیشے اور لڑکی کو امور خانہ داری کی ٹریننگ دیں۔
☆ بالغ ہونے پر شادی میں جلدی کریں۔

تربیت:

بچوں کی تربیت کے ضمن میں والدین کو مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کرنا چاہیے:

☆ گھریلو ماحول کو پاکیزہ بنائیے اور حتی الامکان اسے کشیدگی، بے اطمینانی اور کشمکش سے پاک رکھئے۔

☆ بچوں کے سامنے قابل تقلید اسوہ پیش کیجئے۔

☆ حتی الامکان بچوں کی ناز برداری کیجئے اور ان کی جائز خواہشات کو نہ ٹھکرائیے۔

☆ لیکن انہیں گڈا یا گڑیا بنا کر نہ رکھئے۔

☆ اور نہ لاڈ پیار سے انہیں نکما اور خراب ہونے دیجئے بلکہ خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور اپنی اشیا کی ترتیب وحفاظت کی ذمہ داری حتی الامکان بچے کو خود اٹھانے دیجئے۔

☆ بچوں کو پیار بھرے الفاظ سے ضرور یاد کیجئے مگر للہ نام نہ بگاڑیئے اور نہ کسی کو بگاڑنے دیجئے۔

☆ ہمیشہ اچھے الفاظ سے خطاب کیجئے اور سلام میں بھی پہل کی کوشش کیجئے۔

☆ ان کے سامنے آپس میں تو تو میں میں نہ کیجئے اور نہ ان سے ایک دوسرے کی شکایت کیجئے۔

☆ نادان سمجھ کر ان کے سامنے خصوصی ازدواجی تعلقات کا مظاہرہ ہرگز نہ ہونے دیجئے۔ اول تو یہ بے شرمی کی بات ہے۔ دوسرے اس سے آپ کا رعب، وقار اور احترام ختم ہو جائے گا۔ نیز بچوں کے اندر قبل از وقت جنسی تجسس ابھر کر ہو سکتا ہے انہیں غلط کاریوں میں مبتلا کر دے۔

☆ اپنے طرز عمل سے بچوں کو محسوس کرا دیجئے کہ آپ دونوں خود ایک دوسرے کا اور تمام بچوں کا بہت زیادہ لحاظ وخیال رکھتے، خلوص ومحبت سے پیش آتے اور آرام وآسائش کی فکر کرتے ہیں۔

☆ بچوں میں باہمی رقابت نہ پیدا ہونے دیجئے۔ سب کو ایک نظر سے دیکھئے۔ ہر ایک کے ساتھ یکساں شفقت کا برتاؤ کیجئے۔ کھانے کپڑے اور دیگر ضروریات کی فراہمی میں کسی کے

ساتھ ترجیحی سلوک روانہ رکھئے ،ایک کی کامیابی کو دوسرے کے احساس ندامت کے لیے ہرگز نہ استعمال کیجئے ،اس سے فائدے کے بجائے الٹا نقصان ہوتا ہے اور بچوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت ،بغض وعداوت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں جو عموماً زندگی بھر کے لیے جڑ پکڑ لیتے ہیں۔

☆ بچوں کو آپس میں میل محبت سے رہنے ،مل جل کر کھیلنے ،مل بانٹ کر کھانے اور ایک دوسرے کا خیال رکھنے کی تلقین بھی کیجئے اور ان چیزوں کے لیے برابر مواقع فراہم کرتے رہیے۔ کبھی آپس میں بدمزگی ہو جائے تو جلد از جلد صلح صفائی کرا دیجئے۔

☆ گھر کی مختلف چیزوں کو مناسب طریقے سے استعمال کرنے ،چیزیں اجازت سے اٹھانے اور استعمال کے بعد ان کی متعین جگہوں پر رکھ دینے ،اجازت لے کر کہیں آنے جانے اور مختلف کام مقررہ وقت پر انجام دینے وغیرہ سے متعلق کچھ آسان اور مختصر ضوابط بنا کر بچوں کو بخوبی سمجھا دیا کیجئے اور ان کی خود بھی پابندی کیجئے اور ان سے بھی کرائیے۔اس سے بچوں کو سلیقہ آئے گا اور گھر بھر کو سہولت ہوگی۔بچوں کو من مانی کرنے کے لیے بالکل آزاد چھوڑ دینا خود ان کے لیے بھی تباہ کن ہے اور دوسروں کے لیے بھی دردسری کا موجب۔

☆ آپ دونوں ایک دوسرے کے ادب واحترام اور اطاعت وخدمت کے لیے بچوں کو برابر توجہ دلاتے رہیے۔باپ کے لیے ماں اور ماں کے لیے باپ برابر اکساتا رہے۔

☆ کھیل کود اور بچگانی حرکات پر بہت زیادہ روک ٹوک نہ کیجئے اور نہ ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ سے زیادہ کام لیجئے ورنہ بغاوت اور گھر سے فرار کا رجحان پیدا ہوگا۔

☆ بچوں سے کبھی نہ تو جھوٹی بات کہیے اور نہ جھوٹا وعدہ کیجئے۔یہ گناہ بھی ہے اور آپ پر سے اس کا اعتماد اٹھ جائے گا۔

☆ کوتاہیوں پر حتی الامکان ضبط وتحمل اور عفو ودرگزر سے کام لیجئے۔

☆ اصلاح کی طرف سے نہ تو مایوس ہو جائیے اور نہ بچوں کو مایوس ہونے دیجئے۔

☆ غلطیوں پر سزا دینی ناگزیر ہو تو تنہائی میں دیجیے اور تنہائی میں سمجھائیے۔ سب کے سامنے نہ ٹوکیے اور نہ سزا دیجیے۔

☆ ہمجولیوں سے ملنے کے مواقع دیجیے۔ البتہ ان کے عادات واطوار کی طرف سے اطمینان کر لیجیے۔

☆ ان کے ساتھیوں کی عزت کیجیے۔ کبھی کبھی انہیں گھر پر لانے کے لیے کہیے اور ان کی خاطر تواضع کا اہتمام کیجیے۔

☆ ساتھیوں کے سامنے کبھی سزا نہ دیجیے اور نہ توہین کیجیے۔

☆ ملنے جلنے والے یا مہمان آئیں تو اپنے بچوں کی خامیوں کا رونا نہ روییے بلکہ ان کی خوبیوں کا تعارف کرائیے۔

☆ ان کی عمر اور صلاحیت کے مطابق ان پر کوئی نہ کوئی ہلکی پھلکی گھریلو ذمہ داری ضرور ڈالئے اور خوش اسلوبی سے انجام دینے پر شاباشی دیجیے۔ اچھے کاموں پر دل کھول کر سراہیے۔ اس سے ہمت بندھتی، چستی، دل جمعی اور خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

☆ رفتہ رفتہ سادہ زندگی اور محنت ومشقت کا عادی بنائیے لیکن کوئی کام سزا کے طور پر یا بے گار سمجھ کر نہ لیجیے بلکہ خوشی خوشی اور کھیل کھیل میں انجام دلوائیے۔

☆ کوئی حکم دیتے وقت ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا لیجیے تاکہ نافرمانی یا حکم عدولی کا اندیشہ نہ رہے۔ بار بار حکم نہ دیجیے، متعین الفاظ میں حکم دیجیے۔ آپ کے الفاظ سے تذبذب کا اظہار نہ ہو، ورنہ حکم عدولی کے لیے بچہ معذور ہوگا۔

☆ کوئی کمزوری سرزد ہو جائے یا کبھی سزا ملی ہو تو اسے بار بار یاد نہ دلائیے اور نہ دوسرے بھائی بہنوں کو طعنہ دینے کا موقع دیجیے۔

☆ بچوں کو کھل کر اظہار خیال کا موقع دیجیے۔ ان کے سوالات کے اطمینان بخش جواب دینے کی کوشش کیجیے۔

☆ ان کے معاملات میں ان سے مشورہ کرلیا کیجئے اور کبھی کبھی رہنمائی کر کے انہیں خود فیصلہ کرنے دیجئے۔

☆ ملنے جلنے والوں یا اعزہ واقارب کے یہاں کبھی کبھی بچوں کو ساتھ لے جایا کیجئے۔

☆ مہمانوں کی خاطر تواضع میں بچوں سے مدد لیجئے۔اس طرح ان کی معاشرتی تربیت بھی ہوگی اور وہ سلیقہ بھی سیکھیں گے۔

☆ تقریبات اور تہواروں وغیرہ میں بچوں کو ان کی استطاعت کے مطابق عملی حصہ لینے کا موقع دیجئے۔

☆ اجتماعی امور خصوصاً خدمت خلق اور رفاہی کاموں میں خود بھی پیش پیش رہیے اور بچوں کو بھی حصہ لینے پر اکسایئے۔ان کاموں میں خود آپ کی دلچسپیاں ان کے لیے محرک ثابت ہوں گی۔

☆ نگرانی رکھ کر روپیہ خرچ کرنے اور اپنے نیز گھر کے لیے سودا سلف خرید لانے کے مواقع دیجئے۔

☆ انہیں تاریخ، اخلاقی کہانیاں، مشاہیر کے کارنامے، نصیحت آموز واقعات، برابر سناتے رہیے۔بچپن میں ان کا بہت اثر ہوتا ہے اور وعظ وتلقین کے مقابلے میں یہ طریقہ اخلاق کو سنوارنے، پاکیزہ تصورات اور اعلیٰ نصب العین بنانے میں زیادہ کارگر ہوتا ہے۔

☆ اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، کھانے پینے، ملنے جلنے، بات چیت کرنے، دوسروں کو کوئی چیز پیش کرنے یا ان سے کچھ قبول کرنے وغیرہ کے ضمن میں مہذب طور طریقے سکھایئے۔

☆ بھول چوک یا نقصان ہو جانے پر معافی مانگ لینے اور احسان پر شکریہ ادا کرنے کا عادی بنایئے۔

☆ ابتدا ہی سے مختلف مواقع کے اذکار وکلمات کی ادائیگی پر اکسایئے اور خود بھی اس کی پابندی کیجئے۔مثلاً بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرنا۔کھا پی چکنے، چھینک آنے یا مزاج پوچھنے پر

الحمدللہ کہنا، کسی سے کچھ ملنے یا فائدہ پہنچنے پر جزاک اللہ کہنا مسجد میں داخل ہوتے اور نکلتے وقت دعائیں پڑھنا وغیرہ۔

☆ حضرات انبیا علیہم السلام، صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین بزرگان دین رحمہم اللہ علیہم کا عزت کے ساتھ نام لینے کا طریقہ سکھایئے۔

یہ سب اسی وقت ہوگا جب آپ دونوں خود بھی نمونے کا کردار رکھتے ہوں۔ بچے زبانی نصیحتوں سے کہیں زیادہ بڑوں کے عمل سے غیر شعوری اثر لیتے ہیں اور یہی اثرات زیادہ مستحکم اور دیرپا ہوتے ہیں۔ آخری لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی خیر وصلاح اور فلاح دارین کے لیے بارگاہ ایزدی میں گڑگڑا کر برابر دعا کرتے رہیے۔ کیونکہ کوششوں میں برکتوں کا انحصار خالصتاً اسی کی مرضی پر موقوف ہے۔

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا.

(الفرقان:۷۴)

”اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے (دل کا چین) اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔“

............☆☆☆............

باب ۱۴:

مربی اور تربیت کے اصول

والدین اگر خود تربیت نہ کر سکتے ہوں تو بچوں کی تربیت کسی مناسب اتالیق یا مربی کے سپرد ہونی چاہیے۔ بحیثیت اتالیق ایک فرد اسی وقت اپنا کام بحسن وخوبی انجام دے سکتا ہے جب وہ والدین کا مناسب بدل ثابت ہو کیونکہ بچے اس شخص کی اصلاحی کوششوں کا اثر قبول کرتے ہیں۔

ا۔ جسے وہ اپنا ہمدرد و بہی خواہ سمجھتے ہوں اور جس کے احسانات، ایثار اور حسن سلوک کا انہیں ذاتی تجربہ ہو۔

ب۔ جس کو بچوں سے طبعی لگاؤ ہو۔

ج۔ جو خوش مزاج ہو اور جائز حدود میں بچوں کی دلچسپیوں اور فطری تقاضوں کی پوری رعایت رکھتا ہو۔

د۔ جس کی تولیت میں بچے اپنے کو ہر طرح سے محفوظ اور جس کی صحبت میں اپنے کو مسرور پاتے ہیں۔

ہ۔ جو بچوں کی خوبیوں اور اچھے کاموں کو کھل کر سراہتا ہو اور کوتاہیوں پر گرفت اور تنقید میں بہت زیادہ محتاط ہو۔

و۔ جو انہیں اپنے اعتماد میں لے سکے اور ان سے جو وعدے کرے انہیں پورا کرے۔

ز۔ جو ان کی ننھی منی الجھنوں اور پریشانیوں کو پوری توجہ سے سن کر اور ہمدردی سے ان پر غور کر کے انہیں دور کرنے میں بچوں کی امداد کر سکے۔

ح۔ جو متحمل مزاج اور بردبار ہو اور عفو و درگزر سے کام لے۔

ط۔ جو بچوں کی خودداری اور عزت نفس کا پورا لحاظ رکھے۔

ی۔ جو خود فرض شناس، اصول کا پابند اور جذبات پر قابو رکھنے والا ہو۔

ک۔ جس کے قول وفعل میں پوری مطابقت ہو۔

ایک مربی، اتالیق یا اچھے معلم میں جب تک مندرجہ بالا اوصاف نہ ہوں گے وہ تربیت کا کام اچھی طرح انجام نہ دے سکے گا۔

مربی کا رویہ:

علاوہ ازیں تربیت کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دینے کے لیے مربی کو اپنے رویے میں بھی اصلاح کرنی ہوگی۔

☆ بچے کے لیے اپنے اندر محبت، ہمدردی ودل سوزی کے جذبات پیدا کرنے ہوں گے۔

☆ اس کی کوتاہیوں کی چبھن محسوس کر کے ازالے کی فکر کو اپنا فریضہ سمجھنا ہوگا۔

☆ دل میں اس کی اصلاح کا صحیح جذبہ پیدا کرنا اور پرخلوص کوششوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنی اور اپنے بچے کی ہدایت کے لیے دعا کرتے رہنا ہوگا۔

☆ اصلاح کی طرف سے مایوسی سے خود بھی بچنا ہوگا اور بچے کو بھی محفوظ رکھنا ہوگا۔ بچہ بہر حال بچہ ہے اس سے بہت زیادہ یا بہت اونچی توقعات وابستہ کر لینے سے بھی مایوسی ہوتی ہے۔ کیونکہ طفلانہ حرکات بچوں سے بہر حال سرزد ہوں گی، توقعات اونچی ہوں گی تو ایسی حرکات سے مایوسی ہوگی اس لیے اس سے گریز کرنا ہوگا۔

☆ حتی الامکان حسن ظن سے کام لینا ہوگا کیونکہ بچہ کو جیسا سمجھا جاتا ہے۔ ویسا ہی وہ بنتا ہے، مگر اس کے معنی احتیاط ونگرانی کی طرف سے غفلت ہرگز نہیں ہے بلکہ سوءظنی، تجسس اور عیب چینی سے گریز ہے۔

☆ بچے کی عزت نفس، غیرت اور خودداری کا پاس ولحاظ کر کے تمسخر، استہزا، طعن وتشنیع، لعنت ملامت وغیرہ سے گریز کرنا ہوگا۔

☆ حاکم عدالت کے بجائے مصلح اخلاق کا رویہ اپنانا ہوگا۔ یعنی ماضی کی خطاؤں پر سزا دے کر مطمئن ہو جانے کے بجائے اصل اسباب و محرکات کا پتہ لگا کر ان کے ازالے کی فکر و تدبیر کرنی ہوگی تا کہ مستقبل میں ان کوتاہیوں کا اعادہ نہ ہو۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ آیندہ کے لیے صدق دل سے توبہ کرالی جائے۔

جب تک مربی خود اپنی اصلاح کی طرف توجہ نہ دے گا اور اپنے رویے میں مناسب تبدیلی نہ کرے گا۔ بچوں کی اصلاح و تربیت کے ضمن میں اس کی کوششیں ہرگز بارآور نہ ہوں گی۔

تربیت کے طریقے:

۱۔ زیر تربیت بچوں کی عملی، اخلاقی، ذہنی اور جسمانی حالت کا جائزہ لے کر نمایاں خوبیوں اور خامیوں کا ایک چارٹ مرتب کیا جائے۔

۲۔ بچوں کی عمر، گھریلو حالات، افراد خاندان اور بچے کے ساتھ ان کے برتاؤ، قریبی ماحول کی مفصل کیفیت، ہمجولیوں کے عادات و اطوار اور دلچسپیوں کے متعلق ضروری معلومات فراہم کی جائیں۔

۳۔ مندرجہ بالا معلومات کے بعد بچے کی عمر اور ذہنی و جسمانی حالت کا لحاظ کر کے چند بنیادی خوبیوں اور خامیوں کو متعین کیا جائے اور بتدریج خوبیوں کو اجاگر اور خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

۴۔ خامیوں کے بعض بنیادی اسباب و محرکات یا کچھ حقیقی معذوریاں ہوتی ہیں۔ دقت نظری سے ان کا پتہ لگا کر ان کے ازالے کی فکر کی جائے تا کہ اصلاح پائیدار اور بنیادی ہو۔

۵۔ تنہائی میں بچے کی خوبیوں کو سراہتے ہوئے احتیاط سے کوتاہیوں کی نشاندہی کی جائے اور ان پر قابو پانے کے لیے بچے کی خود اعتمادی اور قوت ارادی کو ابھارتے ہوئے مناسب تدابیر بتائی جائیں۔

۶۔ کوتاہیوں کی نشان دہی در حدیث دیگراں ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ ذہین اور حساس بچے اس

طرح زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور آسانی سے مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

۷۔ دوسروں کے سامنے بچے کی تنقیص، شکایت یا بے جا تنقید ہرگز نہ کی جائے اور نہ کوتاہیوں کا ڈھنڈورا پیٹا جائے، اس سے اصلاح کی بجائے بے غیرتی اور غلطیوں پر اصرار کی عادت پیدا ہوتی ہے۔

۸۔ دوسروں کے سامنے بچوں کی صرف خوبیوں کا تذکرہ کیا جائے اور اچھے کاموں پر شاباشی دی جائے اس سے خود اعتمادی بڑھتی اور کمزوریوں پر قابو پانے کی سکت پیدا ہوتی ہے۔

۹۔ تعمیری اخلاق کی نشوونما اور ناپسندیدہ حرکات سے محفوظ رکھنے کے لیے بچوں کی عمر اور دلچسپیوں کی مناسبت سے کھیل، ہابیز، بیرون نصاب مصروفیات ومشاغل، کلب و جمعیۃ سازی وغیرہ کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں۔

۱۰۔ طفلانہ شوخیوں کے لیے گنجائش دی جائے اور نادانی کے باعث ہونے والی ناپسندیدہ حرکات پر سخت گرفت کرنے کے بجائے سمجھا بجھا کر معاف کر دیا جائے۔ ایک بار جو غلطی ہو گئی ہو، اسے بار بار یاد نہ دلایا جائے۔

۱۱۔ بارہ سال سے کم عمر طلبہ عموماً خشک پند و نصائح اور اخلاقی لیکچروں سے کم ہی متاثر ہوتے ہیں بلکہ بسا اوقات ردعمل الٹا اور شدید ہوتا ہے۔ اس کا لحاظ رکھا جائے۔

۱۲۔ لیکچر پلانے کے بجائے پسندیدہ عادات ڈلوانے اور عملاً طور طریقے اور آداب سکھانے کی کوشش کی جائے۔ تقلید کے لیے اچھا اسوہ پیش کیا جائے۔

۱۳۔ اخلاقی تعلیم کہانیوں، چٹکلوں، انبیاء صلحائے امت اور مشاہیر کے واقعات کو دل کش انداز میں پیش کر کے دی جائے۔

۱۴۔ شاندار مستقبل میں یقین پیدا کرایا جائے اور کوشش کی جائے کہ مایوسی پاس نہ پھٹکنے پائے۔

۱۵۔ بچوں سے برتاؤ میں شفیق معلم اور مستبد حاکم کے فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جائے اور ان کی حرکات وسکنات کو انہی کے معیار سے ناپا جائے۔

باب ۱۵:

عادتیں اور طور طریقے

ہم اپنے کردار کا جائزہ لیں تو وہ متعدد عادتوں کا ایک پلندہ نظر آئے گا۔ ان میں کچھ تو پسندیدہ ہوں گی، کچھ ناپسندیدہ۔ ہمارے عادات واطوار ہی دراصل ہماری سیرت وکردار کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور انہی کی بنیاد پر ہمارے بھلے یا برے ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔ اگر ہمارے عادات واطوار بحیثیت مجموعی پسندیدہ ہوتے ہیں تو ہمارا شمار اچھے آدمیوں میں ہوتا ہے ورنہ برے آدمیوں میں۔

عادتیں کیا ہیں؟

فطری خواہشات اور جبلی تقاضوں کی تکمیل کے لیے ہم بچپن ہی سے ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ جب کوئی کام ہم کسی خاص طریقے سے کر لیتے ہیں اور اس سے ہماری کوئی بنیادی خواہش بھی پوری ہو جاتی ہے تو اسی قسم کے حالات رونما ہونے کی صورت میں ہم وہی کام پہلے کے مقابلے میں زیادہ سہولت سے کر گزرتے ہیں۔ اس طرح بار بار کرنے سے ہم اس کام کے خوگر ہو جاتے ہیں یعنی اس کے کرنے کے لیے ہمارے اندر مستحکم میلان پیدا ہو جاتا ہے۔

کسی کام کو کسی خاص ڈھنگ سے بار بار کرنے کے اسی میلان کو ''عادت'' کہتے ہیں۔

عادتیں بذات خود تو فطری نہیں ہوتیں لیکن ہر عادت کی اساس کوئی نہ کوئی جبلت، بنیادی خواہش یا فطری داعیہ ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے مستحکم ہونے کے بعد عادتیں بڑی مشکل سے چھوٹتی ہیں۔

جبلتیں یا فطری داعیات ہوتے تو نوعی ہیں اور تمام افراد میں پیدائشی طور پر یکساں پائے جاتے ہیں لیکن چونکہ ان کے اظہار کے طریقے، تقلید، تجربے، تربیت اور عقل وفہم کی وجہ سے مختلف

ہو جاتے ہیں اور یہی طریقے رفتہ رفتہ مستحکم ہو کر عادات واطوار بن جاتے ہیں، اس لیے مختلف لوگوں کے عادات واطوار اور سیرت وکردار میں یکسانیت کے بجائے شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔

عادتوں کے متعلق واضح رہے کہ:

☆ یہ وہبی یا فطری نہیں ہوتیں بلکہ کسبی ہوتی ہیں۔ پیدائشی طور پر نہیں ملتیں بلکہ ماحول کے اثر سے پڑتی ہیں۔ دوسروں کے ذریعے ڈلوائی جاتی ہیں۔ یا اپنی خواہش سے ڈال لی جاتی ہیں۔

☆ فطری تو نہیں ہوتیں لیکن جب بار بار کی مشق سے مستحکم ہو جاتی ہیں تو مشکل سے چھوٹتی ہیں۔ فطری خواہشات کی طرح ان میں بھی بے حد کشش ہوتی ہے اور ہم ان کے تابع ہو کر کسی کام کے کرنے پر تقریباً اسی طرح مجبور ہوتے ہیں جس طرح کسی فطری خواہش یا جبلی تقاضے کی تکمیل پر۔ اسی لیے عادتوں کو "فطرت ثانیہ" بھی کہا جاتا ہے۔

☆ عادات ڈلوانے یا ترک کرانے کا سب سے اچھا زمانہ بچپن ہی کا ہوتا ہے خصوصاً بارہ تیرہ سال کی عمر تک۔ بعد کے مراحل میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں اور بہت مستحکم ارادے کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆ کسی کام کی عادت پڑ جائے تو وہ بڑی آسانی سے ہونے لگتا ہے، ذہن پر نہ تو بار ڈالنا پڑتا ہے، نہ ارادہ کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ طبیعت پر جبر کرنا پڑتا ہے بلکہ پوری آمادگی تیزی اور مہارت کے ساتھ انجام پانے لگتا ہے۔

☆ کسی کام کے کر لینے ہی سے عادت نہیں پڑ جاتی بلکہ ہر عادت کے لیے مندرجہ ذیل چیزیں ضروری ہیں:

ا۔ تحریک:۔ یعنی کسی کام کو انجام دینے کے لیے آمادگی کیونکہ اس کے بغیر وہ کام پہلی بار بھی انجام نہ پا سکے گا چہ جائیکہ اس کا عادی ہونا۔

۲۔ اچھا تاثر:۔ یعنی اس کام کے انجام پانے پر مسرت تاکہ اسی مسرت کی خاطر اس کے اعادے کی خواہش ہو۔

۳ تکرار:۔ یعنی اس فعل کو بار بار کرنا۔ کیونکہ اعادے کے بغیر مشق و مہارت نہیں ہوگی۔

مندرجہ بالا میں سے کسی ایک کی بھی کمی ہوگی تو عادت ہرگز نہ پڑے گی کیونکہ اگر ایک کام کے لیے تحریک ہی نہ ہو یا اس کے کرنے سے کوئی خوشگوار نتیجہ ہی برآمد نہ ہو یا اس کے کرنے سے تکلیف پہنچ جائے یا اسے بار بار کرنے کا موقع ہی نہ مل سکے تو وہ ہرگز عادت نہ بن سکے گا۔ اسی لیے بسا اوقات آمادگی کے بغیر برسوں ایک کام کسی سے کرایا جاتا ہے، پھر بھی عادت نہیں بنتا اور خارجی دباؤ سے آزاد ہوتے ہی اس کے خلاف حرکات سرزد ہونے لگتی ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کئی کئی سال تک نماز کی پابندی کرنے والے بچے بھی بسا اوقات آزاد ہوتے ہی نمازیں ترک کر دیتے ہیں۔

عادتوں سے فائدے:

عادتیں اگر اچھی ہوں تو ان سے متعدد فائدے پہنچتے ہیں:

☆ ذہنی الجھنوں سے فرد محفوظ رہتا ہے۔ اچھے کام کرنے کے لیے نفس سے برابر جنگ نہیں کرنی پڑتی۔ روزانہ ہر فرد کو متعدد مواقع ایسے پیش آتے ہیں جب نفس کا تقاضا کچھ ہوتا ہے اور ایمان و اخلاق اور شرافت و انسانیت کا کچھ اور۔ اس کشمکش سے عہدہ برآ ہونا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اکثر افراد مات کھا جاتے ہیں۔ اگر اچھے کاموں کی عادت ہوتی ہے تو ایسی کشمکش کی نوبت کم ہی آتی ہے اور اگر کبھی آئے بھی تو بآسانی قابو پایا جا سکتا ہے۔

☆ حالات ناسازگار بھی ہوں تو بھی ایک فرد جو کسی اچھے کام کا عادی ہو اسے کر ہی لیتا ہے۔ مثلاً سفر کی صعوبتوں، علالت یا موسم کی شدت کے باوجود بروقت نماز کی ادائیگی، تنگ دستی کی صورت میں بھی دوسروں کی اعانت و خدمت، اپنے کو خطرے میں ڈال کر دوسروں کے کام

آنا وغیرہ۔غرض نفس کی سرکشی یا حالات کے دباؤ کو ایسا فرد زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

☆ عادتی افعال نہایت سہولت، مہارت اور سرعت سے انجام پاتے ہیں۔ چنانچہ دوسرے مفید کاموں کے لیے وقت کی بھی بچت ہوتی ہے۔ کام بھی اچھا ہوتا ہے اور زیادہ قوت اور توجہ بھی صرف نہیں کرنی پڑتی۔

☆ عادتوں کی وجہ سے قوت کارکردگی میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے، کیونکہ عادتی افعال میں تکان کم محسوس ہوتی ہے اور جدوجہد کم کرنی پڑتی ہے۔ عادت کے بغیر کوئی کام انجام دیا جائے تو بہت زیادہ جدوجہد کرنی پڑتی ہے اور فرد بہت جلد تھک بھی جاتا ہے۔ مثلاً مطالعہ کے لیے دیر تک بیٹھنا ہو یا محنت مشقت کا کوئی کام کرنا ہو۔ اگر عادت ہو تو گھنٹوں تکان محسوس نہیں ہوگی اور بغیر عادت کے تھوڑی دیر میں بیزاری کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔

☆ عادتی افعال انجام دیتے وقت ذہن کو کسی اور کام پر بھی لگایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس پر توجہ مرکوز رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور کام مشینی یکسانیت کے ساتھ انجام پاتا رہتا ہے۔ مثلاً سویٹر بنتے یا مشین پر کوئی کام کرتے وقت ہاتھ بھی چلتا رہتا ہے اور ذہن کوئی اچھی بات سوچنے، کسی کی باتیں سننے یا دوسروں کو کچھ زبانی بتانے میں مصروف رہتا ہے۔ بیڑی بنانے والے مزدوروں یا تکلی کاتنے والے طلبہ وغیرہ کو ان کاموں کے ساتھ ساتھ بہت کچھ زبانی بتایا جا سکتا ہے۔

اس طرح عادتوں کی وجہ سے بیک وقت دو دو کام انجام دیئے جا سکتے ہیں۔

تعلیم وتربیت میں عادات کی اہمیت:

عادتوں کے مندرجہ بالا فوائد سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے کہ اچھی عادات کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت ہے۔ بچپن ہی سے اگر پسندیدہ عادات ڈلوانے کی طرف توجہ دی جائے تو فرد کو ترقی کی منزلیں طے کرنے میں بہت سہولت ہو جاتی ہے۔ ایک بچہ جو وقت پر کھانے، کھیلنے،

سونے، جاگنے کا عادی ہو، مطالعے اور محنت مشقت کے کاموں پر پابندی سے وقت صرف کر سکتا ہو، پسندیدہ طور طریق اور مختلف مواقع کے آداب کا پابند ہو۔ اس کی صحت، اخلاق اور سیرت بھی درست ہوگی اور آگے بڑھنے، نیز ترقی کرنے کے اسے بیش از بیش مواقع بھی نصیب ہوں گے۔ وہ وقت، مہلت اور فرصت کی کمی کا رونا کبھی نہ روئے گا۔ اسے روزمرہ کے معمولات کی پابندی کے لیے طبیعت پر جبر نہ کرنا پڑے گا۔ اسی لیے پسندیدہ عادات واطوار کا حامل بنانے کی طرف غیر معمولی توجہ دی جاتی ہے۔

پسندیدہ عادات ڈلوانے کا طریقہ:

کسی بات کا عادی بنانے کے لیے:

☆ سب سے پہلے بچے کو سادہ اور عام فہم انداز میں قصے کہانیوں، پوسٹروں، تصویروں، واقعات ومکالمات اور مشاہیر کے سوانح حیات وغیرہ کی مدد سے اس عادت کے فوائد اہمیت اور ضرورت محسوس کرائی جائے، یہاں تک کہ وہ اپنی خواہش اور ارادے سے اس کے لیے آمادہ ہو جائے۔

☆ پھر مختصر اور متعین الفاظ میں یہ بات ذہن نشین کرائی جائے کہ اس ضمن میں کیا کیا مطلوب ہے اور وہاں تک پہنچنے کا آسان راستہ کیا ہے۔ مطلوب بآسانی کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟

☆ اس کے بعد بچے سے عہد لیا جائے، یہ عہد اگر اجتماعی ہو اور کئی بچوں سے یا پورے درجے سے ایک ساتھ لیا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ تحریک زوردار ہونی چاہیے تاکہ بچہ عمل پر مجبور ہو جائے۔

☆ پھر اس پر عمل اور بار بار مشق واعادے کے مواقع اور آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔

☆ ایک متعین مدت تک پوری توجہ سے مسلسل مشق کرائی جائے مگر مشق میں آمادگی اور مسرت کا لحاظ رہے۔ بہتر ہو کہ پسندیدہ عادات واطوار کے لیے ہفتے منائے جائیں۔

☆ عادات ڈلوانے کے دوران خلاف ورزی کا بالکل موقع نہ دیا جائے، اس کے لیے سخت نگرانی اور بروقت روک ٹوک کی ضرورت ہے۔

☆ مشق واعادہ اور تکرار کے پروگرام انفرادی کے بجائے اجتماعی ہوں تو کئی گنا زیادہ موثر ہوتے ہیں کیونکہ اس طرح تحریک مسرت اور سہولت تینوں مسئلے بیک وقت حل ہو جاتے ہیں، ایک سے دوسرے کو تقویت بہم پہنچتی ہے۔ اسلامی عبادات تزکیہ کے بہترین اور موثر ترین ذرائع اس لیے بھی ثابت ہوتی ہیں کہ پابندی وقت کے ساتھ اجتماعی طور پر ان کا ادا کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔

☆ فضا ایسی بنائی جائے کہ عمل کرنے میں آسانی و مسرت ہو اور خلاف ورزی میں دشواری اور تکلیف۔

☆ قریبی ماحول میں خلاف ورزی کے نمونے نہ ہوں۔

☆ مربی خود بھی ان عادات واطوار کا سختی سے پابند ہو اور اپنی سیرت وشخصیت سے بچوں کے لیے تقلید واثر پذیری کے مواقع فراہم کرے۔

☆ عادت ڈلوانے اور معمولات کا پابند بنانے کا ایسا منصوبہ تیار کیا جائے کہ ایک سے دوسری کو تقویت پہنچے۔ مثلاً نماز فجر کے بعد اسی وضو سے تلاوت کا اہتمام، وضو کے ساتھ دانت مانجھنے کی عادت وغیرہ۔

☆ پسندیدہ عادات واطوار اور نیک کاموں کے ضمن میں یہ بات واضح رہے کہ ان کے لیے چھٹی کا کوئی دن نہیں ہے۔ ان کا برابر مظاہرہ ہونا چاہیے۔ اگر اس طرف سے غفلت برتی جائے تو انحطاط شروع ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ سارے کیے دھرے پر پانی پھر جاتا ہے۔

پسندیدہ عادات واطوار:

مندرجہ بالا اصولوں کو ملحوظ رکھ کر بتدریج بچوں کو مندرجہ ذیل پسندیدہ عادات واطوار کا پابند بنایا جائے۔

☆ صفائی وطہارت کی پابندی خصوصاً جسم اور اس کے اعضاء کی صفائی (غسل کرنا، دانت

مانجھنا، ہاتھ دھونا، بال اور ناخن ترشوانا وغیرہ) لباس، بستر، عام استعمال کی اشیاء، تعلیمی سامان، درجہ، کمرہ، صحن اور نالیوں وغیرہ کی صفائی اور سامان کی ترتیب۔

☆ استنجا پاک کرنے کا طریقہ اور غسل خانے و پاخانے کا مناسب استعمال۔

☆ جلد سونا سویرے اٹھنا۔

☆ سلیقے سے وضو کرنا اور تعدیل ارکان کا لحاظ کر کے سلیقے سے نماز ادا کرنا۔

☆ وقت کی پابندی خصوصاً نماز، تلاوت، حاضری، کھیل، کھانے، اجتماعات، مطالعے اور ورزش وغیرہ میں۔

☆ سلام کرنا، مزاج پوچھنا اور حتی الامکان سلام میں پہل کرنا۔

☆ مناسب طریقے سے اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، کھڑے ہونا، بات چیت کرنا، کھانا، پینا، کپڑے پہننا، ٹوپی اوڑھنا وغیرہ۔

☆ سچ بولنا اور مختلف معاملات خصوصاً کھیل، امتحان اور روپے پیسے کے معاملے میں ایمان داری برتنا۔

☆ خندہ پیشانی سے غلطی کا اعتراف کر لینا اور بھول چوک پر معافی مانگ لینا۔

☆ بولنے، سوال کرنے، جواب دینے یا کوئی چیز لینے میں اپنی باری کا انتظار کرنا۔

☆ مفوضہ کام یا فرائض کو پابندی اور انہماک سے انجام دینا۔

☆ ٹولیوں میں تعاون اور میل سے کام کرنا۔

☆ وعدہ پورا کرنا یا پورا نہ ہو سکنے یا کوئی معذوری درپیش آجانے پر حتی الامکان پیشگی یا کم از کم بروقت معذرت کر دینا۔

☆ استعمال کے بعد اشیاء کو مناسب جگہ پر سلیقے سے رکھ دینا۔

☆ خدمت خلق اور معذوروں و مجبوروں کی خبر گیری کرنا۔

☆ اجازت لے کر آنا جانا۔

☆ شکریہ ادا کرنا خواہ کسی نے معمولی سا بھی احسان کیا ہو۔

☆ شائستگی سے خطاب کرنا اور ادب سے نام لینا۔

☆ ہر موقعے کے آداب کا لحاظ رکھنا۔

☆ مختلف مواقع کے اذکار اور دعاؤں کا پابند ہونا وغیرہ وغیرہ۔

واضح رہے اگر پسندیدہ عادات واطوار اور اچھے اخلاق کا پابند بنانے کی کوشش نہ کی گئی تو بہر حال بچے اپنے تجربے اور دوسروں کی تقلید کر کے کچھ نہ کچھ عادات ڈال ہی لیں گے اور ایسی صورت میں قوی تر اندیشہ اسی بات کا ہے کہ پسندیدہ کی عدم موجودگی میں ان کے عادات واطوار عموماً ناپسندیدہ ہی ہوں گے جو ان کی سیرت وشخصیت کو سب کی نظروں میں گھناؤنا بنا دیں گے اور بعد میں اصلاح بھی مشکل ہو گی۔

بچے کیوں بگڑتے ہیں؟

بگڑے ہوئے بچوں کا تجربہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں بگاڑ کی ابتدا عموماً مندرجہ ذیل اسباب میں سے کسی ایک یا چند کی وجہ سے ہوتی ہے، جب تک صحیح اسباب کی تشخیص کر کے ازالے کی فکر نہ کی جائے، سدھار مشکل ہے۔

۱۔ والدین یا بڑوں کا غلط نمونہ: بچے عموماً اپنے ماحول ہی کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اپنے گرد وپیش لوگوں کو جو کچھ کرتے دیکھتے ہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر انہی کی تقلید کرتے ہیں۔ جب گھریلو ماحول ہی گندہ ہو گا اور لوگ مختلف قسم کی خرابیوں میں مبتلا ہوں گے تو بچے پر لازماً ان کا اثر پڑے گا۔

۲۔ والدین یا بڑوں کے باہمی تعلقات کی ناخوشگواری: والدین یا گھر کے دوسرے افراد کے باہمی تعلقات کی ناخوشگواری بھی بچوں کے بگاڑ کا موجب ہوتی ہے، روز کی تو تو، میں میں، جھگڑا بکھیڑا اور شکوہ شکایت اچھے بھلے گھر کو جہنم بنا دیتی ہے۔ جو بچے ایسے گھروں میں

پلتے ہیں وہ طرح طرح کے اخلاقی اور ذہنی امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ایسے مدارس بھی جہاں اساتذہ کے باہمی تعلقات خوشگوار نہ ہوں بچوں کے بگاڑ کا اڈہ بن جاتے ہیں۔

۳۔ ناروا سلوک: بچوں کے بگاڑ کا یہ بھی بہت بڑا سبب ہے۔ یہ ناروا سلوک خواہ والدین کی طرف سے ہو یا اساتذہ کی طرف سے، بہن بھائیوں کی طرف سے ہو یا درجے کے ساتھیوں اور ہم جولیوں کی طرف سے مثلاً نفرت، تحقیر، تمسخر، بار بار کی مار پیٹ یا ڈانٹ پھٹکار۔ شک وسوءظنی، اصلاح کی طرف سے مایوسی اور دوسروں سے شکایتیں کرتے پھرنا وغیرہ۔

۴۔ احساس کمتری: خواہ ذہنی وجسمانی کمزوری یا نقص کے باعث ہو یا اخلاق کی گراوٹ کی وجہ سے، بعض کوتاہیوں، کمزوریوں یا جسمانی نقائص کی وجہ سے جب ایک بچے کو عام طور پر کمتر یا ذلیل سمجھا جانے لگتا ہے یا چڑایا جاتا ہے تو وہ احساس کمتری کا شکار ہو کر بگڑنے لگتا ہے۔

۵۔ بری صحبت: برے اور بگڑے ہوئے بچوں کی صحبت میں پڑ کر اکثر شریف والدین کے بچے بھی بگڑ جاتے ہیں۔

۶۔ ہم جولیوں کی صحبت سے محرومی: جہاں بری صحبت بچوں کو بگاڑ دیتی ہے وہیں اپنے ہم عمر بچوں کی صحبت سے محرومی بھی بگاڑ اور خرابیوں کا موجب ہوتی ہے۔ بچے بہت سی باتیں کھیل میں اپنے ہم جولیوں سے سیکھتے ہیں۔ متوازن شخصیت پروان چڑھانے کے لیے اچھے ہم جولیوں کی صحبت بھی نہایت ضروری ہے۔

۷۔ تعمیری مشاغل اور دلچسپ مصروفیات کے مواقع نہ ملنا: بچے ہر دم کچھ نہ کچھ بناتے بگاڑتے رہتے ہیں۔ فرصت کے اوقات کے لیے اگر مناسب مصروفیات کا بندوبست نہ ہو تو بے کاری کی وجہ سے بھی ان کے بگڑنے کا اندیشہ رہتا ہے۔

۸۔ اہم جبلی تقاضوں کی عدم تکمیل: مثلاً کھانے کھیلنے اور پہننے اوڑھنے کے ضمن میں ان کی

فطری خواہشات کی تکمیل میں بار باراور بہت زیادہ رکاوٹ، جائز طریقے سے جب تکمیل نہیں ہوتی تو بچے غلط طریقے سے تکمیل کی کوشش کرتے ہیں۔

۹۔ تجسس کی فراوانی اور خود تجربہ کرنے کا شوق: بچوں سے بعض کوتاہیاں اس لیے بھی سرزد ہوتی ہیں کہ وہ بعض ناروا باتوں کا تجربہ کر کے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ دیکھیں ایسا کرنے سے کیا ہوتا ہے اور یہی تجربہ نادانی کے باعث بگاڑ کا موجب بن جاتا ہے۔

۱۰۔ خوداعتمادی اور قوت ارادی کی کمی: جو بچپن کا لازمہ ہیں۔

۱۱۔ بڑا بننے یا نمایاں ہونے کی خواہش: بہت سی نازیبا حرکات بچے اس لیے بھی کرتے ہیں کہ وہ بڑا بننا یا ہم جولیوں میں نمایاں ہونا چاہتے ہیں۔ جب اس جذبے کی تسکین کے لیے مناسب راستہ نہیں ملتا تو غلط راستہ اختیار کرتے ہیں۔

۱۲۔ محبت، شفقت اور جائز ناز برداری سے محرومی بھی بگاڑ کا موجب بنتی ہے۔

۱۳۔ غیر معمولی لاڈ پیار: یہ بھی بگاڑ کا بہت بڑا سبب ہے۔

۱۴۔ نادانی اور ناتجربہ کاری اور عواقب ونتائج پر نگاہ نہ ہونا۔

۱۵۔ اعلیٰ تخیلات، پاکیزہ تصورات اور معیاری نصب العین کا فقدان۔

۱۶۔ کاہلی وسستی اور نکما پن، خواہ خودغرضی، لاپرواہی اور بے تعلقی کی بنا پر ہو یا جسمانی وذہنی کمزوریوں کے باعث۔

۱۷۔ دن بدن بڑھتی ہوئی فحاشی، بے حیائی اور فیشن پرستی کتنوں کو بگاڑ رہی ہے۔

۱۸۔ سنسنی خیز فلمیں، جاسوسی ناول، عریاں تصاویر اور فحش لٹریچر۔

۱۹۔ الحاد، خدا بیزاری اور مادہ پرستی کے نتیجے میں عمومی بگاڑ جس سے نئی نسلیں بھی تیزی سے متاثر ہو رہی ہیں۔

۲۰۔ تعلیم وتربیت کا ناقص انتظام وغیرہ۔ عموماً بچوں کے بگاڑ کا موجب بنتے ہیں۔

ان وجوہ واسباب سے ہمارے وہ نونہال جو طفل معصوم کے پیارے نام سے یاد کیے جاتے

ہیں اور بلاشبہ جو ہماری گود میں معصوم ہی دیئے جاتے ہیں بلوغ سے پہلے ہی بعض ایسے ناپسندیدہ عادات واطوار بلکہ جرائم کا شکار ہو جاتے ہیں جنھیں سن کر شرم سے گردنیں جھک جاتی ہیں۔ آج وہ کون سے جرائم ہیں جو نوعمروں میں نہیں پائے جاتے۔ والدین کی فرماں برداری اور اساتذہ کا ادب واحترام تقریباً اٹھ چکا ہے۔ ذوق سلیم اور جذبات لطیف کی کونپلیں مشکل ہی سے پھوٹتی ہیں، رحم دلی وہمدردی کے جذبات سے ان کے دل ودماغ یکسر محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ وسیع القلبی، ضبط نفس اور رواداری کا کوسوں پتہ نہیں چلتا۔ مغربی ممالک کا تو کہنا ہی کیا، وہاں نوعمروں میں جرائم پیشگی اپنے شباب کو پہنچ رہے ہیں۔ نو دس سے تیرہ چودہ سال تک کی عمر کے بچے بھی اغوا، قتل، بدکاری، جیب تراشی اور ڈاکازنی وغیرہ میں ملوث پائے جاتے ہیں، ہمارے یہاں بھی ان کی رفتار دن بدن ترقی پر ہے۔

علاج:

بگاڑ کا علاج لوگ عام طور پر یا تو سزا سے کرتے ہیں یا کڑی نگرانی کر کے ترک استعمال سے۔ بلاشبہ یہ دونوں حربے بھی بسا اوقات کارگر ثابت ہوتے ہیں۔ بچے کو ایک ناشائستہ حرکت کے نتیجے میں جب دردناک سزا بھگتنی پڑتی ہے تو وہ درد اور تکلیف کے تلخ تجربات کی وجہ سے باز آ جاتا ہے۔ اسی طرح جب کسی لغو حرکت کے اعادے کا زیادہ دنوں تک موقع نہیں ملتا تو اس کی طرف میلان کمزور پڑ جاتا ہے لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ سزا کی وجہ سے بچہ اور زیادہ جری و بے باک ہو جاتا ہے اور بری عادتیں جڑ پکڑ لیتی ہیں۔ اسی طرح بغیر اندرونی آمادگی کے جب ایک حرکت سے بچہ جبراً روک دیا جاتا ہے تو موقع ملتے ہی وہ اور زیادہ کھل کھیلتا ہے۔ اس لیے ان دونوں علاجوں پر بہت زیادہ بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہر بچہ کے بگاڑ کی نوعیت اور اسباب جدا جدا ہوتے ہیں۔ اس لیے سب کا علاج بھی ایک ہی نسخہ سے نہیں کیا جا سکتا۔ سب سے پہلے بگاڑ کے بنیادی اسباب کا پتہ لگایا جائے اور کوشش کی جائے کہ وہ اصل سبب دور ہو۔ جب تک جڑ موجود رہے گی ہو سکتا ہے بگاڑ کی نوعیت بدل جائے لیکن پورے طور پر اصلاح نہ ہو سکے گی۔ ذیل میں چند مزید تدابیر کی نشان دہی کی

جاتی ہے۔ ہر قسم کے بگاڑ میں یہ تدابیر موثر ہوسکتی ہیں۔ پہلے انہیں آزمایئے:

☆ بچے کی کوتاہیوں کے باعث آپ کے رویے میں جو تبدیلی آگئی ہے اس کی اصلاح کیجئے۔ وہ آپ کی محبت کا بھوکا ہے۔ اس سے غیر مشروط محبت کیجئے یعنی اس کی ذات نہ کہ صفات سے اور اپنے قول و فعل اور سلوک و برتاؤ سے اسے اپنی محبت و شفقت کا یقین دلایئے۔ سینکڑوں کوتاہیوں کا یہی مجرب علاج ہے۔ وہ انشاء اللہ آپ کو مایوس نہ ہونے دے گا۔

☆ دلچسپی، عمر اور صلاحیت کے مطابق تعمیری مشاغل اور گھر کی ذمہ داریوں میں حصہ لینے کے مواقع دیجئے۔

☆ کوتاہیوں پر تنہائی میں دل سوزی سے سمجھایئے۔ دوسروں کے سامنے ٹوکنے اور سزا دینے سے گریز کیجئے۔ ہمدردی اور محبت کے ساتھ کوتاہیوں پر قابو پانے کی عملی تدابیر بتایئے۔

☆ بہت زیادہ توقعات وابستہ نہ کیجئے۔ عمر، تجربے اور فہم کی کمی کا حتی الامکان الاؤنس دیجئے۔ بچے بہرحال نادان اور ناتجربہ کار ہوتے ہیں اور بہت سی حرکات بنیادی خواہشات اور جبلی تقاضوں سے مجبور ہو کر کر گزرتے ہیں۔

☆ کھیل اور اچھے ہم جولیوں سے ملنے جلنے کے مواقع دیجئے۔

☆ اپنے برتاؤ میں استواری پیدا کیجئے تاکہ بچہ آپ کے مزاج کو بخوبی سمجھ سکے اور آپ کی خوشی کا لحاظ رکھ سکے۔

☆ بچے کو اپنے اعتماد میں لیجئے اور اس پر بھی اعتماد کا اظہار کیجئے۔

☆ اس کے احساسات اور نقطۂ نظر کو بھی اہمیت دیجئے۔ اس کی انفرادیت کو تسلیم کیجئے اور اس کی شخصیت کا واجبی احترام ملحوظ رکھئے۔

☆ دلچسپ اور سبق آموز کہانیوں، واقعات وغیرہ کی مدد سے اچھائیوں سے لگاؤ اور برائیوں سے نفرت پیدا کرایئے۔

☆ بحالت مجبوری ماحول بدل کر ایسی جگہ رکھئے جہاں لوگ اس کے عیوب سے واقف نہ ہوں

اور اس کی شخصیت کا احترام کریں۔امید ہے اس طرح وہ نئے ماحول میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر لے گا اور اسے برقرار رکھنے کی کوشش میں کوتاہیوں سے بچے گا۔

ناپسندیدہ عادات واطوار:

بچے عموماً مندرجہ ذیل ناپسندیدہ عادات واطوار کا شکار ہو جاتے ہیں۔کوشش کر کے بتدریج انہیں ترک کرانا چاہیے۔

- ☆ جھوٹ بولنا
- ☆ چغلی کھانا
- ☆ بستر پر پیشاب کرنا
- ☆ اندھیرے میں ڈرنا
- ☆ ضد اور چڑچڑاپن
- ☆ گالی بکنا
- ☆ ڈینگ مارنا
- ☆ فضول خرچی
- ☆ چھوٹے بچوں کو پیٹنا
- ☆ پھوہڑپن
- ☆ ہم جولیوں کو ستانا
- ☆ کام چوری
- ☆ جانوروں کے ساتھ بے رحمی کرنا
- ☆ گھر یا مدرسے سے بھاگنا
- ☆ چوری کرنا
- ☆ آوارہ گردی کرنا
- ☆ منہ چڑانا
- ☆ نام بگاڑنا
- ☆ ٹال مٹول کرنا
- ☆ دھوکا دینا
- ☆ پلٹ کر جواب دینا
- ☆ لڑنا جھگڑنا اور کھیل بگاڑنا
- ☆ بیڑی سگریٹ پینا
- ☆ اودھم مچانا
- ☆ سینما دیکھنا
- ☆ نافرمانی کرنا
- ☆ جاسوسی ناولیں پڑھنا
- ☆ بے حیائی کے کام وغیرہ

ترک کرانے کا طریقہ:

☆ سب سے پہلے بچے کے ناپسندیدہ عادات واطوار میں سے چند بنیادی اور نمایاں خرابیوں کو

نوٹ کر لیجئے۔

☆ پھر باری باری ایک ایک خرابی پر توجہ دیجئے۔ پہلے اس بری عادت کے اصل محرکات کا دقت نظری سے جائزہ لیجئے اور انہیں دور کرنے کی فکر کیجئے تاکہ اصلاح پائیدار ہو۔

☆ مناسب موقع تلاش کر کے عام فہم انداز سے سبق آموز قصے کہانیوں وغیرہ کی مدد سے اس بری عادت کے نقصانات اور نتائج بد ذہن نشین کرائیے۔

☆ اس کے بعد متعین طور پر بتائیے کہ کیا کچھ ترک کرنا ہے اور اس کو ترک کرنے کی آسان تدبیر کیا ہے۔

☆ بچے کو اچھی طرح آمادہ کر کے ترک کرنے کا عہد لیجئے۔ اگر وہ اپنی خوشی سے خلاف ورزی اور بدعہدی پر صدقہ، جرمانہ یا سزا مقرر کر لے تو زیادہ بہتر ہے۔

☆ اصلاح کی طرف سے مایوسی کو پاس نہ پھٹکنے دیجئے بلکہ شاندار مستقبل میں یقین پیدا کرائیے۔

☆ بچے میں خود اعتمادی کا اتنا جذبہ پیدا کیجئے کہ اسے یقین ہو جائے کہ وہ اسے ترک کر سکتا ہے۔

☆ واضح رہے تنہا سختی کرنے یا اظہار کا موقع نہ دینے سے بری عادتیں نہیں چھوٹ جاتیں۔ بلکہ جبر و تشدد سے بعض اور خراب عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں مثلاً چوری کے ساتھ جھوٹ اور دھوکہ دہی وغیرہ۔ اسی طرح آمادگی کے اظہار کا موقع نہ ملنے سے بعض بری عادتیں وقتی طور پر دب جاتی ہیں لیکن موقع پاتے ہیں زیادہ شدت سے ابھرتی ہیں۔ استیصال کے لیے اصل اسباب کا ازالہ اور بچے کی آمادگی اور قوت ارادی ضروری ہے۔

☆ خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے بچے کی کسی نمایاں خوبی کا سہارا لیجئے اور سمجھائیے کہ جب تم فلاں معاملے میں اتنا اچھا مظاہرہ کر سکتے ہو تو اس معمولی بات کے ترک کرنے پر کیوں قادر نہیں ہو سکتے۔

☆ قریبی ماحول میں فضا ایسی بنایئے کہ ترک کرنے میں آسانی اور مسرت کا احساس ہو اور برقرار رکھنے میں دشواری اور تکلیف محسوس ہو۔

☆ ضرورت محسوس ہو تو بچے کی رہائش گاہ، کمرہ یا جگہ بدل دیجیے۔

☆ بری عادتیں ترک کرانے میں اجتماعی کے مقابلے میں انفرادی توجہ موثر ثابت ہوتی ہے اس لیے ہر بچہ پر علیحدہ توجہ دیجئے۔

☆ جس حد تک بچے کو کامیابی ہو اس پر اسے شاباشی دے کر مزید قوت بہم پہنچایئے۔

☆ خلاف ورزی کا قطعاً موقع نہ دیجیے۔

☆ اکثر برے عادات واطوار اس لیے پڑ جاتے ہیں کہ اچھے عادات واطوار ڈلوانے کا اہتمام نہیں ہوتا۔ ایجابی اخلاق اور پسندیدہ عادات واطوار ڈلوانے کی کوشش کیجیے۔ پھر ناپسندیدہ عادات واطوار اور سلبی اخلاق واوصاف کے لیے گنجائش ہی نہیں رہے گی۔

☆ برے عادات واطوار، ان کے نقصانات اور سلبی حیثیت سے ان کے ترک وغیرہ کا بہت زیادہ تذکرہ نہ کیجیے۔ خصوصاً اچھے بچوں کے سامنے، ورنہ خواہ مخواہ تحریص ہوگی اور برائیوں سے نفرت گھٹ جائے گی۔ جھوٹ چھوڑنے کے بجائے ایجابی طور پر سچ بولنے کے فوائد اور اچھے نتائج ذہن نشین کرایئے۔ کمزوروں کو ستانے کی عادت بد کی روک تھام کے لیے ان کی خبر گیری اور امداد پر اکسایئے۔

☆ اپنے مقدور بھر سلیقے سے کوشش کیجیے امید ہے کامیاب ہوں گے ورنہ فرض سے بہر حال سبکدوش ہو جائیں گے۔ اور بچہ آپ کے احسانات کو عمر بھر یاد رکھے گا۔ توقع ہے کسی موڑ پر خود بخود اصلاح ہو جائے گی۔ کم از کم اتنا تو ہوگا کہ وہ ان کوششوں کا اچھے انداز میں تذکرہ کرے گا جو آپ اس کی اصلاح کے سلسلے میں انجام دیں گے۔ قوی امید یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں میں برکت عطا فرمائے گا۔

............☆☆☆ ....

باب ۱۶:

تعلیمی اداروں کی کامیابی کی شرائط

تعلیمی اداروں خصوصاً دینی مدارس سے بڑی توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ بات بھی معقول ہے جن حالات سے آج ہم دوچار ہیں اور ہماری آئندہ نسلوں کے مستقبل پر تاریکی کے جو گھرے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ان پر امید کی کرن دراصل ان ٹمٹماتے چراغوں ہی سے پھوٹتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ اللہ نے جنہیں کچھ بھی نور بصیرت عطا فرمایا ہے وہ ان چراغوں کو بجھنے سے بچانے اور نئے چراغ جلانے کے لیے اپنے طور پر کوشاں ہیں، اگرچہ وسائل محدود ہونے کی وجہ سے انہیں متعدد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

مزید برآں تعلیمی اداروں سے تو صرف تعلیم کی توقع کی جاتی ہے جب کہ دینی مدارس کے فرائض سہ گونہ شمار ہوتے ہیں:

۱۔ مختلف مضامین کا معیار عام اداروں سے بلند ہو۔

۲۔ دین کی ضروری معلومات بہم پہنچائی جائیں وہ بھی مادری زبان (اردو) میں۔

۳۔ دینی، اخلاقی اور معاشرتی نقطہ نظر سے طلبہ کی ایسی تربیت ہو جو انہیں دین پر قائم رکھنے، اللہ کا صالح بندہ، سماج کا بے لوث خادم اور ملک کا اچھا شہری بنانے میں معاون ہو اور انہیں الحاد، مادہ پرستی اور بداخلاقی کے موجودہ سیلاب کی نذر ہونے سے بچا سکے۔

موجودہ حالات میں غیر معمولی توقعات وابستہ کر لینا خلاف توقع نہیں لیکن توقعات پوری ہونے کے لیے کچھ ناگزیر شرائط کی تکمیل بھی ضروری ہے۔ جس حد تک یہ شرطیں پوری ہوں گی اتنے ہی خوشگوار نتائج برآمد ہوں گے۔ ادارے سے متعلق تمام حضرات کو ان کی تکمیل کی برابر فکر رکھنی چاہیے۔ شرائط حسب ذیل ہیں:

الف: مخلص کارکن:

سب سے اہم شرط یہی ہے۔ ادارے کو اگر حسب ضرورت لائق اور مخلص کارکن مل جائیں تو باقی شرائط انشاء اللہ بآسانی پوری ہو سکیں گی اور ادارہ نہایت خوش اسلوبی اور کامیابی کے ساتھ چلے گا۔

کارکنوں میں مندرجہ ذیل صفات ہونی چاہئیں:

☆ ادارے اور اس کے مقصد سے گہرا لگاؤ اور اس کی تعمیر وترقی کے لیے نئی راہیں نکالنے اور مزاحمتوں پر قابو پانے کا عزم راسخ۔

☆ تدریس اور تربیت کی اہلیت۔

☆ اپنی علمی لیاقت اور تدریسی صلاحیت بڑھانے کی فکر۔

☆ طلبہ کو پورا فائدہ پہنچانے کی آرزو۔

☆ بچوں سے فطری لگاؤ، ہمدردی اور شفقت کا جذبہ۔

☆ ادارے کے اصول وضوابط اور اوقات کی پابندی۔

☆ طلبہ کے سامنے اعلیٰ اخلاقی نمونہ اور معیاری سیرت وکردار کا مظاہرہ۔

☆ ساتھی کارکنوں اور ذمہ داروں سے تعاون کا جذبہ وسلیقہ اور ٹیم ورک کی صلاحیت۔

☆ احساس ذمہ داری اور انہماک کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دینے کی کوشش۔

☆ طلبہ کی تعلیم وتربیت اور ماحول کی اصلاح میں ان کے سرپرستوں کا تعاون حاصل کرنے کی فکر۔

☆ مدرسے کی ضرورت وافادیت پبلک پر واضح کرنے کی صلاحیت۔

☆ ایثار وقناعت، جن کے بغیر آج کے حالات میں دینی تعلیم کی ترویج واشاعت کا کام ناممکن نہیں، تو محال ضرور ہی ہے۔

ب: متعین اور واضح مقصد:

ادارے کا بنیادی مقصد نہ صرف متعین ہونا چاہیے بلکہ اساتذہ، طلبہ، سرپرستوں اور پبلک سب پر بخوبی واضح ہونا چاہیے تاکہ سارا نظام اسی کے لحاظ سے وضع کیا جائے۔ کارکن اسی کو نگاہ میں رکھ کر کام کریں۔ دیکھنے والے اسی معیار پر جانچ کر دیکھ سکیں اور سب کی اجتماعی کوششیں اس مقصد کے حصول پر صرف ہوں۔ مقصد متعین اور واضح نہ ہو تو ہر ایک ادارے کو اپنے پیش نظر مقصد کے لیے استعمال کرنے لگتا ہے۔ لوگوں کی کوششوں کا رخ مختلف بلکہ بسا اوقات متضاد سمتوں میں ہو جاتا ہے اور اس کھینچا تانی میں اصل مقصد ہی فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے بے مقصد ادارہ چلانے سے وقت اور قوت دونوں کے ضیاع کے سوا حاصل کیا ہوگا۔

ج: پبلک کا تعاون:

اداروں کی کامیابی کے لیے یہ بھی ایک اہم شرط ہے۔ اس کے بغیر عام مدارس بھی نہیں چل سکتے چہ جائیکہ دینی ادارے۔ عام مدارس کی پشت پر تو حکومت کے وسائل و ذرائع بھی ہوتے ہیں اور جبر و ترغیب کے ہتھیار بھی اور سب سے بڑی وجہ کشش تو خود طلبہ کے دنیوی مستقبل کا مسئلہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دینی مدارس نہ صرف ان سہولتوں سے محروم بلکہ مختلف موانع سے بھی دوچار ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ تو پبلک کے تعاون کے بغیر چل ہی نہیں سکتے کیونکہ پبلک ہی سے بچے ملیں گے۔ اسی کے تعاون سے چندہ فراہم ہوگا، اسی کے دباؤ اور اثر سے مزاحمتیں دور ہوں گی، اگر وہ تعاون نہ کرے تو ادارے کس طرح چل سکتے ہیں۔

پبلک انہی اداروں کی طرف رجوع ہوتی اور انہی کے ساتھ تعاون کرتی ہے جن کی ساکھ ہوتی ہے اور جو اپنی غیر معمولی جدوجہد سے اپنی ضرورت وافادیت اس پر ثابت کر دیتے ہیں۔

پبلک کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کارکنان ادارہ:

☆ خوش اخلاق وملنسار ہوں۔

☆ پبلک سے ربط قائم کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع نکالیں۔

☆ مدرسے کی تقریبات میں شرکت کی اسے دعوت دیں۔

☆ آبادی کی فلاح و بہبود اور اس کی دینی اخلاقی اور معاشرتی اصلاح نیز اجتماعی ورفاہی کاموں میں پوری دلچسپی لیں اور مختلف مواقع پر ان کی رہنمائی اور مدد کریں۔

☆ لوگوں کو اس بات پر برابر اکساتے رہیں کہ وہ نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کریں اور بری باتوں یا برے کاموں میں تعاون نہ کریں۔

☆ دینی تعلیم کی اہمیت اور اس ضمن میں مدرسے کی ضرورت وافادیت برابر پبلک پر واضح کرتے رہیں۔

☆ دین کے جزوی وفروعی اختلافات سے بچتے ہوئے صرف اصولی اور بنیادی باتوں پر زور دیں اور ہر مکتب خیال کے لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کی فکر کریں۔

☆ ادارے کے خلاف پھیلی ہوئی یا پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کو دور کرنے کے لیے متعلقہ افراد سے بروقت مل کر نرمی سے وضاحت کریں۔ اعتراضات کو خندہ پیشانی سے سنیں اور ازالے کی فکر کریں۔

د: موزوں عمارت:

ایک اہم شرط مدرسے کی اپنی ایک موزوں عمارت ہے، عمارت کا پختہ یا عالی شان ہونا ضروری نہیں، معمولی عمارت بھی بہت زیادہ کارآمد ہوسکتی ہے اگر:

☆ اس کا موقع محل مناسب اور ماحول پرسکون ہو۔

☆ جگہ کے انتخاب اور عمارت کی ساخت میں ہر موسم کا لحاظ رکھا گیا ہو۔

☆ ہوا اور روشنی کا معقول گزر ہو۔

☆ ہر درجے اور شعبے کے لیے ضروری گنجائش ہو۔

☆ پینے کے پانی اور پیشاب پاخانے کا مناسب بندوبست ہو۔

☆ صفائی ستھرائی کا پورا لحاظ رکھا جاتا ہو۔

ھ: ضروری سامان:

ادارے کی کامیابی کے لیے مندرجہ ذیل ساز وسامان بھی ضروری ہے:

☆ موزوں درسی کتب، ان کے انتخاب میں احتیاط اور بروقت فراہمی کی کوشش۔

☆ تحریری کام یا تعمیری مشاغل کے لیے طلبہ کے پاس ضروری چیزیں مثلاً قلم، دوات، پنسل، تختی، سلیٹ، کاپیاں، جومیٹری بکس، رنگ، برش وغیرہ۔

☆ طلبہ اور اساتذہ کی نشست کے لیے صاف ستھرا فرش، ٹاٹ، دری، بنچ، ڈسک، میز کرسی وغیرہ۔

☆ تختہ سیاہ، چاک، نقشے، گلوب، تصاویر، چارٹ، ماڈل اور سائنس کے تجربات کے لیے ضروری سامان وغیرہ۔

☆ کھیل، ڈرل، فرسٹ ایڈ (ابتدائی طبی امداد) پی ٹی (جسمانی تربیت) وغیرہ کے لیے ضروری سامان۔

☆ طلبہ اور اساتذہ کے استفادے کے لیے لائبریری کتب اور دارالمطالعہ میں رسائل واخبارات وغیرہ۔

☆ بیرون نصاب مصروفیات ومشاغل، ہابیز اور تعمیری صلاحیتیں ابھارنے کے لیے ضروری سامان۔

و: فیلڈ یا کھیل کا میدان:

مدرسے کے احاطے یا قرب میں:

☆ اجتماعی حاضری، جلسوں اور کھیلوں کے لیے ہموار میدان ہو۔

☆ پھول پودے اور سبزی ترکاری وغیرہ کے لیے گنجائش ہو۔
☆ چھوٹے بچوں کو کھیل کھیل میں تعلیم دینے یا کوئی منصوبہ چلانے کے لیے جگہ ہو۔

ز: نظم وضبط:

مدرسے کا نظم وضبط اچھا ہو۔

☆ اندرونی فضا بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے سازگار ہو۔
☆ اساتذہ کے باہمی تعلقات اچھے ہوں اور وہ آپس میں نیز صدر مدرس سے پورا تعاون کریں۔
☆ طلبہ اور اساتذہ کے تعلقات خوشگوار ہوں۔
☆ مدرسے کے معمولات کی سب لوگ پابندی کریں۔
☆ طلبہ کو سزا دینے یا کسی مدرس کے خلاف اقدام کرنے کی نوبت کم آئے۔
☆ مدرسے کے قواعد وضوابط اور صدر مدرس نیز انتظامیہ کے احکام کا طلبہ اور اساتذہ پاس ولحاظ کریں۔
☆ حاضری اور وقت کی سختی سے پابندی کی جائے۔
☆ درجے، کھیل کے میدان یا بورڈنگ میں طلبہ شرارت سے باز اور اخلاقی معائب سے محفوظ رہیں۔
☆ مختلف مواقع کے آداب کا پورا لحاظ رکھا جائے۔
☆ نظم وضبط میں لوگوں کا قلبی تعاون حاصل کرنے کے لیے ان کے مشوروں کو حتی الامکان اہمیت دی جائے اور ادارے کو نقصان پہنچائے بغیر لوگوں کی سہولتوں کا زیادہ سے زیادہ لحاظ رکھا جائے۔
☆ طلبہ اور اساتذہ میں خود انضباطی پیدا کرنے اور پروان چڑھانے کی فکر کی جائے تاکہ

خارجی دباؤ کی کم سے کم ضرورت پیش آئے۔

یہ ہیں وہ ناگزیر شرائط جن پر تعلیمی اداروں کی کامیابی کا انحصار ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جب تک یہ شرطیں پوری نہ ہوں کوئی مدرسہ قائم نہ کیا جائے یا پہلے سے قائم ہو تو اس کی کامیابی کی طرف سے مایوس اور بددل ہو جایا جائے بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ ادارے کے کارکنان اور دیگر ذمہ دار حضرات ان شرطوں کی تکمیل کے لیے کوشش کریں اور غیر معمولی توقعات وابستہ کرنے کے بعد خلاف توقع نتائج دیکھ کر بددلی کا شکار نہ ہوں، کارکن اگر صاحب صلاحیت ہوں اور کام کا پورا خاکہ ان کے سامنے ہو تو رفتہ رفتہ مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے اور ادارے کو سلیقے سے چلانے کے لیے ناگزیر شرائط کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ وسائل کی کمی سے کام نہیں رکا کرتے۔ اپنی جدوجہد اور اخلاص سے استحقاق پیدا کر لیا جائے تو اللہ میاں مایوس نہیں کرتے۔ ان کا خزانہ بے پایاں ہے۔

............☆☆☆............

باب ۱۷:

معلم کے اوصاف

معلم کا درجہ بہت بلند ہے۔ وہ طلبہ کا روحانی باپ اور ملت کا معمار ہے۔ آئندہ نسلوں کی سیرت سازی اسی کے ذمہ ہے۔ مستقبل کے شہریوں کا بننا بگڑنا بہت کچھ اسی کی کوششوں پر منحصر ہے۔ چنانچہ اس اہم منصب کے لحاظ سے اسے اعلیٰ اوصاف کا حامل بھی ہونا چاہیے۔

ایک معلم کو طلبہ سے سابقہ پیش آتا ہے اور ان کے سرپرستوں سے بھی، ذمہ داران ادارہ سے بھی واسطہ پڑتا ہے اور عام پبلک سے بھی۔ ان میں سے ہر ایک کی نگاہیں معلم میں کچھ اوصاف تلاش کرتی ہیں جو بہرحال ناگزیر بھی ہیں۔ معلم کو اپنے اندر ان اوصاف کو پروان چڑھانے کی فکر کرنی چاہیے تاکہ وہ اپنے فرائض کو بھی کماحقہ انجام دے سکے اور ان سب کو مطمئن بھی کر سکے۔

الف: طلبہ کی نظر میں معلم کیسا ہونا چاہیے؟

اس سوال کے جواب میں مختلف استعداد اور رجحان کے طلبہ نے جو اظہار خیال کیا اپنے الفاظ میں ان کا خلاصہ نمبروار درج کیا جاتا ہے۔ ان سے اندازہ لگایئے کہ اچھے معلم کو پرکھنے کے لیے خود طلبہ نے کتنی اچھی کسوٹی فراہم کر دی ہے۔

☆ ملت کا معمار ہونے کی حیثیت سے معلم کو اعلیٰ سیرت و کردار کا حامل ہونا چاہیے تاکہ طلبہ پر اس کی شخصیت کا اچھا پرتو پڑے۔

☆ اس کے لباس اور وضع قطع میں سادگی کے ساتھ پاکیزگی اور وضع داری ہو۔ فیشن اور نقالی یا پھوہڑپن اور فلسفیانہ لاپروائی معلم کو زیب نہیں دیتی۔

☆ طلبہ سے برتاؤ میں عدل وانصاف اور مساوات کو ملحوظ رکھے۔ کسی پر زیادتی یا کسی کے ساتھ ترجیحی سلوک نہ کرے۔ سب کو ایک نظر سے دیکھے۔

☆ سزا دینے میں محتاط ہو۔ غیظ وغضب، ڈانٹ، پھٹکار، طعن وتشنیع سے کام لینے کے بجائے طلبہ کے جذبات اور ان کی عزت نفس کا خیال رکھے اور ٹھنڈے دل سے ان کی مشکلات کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے کی کوشش کرے۔

☆ محنت سے پڑھائے اور طلبہ سے بھی خوب محنت لے مگر ساتھ ہی کھیل کا بھی موقع دے اور اس کا مناسب بندوبست کرے۔

☆ ہوم ورک ضرور دے مگر بہت زیادہ بوجھ نہ لادے۔

☆ ہوم ورک یا دوسرے تحریری کاموں کو بروقت جانچ دیا کرے۔ اصلاح کے بعد جلد کاپیاں واپس کر دیا کرے ورنہ طلبہ میں کاہلی پیدا ہوتی ہے۔

☆ پڑھاتے وقت طلبہ کی دلچسپی اور توجہ کا لحاظ رکھے، اکتاہٹ نہ پیدا ہونے دے۔

☆ درجے کے تمام بچوں کے عادات واطوار سے واقف ہو اور پوری جماعت پر نظر رکھے۔

☆ خوب پڑھا لکھا اور قابل ہو۔ اسباق کو اچھی طرح ذہن نشین کرا سکے۔

☆ طلبہ کے سوالات واعتراضات پر چڑنے یا ناک بھوں سکیڑنے کے بجائے خندہ پیشانی سے جواب دے کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرے۔

☆ دل سے پڑھائے صرف ڈیوٹی نہ بجالائے۔

☆ خوش اخلاق، ملنسار، خوش مزاج اور نرم خو ہو۔

☆ سادہ اور آسان زبان میں نیز دل کش انداز سے باتیں سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔

☆ پچھلے اسباق کا اعادہ کرا کے خوب یاد کرا دیا کرے۔

☆ ڈٹ کر پڑھائے مگر کبھی کبھی دلچسپ بات چیت کا بھی موقع دے۔

☆ لب ولہجہ شیریں ہو، تلخ باتوں کو بھی گوارا کرلے۔ جھگڑالو بالکل نہ ہو۔

☆ نمبر دینے میں سختی ہو۔

☆ اپنی جماعت کا نام اونچا کرنے کی کوشش کرے۔

☆ طلبہ کی ضروریات کو سمجھتا ہو اور انہیں پورا کرنے کی کوشش کرے۔ نادار طلبہ کی اعانت کا بندوبست کرائے۔

☆ کبھی کبھی سیر وسیاحت کے لیے اپنے ساتھ لے جائے اور قابل دید جگہوں کا مشاہدہ کرائے۔

☆ طلبہ کو ایسی نصیحت کرے جس سے ان میں علم کا شوق پیدا ہو۔

☆ طلبہ کو مصیبت برداشت کرنے کی عادت ڈلوائے اور مصیبت میں ان کی امداد کرے۔

☆ طلبہ کی رائے عامہ اپنے بارے میں اچھی بنائے۔ کبھی اپنے خلاف نفرت کے جذبات نہ پیدا ہونے دے۔

یہ ہیں وہ اوصاف جو بچے اپنے معلم میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان معصوموں کی کون سی خواہش غیر منصفانہ ہے۔ کیا ان میں سے کسی کو نظر انداز کر کے ہم کامیاب معلم بن سکتے ہیں؟

ب: سرپرستوں کی نظر میں:

بچوں کے سرپرست معلم میں مندرجہ ذیل اوصاف دیکھنا چاہتے ہیں:

☆ خوش اخلاق وملنسار ہو۔ ان سے کھل کر ملے۔

☆ ان کے بچوں پر حسب استطاعت انفرادی توجہ دے۔

☆ بچوں کی تعلیمی واخلاقی ترقی سے انہیں باخبر رکھے۔

☆ ان سے روابط رکھے اور ان کے بچوں کے سلسلے میں انہیں مشورہ دیتا اور ان سے مشورہ لیتا رہے۔

☆ ان کے تاثرات معلوم کرے اور ان کی تنقیدوں کو خندہ پیشانی سے سنے۔

☆ ان کے بچوں سے شفقت ومحبت کا برتاؤ کرے۔ ان کو والدین کی خدمت واطاعت کی تلقین کرتا رہے۔

☆ ان کے بچوں کے سامنے ان کی یا ان کی گھر کی تنقیص نہ کرے۔

☆ ان کے بچوں کے علم وعمل پر اپنی کوششوں کے اثرات انہیں محسوس کرادے۔

☆ ان سے ان کے بچوں کے نقائص اور کوتاہیاں بیان کرنے میں حزم واحتیاط سے کام لے۔

☆ ان کے بچوں کی تربیت واصلاح اور مستقبل میں کامیابی کی طرف سے خود بھی پُر امید ہو اور انہیں بھی مایوس نہ کرے۔

ج: ذمہ داروں کی نظر میں:

اداروں کے ذمہ دار معلم میں مندرجہ ذیل اوصاف تلاش کرتے ہیں:

☆ اپنے عہدے اور منصب کا اہل ہو۔

☆ فرض شناس ہو۔ اپنے فرائض کو بخوبی سمجھ کر سلیقے اور تندہی سے انجام دے۔

☆ ادارے کا بہی خواہ ہو اور اس کی ساکھ کو قائم کرنے یا برقرار رکھنے کے لیے فرائض سے کچھ بڑھ کر کام کرے۔

☆ خوددار، غیرت مند اور قناعت پسند ہو۔ حقوق ومراعات طلب کرنے میں متشدد یا حریص نہ ہو۔

☆ مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اپنے رفقائے کار نیز ذمہ داران ادارہ سے پورا تعاون کرے۔

☆ ہدایات ومشوروں پر برضا ورغبت عمل کرے۔

☆ تنقید کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے اور اصلاح حال کی طرف متوجہ ہو۔

☆ ادارے کے قواعد وضوابط اور اوقات کا خود بھی پابند ہو اور طلبہ سے بھی پابندی کرائے۔

☆ اپنے کام میں حقیقی دلچسپی لے۔ فرائض کو بوجھ نہ سمجھے۔

☆ اپنی استعداد وصلاحیت بڑھانے کی کوشش کرتا رہے اور ادارے کے مختلف کاموں کو انجام دینے کی بھی کچھ نہ کچھ صلاحیت پیدا کرنے کی فکر کرے۔

د: پبلک کی نظر میں:

☆ خوش اخلاق وملنسار ہو۔

☆ ان کی فلاح وبہبود سے دلچسپی رکھتا ہو۔

☆ اصلاح معاشرہ کے لیے کوشاں ہو اور اس سلسلے میں ان کی مدد ورہنمائی کرے۔

☆ ان کے باہمی جھگڑوں میں غیر جانبدار رہ کر اصلاح حال کی فکر کرے۔

☆ ادارے کی تقریبات میں ان کو شرکت کی دعوت دے۔

☆ کبھی کبھی مشہور شخصیتوں کے ذریعے خطاب عام کا بندوبست کرائے اور پبلک کو ان سے ملنے کے مواقع بہم پہنچائے۔

☆ ان کے اعتراضات، تنقیدیں اور مشورے خندہ پیشانی سے سنے اور ٹھنڈے دل سے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرے۔

ھ: ماہرین تعلیم کی نظر میں:

انہی تمام وجوہ سے ماہرین تعلیم نے معلم میں مندرجہ ذیل اوصاف ضروری قرار دیئے ہیں۔

☆ اعلیٰ سیرت وکردار۔

☆ علمی لیاقت اور تدریسی صلاحیت۔

☆ بچوں کی نفسیات اور طریق تعلیم سے واقفیت۔

☆ صحت وتوانائی۔

☆ صبر وتحمل، معاملہ فہمی اور قوت فیصلہ۔

☆ بچوں سے فطری لگاؤ۔

☆ پیشہ معلمی سے طبعی مناسبت۔

☆ معلمانہ ذوق مطالعہ۔

☆ نظم وضبط قائم کرنے کی صلاحیت۔

☆ خوش کلامی اور موثر انداز بیان۔

☆ اخلاص اور لگن۔

☆ ہمدردی و دل سوزی اور اصلاح کا جذبہ۔

☆ خوش مزاجی وملنساری۔

یہ ہیں وہ ضروری اوصاف جنہیں ہر معلم کو اپنے اندر پروان چڑھانا چاہیے کیونکہ ان کے بغیر تعلیم وتربیت جیسا پتہ ماری کا کام نتیجہ خیز ہو ہی نہیں سکتا۔

رہے دینی مدارس کے اساتذہ تو ان میں کچھ مزید اوصاف بھی درکار ہوتے ہیں، مثلاً:

☆ عقائد ونظریات اور عملی زندگی کے لحاظ سے صالح ہونا۔

☆ دینی علوم میں لیاقت کے ساتھ عقائد وافکار کے لحاظ سے مسلمان ہونا۔

☆ احکام اسلامی کا متبع اور فضائل اخلاق سے آراستہ ہونا۔

☆ باطل نظریات سے مرعوب اور شکست خوردہ نہ ہونا۔

☆ علمی وعملی پندار میں مبتلا نہ ہونا۔

☆ قناعت پسند اور ایثار پیشہ ہونا۔ جاہ ومال کا حریص نہ ہونا۔

☆ اپنے اہل وعیال کو بھی حدود شرعیہ کی پابندی کرانا۔

☆ کیونکہ ان اوصاف کے بغیر دینی تعلیم وتربیت موثر نہ ہوگی۔

........☆☆☆........

باب ۱۸:

صدر مدرس اور اس کے فرائض

مدرسے میں صدر مدرس کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو جسم میں دماغ اور گاڑی میں ڈرائیور کی ہوتی ہے۔ ادارے کو چلانے اور تعلیم وتربیت کا معقول انتظام کرنے کا براہ راست وہی ذمہ دار ہوتا ہے۔ مدرسے کی کامیابی، ناکامی اور ترقی وتنزل کا بہت کچھ انحصار اسی پر ہے۔ ادارے کے ذمہ داروں اور اساتذہ، طلبہ، طلبہ کے سرپرستوں اور عام پبلک کو مطمئن رکھنا اور ان سب کا تعاون حاصل کرنا اسی کے ذمہ ہوتا ہے۔ مدرسے کا معیار، فضا اور نظم وانضباط اسی پر منحصر ہے۔ ظاہر ہے اتنی وسیع اور ہمہ گیر ذمہ داریاں اٹھانے اور اس منصب کے شایان شان ہونے کے لیے صدر مدرس میں مندرجہ ذیل اوصاف ہونے چاہئیں۔

اوصاف:

- ☆ اعلیٰ سیرت وکردار۔
- ☆ غیر معمولی احساس ذمہ داری۔
- ☆ فرض شناسی، لگن، انہماک اور سرگرمی سے خود کام کرنے اور دوسروں میں یہی سپرٹ پیدا کرنے کی فکر۔
- ☆ مردم شناسی۔
- ☆ معاملہ فہمی اور قوت فیصلہ۔
- ☆ انتظامی صلاحیت۔
- ☆ خوش اخلاقی وملنساری۔

- ☆ صبر واستقلال۔
- ☆ اپنے اور ادارے کو آگے بڑھانے کی فکر۔
- ☆ ہمدردی وخیر خواہی۔
- ☆ خندہ پیشانی سے تنقید برداشت کرنے، معترضین کو مطمئن کرنے اور لوگوں کے مشورے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی صلاحیت۔
- ☆ علمی لیاقت، تعلیم تجربہ اور مطالعہ ومشاہدہ کا شوق۔
- ☆ تعاون کرنے اور دوسروں کا تعاون حاصل کرنے کا سلیقہ۔
- ☆ خود اعتمادی اور دوسروں کو اعتماد میں لینے اور سب کا اعتماد حاصل کرنے کی صلاحیت۔
- ☆ غیر جانب داری اور بے تعصبی نیز پارٹی بندی سے پرہیز اور حق وانصاف کا پاس ولحاظ۔
- ☆ اصول وضوابط کی سختی سے پابندی اور دوسروں کو پابند بنانے کی کوشش۔

فرائض:

صدر مدرس کے فرائض اور ذمہ داریاں بہت وسیع اور مختلف نوع کی ہوتی ہیں، مدرسے کے چھوٹے بڑے تمام کاموں کا نگران اور ان کے بارے میں جواب دہ وہی ہوتا ہے۔ اس کے فرائض گوناگوں ہوتے ہیں۔ ذیل میں مختلف عنوانات کے تحت اس کے اہم فرائض درج ہیں۔

الف: نظم ونسق:

مدرسے کی عمارت میں توسیع ترمیم مرمت اور صفائی کا انتظام خود کرنا یا اس ضمن میں ذمہ داروں کو توجہ دلانا۔

- ☆ فرنیچر، تختہ سیاہ، نشست کے سامان وغیرہ کی فراہمی، مرمت اور صفائی ورنگائی۔
- ☆ حسب استطاعت ضروری تعلیمی سامان مثلاً نقشہ جات، گلوب، چارٹس سائنس اور حرفہ جات کے سامان، اساتذہ کے لیے امدادی کتب وغیرہ کی بروقت فراہمی۔

☆ مختلف قسم کی کھیلوں کے لیے ضروری سامان کی فراہمی۔

☆ ممبران سٹاف (اساتذہ وغیرہ) اوران کی ذمہ داریوں میں حسب ضرورت گنجائش واضافہ، ردوبدل وغیرہ۔ یہ سب کام حتی الامکان تعطیلات کلاں میں انجام پانے چاہئیں تاکہ تعلیمی کام شروع ہونے پر ہرج نہ ہو۔

☆ سال بھر کے کام کی اجمالی روداداور آئندہ کے منصوبہ جات کا خاکہ مرتب کرنا۔

☆ عمر اور استعداد کے لحاظ سے بچوں کا داخلہ اور جماعت بندی۔

☆ اسٹاف کے مختلف افراد کی صلاحیتوں کے مطابق فرائض کی تفویض اوران کی انجام دہی کے متعلق ضروری تفصیلات وہدایات۔

☆ نصابی مضامین اور بیرون نصاب مصروفیات ومشاغل اور جسمانی واخلاقی تربیت کا مفصل خاکہ اور نظام الاوقات بنانا اور حسب ضرورت ان میں تبدیلی کرنا۔

☆ درجات کے مانیٹر، کھیلوں کے کپتان، طلبہ کے اجتماعات اور دیگر بیرون نصاب مصروفیات کے لیے مختلف عہدیداران کا انتخاب یا نامزدگی وغیرہ کا اہتمام کرنا۔

☆ اسکول ریکارڈ (رجسٹر داخل خارج، رجسٹر حاضری طلبہ، رجسٹر حاضری اسٹاف، اسٹاک رجسٹر، معائنہ بک، اساتذہ کی ڈائریاں، طلبہ کے ترقی چارٹ، حسابات کے رجسٹر وغیرہ) سلیقہ اور پابندی سے رکھوانا۔

ب: نگرانی:

مدرسے میں چھوٹے بڑے نصابی، غیر نصابی جتنے کام بھی انجام پارہے ہوں، سب کی نگرانی صدر مدرس کے ذمہ ہوتی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ دیکھے کہ تمام کام بحسن وخوبی انجام پارہے ہیں۔ اگر کسی سلسلے میں کوئی کوتاہی ہورہی ہوتو اس کے تدارک کی مناسب تدبیر کرے، خصوصاً:

☆ حاضری اور پابندیٔ وقت کی نگرانی: صدر مدرس کو برابر دیکھتے رہنا چاہیے کہ مقررہ

وقت پر گھنٹی بجتی ہے اور اساتذہ وطلبہ حاضری کی پوری پابندی کرتے ہیں۔ بغیر معقول عذر کے غیر حاضری یا دیر حاضری کو ہرگز برداشت نہ کرنا چاہیے اور نہ بغیر اجازت درجے یا مدرسے سے باہر جانے دینا چاہیے۔ دونوں کے لیے حاضری رجسٹر رکھے جائیں، وقت پر حاضری ہو، رخصت کے لیے حتی الامکان تحریری طور پر اجازت لینے کا پابند بنایا جائے۔

☆ تدریس کی نگرانی: روزانہ کم از کم ایک بار ٹہل گھوم کر دیکھ لینا چاہیے کہ پڑھائی لکھائی محنت اور سلیقے سے ہو رہی ہے۔ درجات کا نظم وضبط ٹھیک ہے، تختہ سیاہ اور تعلیمی سامان کا باقاعدہ استعمال ہو رہا ہے۔ طلبہ کی نشست وغیرہ ٹھیک ہے۔ کبھی کبھی طلبہ کی کاپیاں منگا کر اندازہ لگا لینا چاہیے کہ تحریری کام صحت وصفائی کے ساتھ ہوتا ہے اور کاپیاں بروقت جانچی جاتی ہیں۔ اسی طرح آرٹ کرافٹ میں بچوں کے کیے ہوئے کام کا بھی کبھی کبھی جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ نئے اور ناتجربہ کار اساتذہ کے کام کی زیادہ نگرانی ہونی چاہیے۔ لیکن واضح رہے نگرانی کا یہ سارا کام اساتذہ کی غلطیاں پکڑنے کے جذبے سے نہیں بلکہ اساتذہ کی مشکلات کو دور کرنے، کام کو زیادہ بہتر طریقے سے انجام دینے میں رہنمائی کرنے اور تعمیری وہمدردانہ تنقید کی خاطر ہونا چاہیے۔ طلبہ کے سامنے اساتذہ کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی پکڑ ہرگز نہ ہونی چاہیے بلکہ دفتر میں بلا کر انفرادی ملاقاتوں میں سلیقے سے توجہ دلانی چاہیے۔

☆ تربیتی کام کی نگرانی: طلبہ کے عادات واطوار پر کڑی نظر رکھنی چاہیے اور ان کی دینی، اخلاقی اور عملی تربیت کے پروگرام پر کماحقہ عمل درآمد کی پوری نگرانی کرنی چاہیے۔ کوتاہیوں اور ڈسپلن کی خلاف ورزی کا بروقت نوٹس لینا چاہیے اور اس کے تدارک کی مناسب تدبیر کرنی چاہیے۔ اساتذہ اور سرپرست حضرات کو بھی اس طرف برابر توجہ دلاتے رہنا چاہیے اور خود بھی اس طرف غیر معمولی توجہ دینی چاہیے۔ تعلیم کا اونچے سے اونچا معیار بھی تربیت کی خامیوں کی تلافی نہیں کر سکتا۔ اس لیے تربیت کے معاملہ میں کسی کوتاہی کو انگیز نہیں کرنا چاہیے۔

☆ **دفتری کام کی نگرانی:** رجسٹروں کی تکمیل، درخواستوں کے نمٹانے، خطوط کے بروقت جواب دینے، باقاعدگی سے حساب کتاب رکھنے اور اساتذہ سے متعلق ماہانہ رپورٹوں، ڈائریوں، رجسٹر حاضری، طلبہ کے ترقی چارٹ کی تکمیل وغیرہ پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔

☆ **صحت وصفائی کی نگرانی:** طلبہ کے جسم ولباس مسجد، مدرسے کے کمرے، برآمدے اور احاطے، پاخانہ، پیشاب خانہ اور نالیوں وغیرہ کی صفائی کی بھی برابر دیکھ بھال کرنی چاہیے۔ کبھی کبھی طلبہ کی صحت کی جانچ اور ٹیکہ وغیرہ کا بندوبست ہونا چاہیے۔

☆ **کھیلوں کی نگرانی:** بچوں کے لیے کھیل بھی نہایت ضروری ہیں۔ بچوں کی عمر اور جسمانی حالت کا لحاظ کر کے ان کے گروپ بنا دیے جائیں۔ مختلف قسم کے کھیلوں، ڈرل، پی ٹی وغیرہ کا باقاعدہ بندوبست کیا جائے۔ کھیل سے دلچسپی رکھنے والے اساتذہ کو ان گروپوں کا نگران مقرر کیا جائے۔ صدر مدرس کو خود بھی دیکھتے رہنا چاہیے کہ کھیل پابندی سے ہوتے ہیں، ہر گروپ کو کھیلنے کا موقع ملتا ہے اور ذمہ دار اساتذہ دلچسپی اور تندہی سے نگرانی کرتے ہیں۔ کھیلوں میں کبھی کبھی خود بھی شرکت کی جا سکے تو دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس طرف بھی خاص توجہ دینی چاہیے کہ کھیل کود میں بے ایمانی اور مسابقت میں جھگڑے وغیرہ کی نوبت نہ آنے پائے۔ بچوں کو ذہن نشین کرا دیا جائے کہ ایمان داری کو ہار جیت پر مقدم سمجھیں اور ہار ہو یا جیت، آپے سے باہر نہ ہوں بلکہ کھلاڑیوں کی اسپرٹ سے کھیلیں۔

☆ **اقامت گاہ کی نگرانی:** اقامت گاہوں میں طلبہ کو عموماً اس غرض سے رکھا جاتا ہے کہ ان کی تربیت و پرورش زیادہ بہتر طریقے سے ہو گی۔ صدر مدرس کو دیکھتے رہنا چاہیے کہ بچوں کی اخلاقی و عملی تربیت کا معقول بندوبست کیا جاتا ہے۔ کھانے کا انتظام اطمینان بخش ہے۔ صحت وصفائی کی پوری فکر کی جاتی ہے۔ اقامت گاہ کی زندگی میں طلبہ کو سب سے زیادہ شکایت کھانے کی ہوتی ہے۔ اس طرف خصوصی توجہ ہونی چاہیے۔ کھانے کے انتظام میں حتی الامکان طلبہ کی پسند اور مشوروں کا لحاظ رکھنا چاہیے تا کہ انہیں بے اطمینانی نہ ہو۔ اقامت

گاہوں میں جہاں تربیت کے اچھے مواقع ہوتے ہیں، وہاں بعض بگڑے ہوئے بچوں کی وجہ سے اخلاقی خرابیاں پیدا ہونے کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ اس کی بہت زیادہ دیکھ بھال ہونی چاہیے۔

☆ اس بات کی بھی نگرانی ہونی چاہیے کہ طلبہ اقامت گاہ کی صفائی، مطبخ کا انتظام، علیل طلبہ کی تیمارداری، کھلانے پلانے کا انتظام، نماز کی اقامت، دارالمطالعہ اور بچوں کی دکان وغیرہ کا اہتمام انفرادی واجتماعی طور پر خود انجام دیں۔ سادہ زندگی، محنت ومشقت اور ہر طرح کا کام خود کر لینے کے عادی بنیں۔ حفظان صحت کے اصولوں اور معاشرتی آداب کے پابند بنیں۔ فرصت کے اوقات میں ان کی مصروفیت اور دلچسپی کا بھی پورا اہتمام کیا جائے۔

☆ **مختلف مصروفیات، مشاغل اور منصوبہ جات کی نگرانی:** بچوں کے تربیتی وتقریری اجتماعات، بیت بازی، بحث ومباحثہ، مذاکرہ، خدمت خلق کے شعبہ، ہابیز، پکنک، تعلیمی سیر وسیاحت، اہم افراد کے ذریعہ خطاب، تعلیمی ہفتے اور مدرسے کی دیگر تقریبات، ابتدائی طبی امداد، مدرسے کی دکان، عجائب خانہ، نمائش وغیرہ کی بھی مناسب نگرانی ہونی چاہیے، تاکہ یہ تمام کام بحسن وخوبی اور ہم آہنگی کے ساتھ انجام پاتے رہیں۔

☆ **دارالمطالعہ اور لائبریری کی نگرانی:** دارالمطالعہ میں ضروری اور مفید اخبار ورسائل منگوانے کا اہتمام ہونا چاہیے اور اس بات کی پوری دیکھ بھال ہونی چاہیے کہ اساتذہ اور طلبہ ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اسی طرح لائبریری کو بھی مختلف مضامین کی ضروری اور مفید کتب سے آراستہ رکھنے اور طلبہ واساتذہ کو ان سے استفادہ کرنے کا انتظام ہونا چاہیے۔

واضح رہے ان مختلف امور کے ذمہ دار، یوں تو مختلف اساتذہ، مانیٹر یا طلبہ کی ٹولیاں ہوں گی جنہیں اپنی صوابدید سے کام کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع ملیں گے نگرانی بہر حال صدر مدرس ہی کے ذمہ ہوگی اور نگرانی کا مقصود ان کی غلطیاں پکڑنا نہیں بلکہ ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک انجام دینے کے لیے مناسب مشورے دینا، تدابیر بتانا اور صحیح رہنمائی کرنا ہوگا۔

ج: تدریسی کام:

صدر مدرس کو باقاعدہ تدریس کی بھی کچھ نہ کچھ ذمہ داری ضرور لینی چاہیے۔لیکن تدریس کا یہ کام کسی ایک ہی درجے تک مخصوص نہ ہو بلکہ مختلف درجات میں منقسم ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ درجات کے طلبہ سے ربط قائم ہو سکے۔اس طرح وہ بچوں کی اخلاقی وعلمی ترقی کا براہ راست اندازہ کر سکے گا اور مختلف مضامین کے سلسلے میں تدریس کا عملی نمونہ بھی پیش کر سکے گا لیکن تدریس کا یہ کام ہفتے میں اٹھارہ بیس پیریڈ سے زیادہ نہ ہوتا کہ وہ دوسرے متعلقہ فرائض کو بحسن وخوبی انجام دینے کے لیے یکسوئی سے وقت نکال سکے۔

د: امتحانات، جانچ، جائزے اور معائنہ وغیرہ کا اہتمام:

طلبہ کی تعلیم وتربیت کے ضمن میں ادارے کی اجتماعی کوششوں کا اندازہ لگانے کے لیے امتحانات اور جائزوں وغیرہ کی غیر معمولی اہمیت ہے۔اس کے لیے ہفتہ وار اور ماہانہ جانچ، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحانات، دینی اخلاقی، معاشرتی اور عملی زندگی کے وقتاً فوقتاً جائزے، تقاریر، مضمون نگاری، بیت بازی، خوشخطی، آرٹ کرافٹ اور کھیلوں کے مقابلے، ذہنی آزمائش۔نیز وقتاً فوقتاً ذمہ داران ادارہ اور دوسرے ماہرین تعلیم کے معائنوں کا اہتمام ہونا چاہیے۔ان جائزوں میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

۱۔ ہر حال میں ایمان داری برتی جائے اور ایمان داری کو کامیابی یا ناکامی پر ترجیح دی جائے۔

۲۔ صحیح جائزہ لینے کی کوشش کی جائے۔خوش گمانی، بدگمانی اور جائزہ لینے والوں کی ذاتی آرا کو کم سے کم دخل ہو۔

۳۔ ان کے لیے مصنوعی اہتمام نہ کیا جائے بلکہ یہ جائزے مدرسے کے معمولات کا فطری جز معلوم ہوں، جائزہ لینے والوں یا معائنہ کرنے والوں کو غلط فہمی یا مغالطہ میں ڈالنے کے لیے ان مواقع پر بعض لوگ جو خصوصی اہتمام کرتے ہیں وہ ایک طرح کا فریب اور ادارے

اور نیز صدر مدرس اور اسٹاف کے وقار کے منافی ہے۔ ان حرکات سے ہر حال میں پرہیز کیا جائے۔

۴۔ جانچ کے نتائج سے طلبہ کے سرپرستوں اور ذمہ داران ادارہ کو برابر مطلع کیا جائے اور اصلاح حال کے لیے مناسب تجاویز، تدابیر اور مشورے دیئے جائیں۔

۵۔ نتائج کی روشنی میں ممبران اسٹاف اپنی کوششوں، طریق تعلیم وتربیت وغیرہ میں مناسب ترمیم کریں اور کوتاہیوں کی آئندہ تلافی کا منصوبہ بنائیں۔

ھ: رابطے.

اپنے فرائض کو بحسن وخوبی انجام دینے کے لیے صدر مدرس کو مختلف لوگوں کے تعاون کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ظاہر ہے یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ ان تمام لوگوں سے خصوصی رابطہ رکھے جن کے تعاون کی اسے ضرورت ہے، مثلاً:

☆ **اساتذہ سے رابطہ:** اساتذہ سے ہمدردی اور رفاقت کا تعلق نہایت ضروری ہے۔ یہی لوگ صدر مدرس کے ہاتھ پیر ہیں اور انہی کی مدد سے تعلیم وتربیت کا سارا کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ ان کو مطمئن رکھنا، ان کے مشوروں سے پورا فائدہ اٹھانا، ان کی مشکلات کو دور کرنے کی کوشش کرنا، ان سے خوش اخلاقی اور محبت سے پیش آنا ضروری ہے۔ اس کے لیے ان سے انفرادی ملاقاتیں کرنا، اسٹاف کے اجتماعات منعقد کرنا، مفوضہ فرائض کو انجام دینے کے ضمن میں ان سے منصوبے بنوانا اور ہر ممکن مدد ورہنمائی کرنا ضروری ہے۔ البتہ حسن سلوک کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اصول وضابطوں میں ڈھیل برتی جائے یا کام چوری، لاپروائی، بے ضابطگی اور قابل اعتراض حرکات کی چھوٹ دی جائے۔ ان امور میں سختی سے گرفت ہونی چاہیے اور اصلاح حال کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

☆ **طلبہ سے رابطہ:** کوشش تو یہی ہونی چاہیے کہ ادارے کے تمام طلبہ سے صدر مدرس کا

براہ راست ربط ہو لیکن اگر تعداد بہت زیادہ ہو تو کم از کم تمام درجات کے مانیٹروں، مختلف ٹولیوں کے سربراہ کاروں، کھیل کے کپتان، جمعیۃ کے عہدہ داران وغیرہ سے تو لازماً رابط رکھنا چاہیے۔ اس طرح طلبہ کو مطمئن رکھنے اور ان کا تعاون حاصل کرنے نیز ان کی مناسب تربیت کرنے کے مواقع ملیں گے۔

طلبہ کے سرپرستوں سے رابطہ:

ملاقاتوں یا خط وکتابت کے ذریعے نیز مدرسے کی تقریبات میں شرکت کی دعوت دے کر طلبہ کے سرپرستوں سے بھی رابطہ قائم کیا جائے تاکہ بچوں کی تعلیم وتربیت میں ان کا تعاون حاصل ہو سکے۔

ملاقات پر ان سے خوش اخلاقی سے پیش آیا جائے۔ ان کی تنقیدیں خندہ پیشانی سے سنی جائیں۔ ان کے بچوں کی تعلیم وتربیت اور ادارے کی بہتری کے لیے ان سے مشورے مانگے جائیں اور ہمدردی کے ساتھ ان کے فرائض سمجھائے جائیں۔

دوسرے تعلیمی اداروں کے ذمہ داروں سے رابطہ:

پاس پڑوس یا قریب کے دوسرے تعلیمی اداروں سے بھی ربط رکھنا چاہیے۔ کبھی کبھی ان کے یہاں جا کر ان کی سرگرمیوں کا جائزہ لینا چاہیے اور ان سے تبادلہ خیال کر کے ان کے تجربات ومشوروں سے استفادہ کرنا چاہیے۔ انہیں مدرسے کی تقریبات میں شرکت کے لیے مدعو کرنا چاہیے۔

پبلک سے ربط:

دینی مدارس کے لیے پبلک کا تعاون بے حد ضروری ہے۔ پبلک کے ذمہ دار افراد سے بھی ربط قائم کرنے اور مدرسے کی بہتری کے لیے ان کا تعاون حاصل کرنے کی بھی کوشش ہونی چاہیے۔ پبلک کا تعاون اسی وقت حاصل ہو سکے گا جب صدر مدرس مقامی پارٹی بندیوں وغیرہ سے

الگ رہے اور پبلک کی فلاح و بہبود اور ان کی اصلاح کے ضمن میں اپنے مقدور بھر کوشش کرے۔

مندرجہ بالا مباحث سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صدر مدرس کی ذمہ داریاں بہت وسیع اور مختلف النوع ہیں، اور وہ اپنے فرائض سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتا ہے جب وہ نہایت فرض شناسی، تندہی، خدا ترسی، خوش اخلاقی اور صبر و استقامت سے کام لے۔

..........☆☆☆..........

باب ۱۹:

معلم درجہ (کلاس ٹیچر)
اور اس کے فرائض

طلبہ کی عمر، صلاحیت اور استعداد کے لحاظ سے انہیں مختلف جماعتوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے ہر جماعت میں کم وبیش ۲۵، ۳۰ طلبہ ہوتے ہیں۔ جہاں تک تدریس کا تعلق ہے ایک جماعت کے مختلف مضامین ومشاغل مختلف اساتذہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ لیکن ابتدائی درجات میں مناسب یہی ہوتا ہے کہ ایک درجے کے بیشتر مضامین ایک ہی معلم کے سپرد ہوں اور جس معلم کے زیادہ گھنٹے ہوں اسی کو درجے کا معلم (کلاس ٹیچر) مقرر کر دیا جائے۔ کلاس ٹیچر جہاں بیشتر مضامین کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہیں اپنے درجے کے ضمن میں اس پر مندرجہ ذیل ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔

☆ پابندی سے وقت پر اپنے درجے کی حاضری لینا۔

☆ حاضری کے بعد تعلیم وتربیت سے متعلق طلبہ کو ضروری ہدایات دینا اور ہدایات پر عمل کا جائزہ لیتے رہنا۔

☆ پابندی سے وقت پر حاضر ہونے کے لیے طلبہ کو ابھارنا اور آمادہ کرنا نیز ضرورت ہو تو ان کے سرپرستوں کو توجہ دلا کر پابندی کرانا۔

☆ غیر حاضری کے اسباب کی معقولیت کا اندازہ لگانے کے لیے ضرورت ہو تو بچے کے سرپرست سے ربط قائم کرنا۔

☆ اگر بچہ علیل ہو تو وقت نکال کر عیادت کو جانا اور جو کچھ کر سکتے ہوں بچے کے لیے کرنا۔

☆ طلبہ میں یہ اسپرٹ پیدا کرنا کہ بغیر معقول عذر کے وہ غیر حاضر نہ ہوں اور اگر معقول اسباب کی بناء پر غیر حاضری یا رخصت کی ضرورت پیش آئے تو درخواست کے ذریعے پہلے سے رخصت حاصل کرلیا کریں۔ اگر خود نہ کر سکتے ہوں تو اپنے سرپرست یا اور کسی ذمہ دار کی معرفت اجازت حاصل کریں۔

☆ بغیر معقول عذر یا بغیر اجازت کے غیر حاضر ہونے پر سختی سے باز پرس کرنا اور آئندہ احتیاط کے لیے ان کے سرپرستوں کو توجہ دلانا۔

☆ طلبہ سے درجہ کے آداب کی پابندی کرانا مثلاً:

الف۔ سلام کرکے درجے میں آنا یا واپس جانا۔

ب۔ اجازت لے کر درجے سے باہر جانا۔

ج۔ فرش پر بیٹھتے ہوں تو جوتے ایک طرف سلیقے سے رکھنا۔

د۔ درجے میں شور و شغب یا مار پیٹ اور چھیڑ چھاڑ سے پرہیز کرنا۔

ھ۔ سلام کرکے اور اجازت لے کر دوسرے درجات میں داخل ہونا۔

و۔ تاخیر سے آنے پر اجازت لے کر اندر آنا۔

ز۔ بات چیت میں آداب کا لحاظ رکھنا اور سلیقے سے سوال کرنا یا جواب دینا (مسکراتے، کھجلاتے ہوئے منہ یا ناک میں انگلی ڈال کر یا بے ڈھنگے طریقے سے کھڑے ہو کر سوال کریں یا جواب دیں تو ان کی بروقت اصلاح کی جائے)۔

ح۔ سوال جواب، بات چیت، سامان کی تقسیم وغیرہ اور عام اجتماعی مواقع پر اپنی باری کا لحاظ کرنا۔

ط۔ اپنی جگہ کو صاف ستھرا اور اپنے سامان کو ترتیب اور سلیقے سے رکھنا۔

م۔ اپنی باری پر درجے، برآمدے یا صحن کو صاف ستھرا کرنا اور سامان کو ترتیب دے کر قرینے سے رکھنا۔

ن۔ صفائی کے بعد کوڑا کرکٹ ایک طرف ٹن یا ٹوکری میں جمع کر کے کوڑے کی جگہ پر ڈال آنا۔

و۔ کاغذ کے ٹکڑے، پھلوں کے بیج اور چھلکے وغیرہ کو ادھر ادھر بکھیرنے کے بجائے کوڑے دان میں ڈال آنا۔

ہ۔ درجے کے مانیٹر، کھیل کے کپتان، ٹولی کے نگران، اجتماعات کے عہدہ داران وغیرہ کی معروف میں اطاعت اور فرائض کی انجام وہی میں ان سے پورا تعاون کرنا۔

ی۔ درجے کی آرائش، صفائی اور بھلائی و بہتری کے لیے آپس میں تعاون کرنا۔

☆ مہینے میں کم از کم ایک بار:

الف۔ طلبہ کے تعلیمی سامان، کتب، کاپیوں، جیومیٹری بکس، رنگ کے ڈبوں، کرافٹ کے اوزار وغیرہ کا جائزہ لینا اور ان اشیاء کی حفاظت، ترتیب اور صفائی کے لیے ضروری ہدایات دینا۔

ب۔ اگر موسم موافق ہو تو تعلیمی سیر و سیاحت (اسکرشن) یا پکنک (تفریح) کے لیے لے جانا (پکنک یا سیر و سیاحت پر باہر لے جانے سے پہلے مقصد متعین کر کے طلبہ کو مطلع کر دیا جائے۔ نیز ضروری تیاری کر کے جملہ کام طلبہ میں انفرادی طور پر یا ٹولیاں بنا کر تقسیم کر دیا جائے۔ حتی الامکان سارا کام اپنی نگرانی میں طلبہ ہی کو کرنے دیا جائے۔ تا کہ تعلیمی سیاحت یا پکنک کا مقصد بدرجہ اتم حاصل ہو سکے)

ج۔ عام صحت و صفائی کا جائزہ لینا اور جسم و لباس کی صفائی، غسل، حجامت، ناخن ترشوانے وغیرہ کے متعلق حسب ضرورت ہدایات دینا۔

د۔ طلبہ کے ہفتہ وار اجتماعات میں ہر بچے کو مہینے میں کم از کم ایک بار عملی حصہ لینے یعنی تقریر کرنے، نظم یا کہانی سنانے وغیرہ پر آمادہ کرنا۔

ھ۔ ہر بچے سے انفرادی ملاقات کر کے پڑھنے لکھنے یا عادات و اطوار سے متعلق قابل توجہ امور کی طرف توجہ دلانا۔

و۔ ترقی کا جائزہ لے کر نتیجہ سے سرپرست کو مطلع کرنا۔

☆ اپنے درجے کے طلبہ کے سرپرستوں سے نجی ربط رکھنا۔ کبھی کبھی سرپرستوں سے ملاقات کر کے یا خط وکتابت کے ذریعے ان کے بچوں کی تعلیم وتربیت سے متعلق مناسب مشورے دینا اوران کا تعاون حاصل کرنا۔

☆ درجے کی صفائی، اجتماعات، پکنک، تعلیمی سیروسیاحت، قلمی رسالے، درجے کی آرائش، تعلیمی ہفتے یا مدرسے کی مختلف تقریبات اور دیگر بیرون نصاب مصروفیات وغیرہ کے انتظامات میں درجے کے تمام طلبہ کوان کی استعداد کے مطابق ذمہ داریاں سپرد کر کے انہیں کماحقہ انجام دینے کا طریقہ سکھانا۔

☆ طلبہ کے ہفتہ وار اجتماعات پابندی سے منعقد کرانا اور مدرسے کے ماہانہ بڑے اجتماعات یا مدرسے کی تقریبات وغیرہ میں اپنے درجے کی مناسب نمائندگی کے لیے بچوں کو تیار کرنا۔ کبھی کبھی درجے کے تمام بچوں کے اجتماعی کھانے کا اہتمام کرانا۔

☆ اپنے درجے کے تمام طلبہ کی دینی، تعلیمی، اخلاقی اور جسمانی حالت پر نظر رکھنا، ان کے ضمن میں ضروری ریکارڈ رکھنا اور حسب ضرورت انفرادی واجتماعی توجہ دلانا، نیز اصلاح حال کی پوری کوشش کرنا۔

☆ کوتاہیوں اور کمزوریوں پر قابو پانے کے لیے طلبہ میں خود اعتمادی اور ندامت وغیرہ کا جذبہ ابھارنا (یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب طلبہ کے ساتھ شفقت ومحبت سے پیش آیا جائے۔ ان کی عزت نفس کا پورا لحاظ رکھا جائے۔ تعلیم وتربیت میں لعن وتشنیع، ڈانٹ پھٹکار، سختی اور جسمانی سزا سے حتی الامکان گریز کیا جائے اور محبت، ہمدردی اور دل سوزی کو شعار بنایا جائے)۔

☆ درجے کے سامنے قابل تقلید اسوہ پیش کرنا (طلبہ کی سیرت وکردار پر سب سے زیادہ اثر اور پرتو اساتذہ کی عملی واخلاقی زندگی کا پڑتا ہے۔ اساتذہ میں بھی خاص طور پر وہ اپنے کلاس ٹیچر سے اپنائیت محسوس کرتے اوران کے کردار سے متاثر ہوتے ہیں ان کے سامنے جن

خوبیوں کو یا خامیوں کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، انہی کی وہ شعوری اور غیر شعوری تقلید کرتے ہیں۔ اگر اساتذہ کے قول وفعل میں مطابقت نہ ہو تو طلبہ کی سیرت بے حد متاثر ہوتی ہے۔ اس لیے اساتذہ کو بہترین اسوہ پیش کرنا چاہیے۔ خصوصاً اصول وضوابط اور اوقات کی پابندی، شائستہ طرز تکلم، اسلامی وضع قطع، خوش اخلاقی، ہمدردی، ایثار، تعاون اور فرائض کی انجام دہی میں لگن اور انہماک وغیرہ کے ضمن میں)

☆ رجسٹر حاضری، ڈائری، ترقی چارٹ اور در۔ جے کے دوسرے ریکارڈ رکھنا۔

............☆☆☆..........

باب ۲۰:

معلم مضمون (سبجیکٹ ٹیچر)
اور اس کے فرائض

ہر معلم کو ایک بار کئی مضامین پڑھانے پڑتے ہیں، بحیثیت معلم مضمون ہر معلم کو مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

☆ گھنٹہ شروع ہونے کے بعد جلد از جلد درجے میں پہنچنا اور گھنٹہ ختم ہوتے ہی جلد از جلد دوسرے معلم کے لیے جگہ خالی کر دینا۔

☆ سلام کر کے درجے میں داخل ہونا اور سلام کر کے واپس جانا۔

☆ درجے میں داخل ہوتے ہی مندرجہ ذیل پر ایک سرسری نظر ڈال لینا اور تدریس شروع کرنے سے پہلے حتی الامکان مناسب کارروائی کر دینا۔

الف۔ بچوں کے جوتے ایک طرف قرینے سے رکھے ہیں (بشرطیکہ بچے فرش پر بیٹھتے ہوں)

ب۔ درجہ صاف ستھرا ہے اور تمام سامان (ڈیسک، بنچ، تختہ سیاہ وغیرہ) سلیقے سے لگا ہوا ہے۔

ج۔ تمام طلبہ حاضر ہیں؟ اگر نہیں تو غیر حاضری کا سبب۔

د۔ بلیک بورڈ صاف ہے۔

ھ۔ طلبہ کے تعلیمی سامان (متعلقہ مضمون سے غیر متعلق) ادھر ادھر بکھرے ہوئے تو نہیں ہیں۔

و۔ طلبہ غیر متعلق کام میں تو مصروف نہیں ہیں؟

ز۔ چاک، ڈسٹر، توضیحی سامان (چارٹ، نقشے، گلوب وغیرہ) موجود ہیں۔

☆ مناسب اور مختصر تمہید کے ذریعے طلبہ کو آمادہ کر کے تدریس شروع کرنا۔

☆ نیا سبق شروع کرنے سے قبل اختصار سے پچھلے کا اعادہ کرانا۔

☆ تدریس کا کام ہمیشہ اوسط لیاقت کے طلبہ (جن کی تعداد درجے میں نصف سے زیادہ ہوتی ہے) کی رفتار سے انجام دینا (البتہ غیر معمولی ذہین یا غیر معمولی کمزور طلبہ کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ انہیں بھی ان کی رفتار سے آگے بڑھنے کا موقع فراہم کیا جائے اور حسب ضرورت آگے بڑھانے میں ان پر خصوصی توجہ دی جائے۔ کمزور طلبہ انفرادی توجہ کے زیادہ مستحق ہوتے ہیں۔ انہیں بھی بہرحال ساتھ لے کر چلنا چاہیے)

☆ دوران تدریس مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہیں۔

الف۔ انداز بیان عام فہم اور دلکش ہو۔

ب۔ استاد کو سبق پڑھانے میں خود لطف آ رہا ہو اور وہ غیر معمولی دلچسپی اور شغف کا مظاہرہ کرے۔

ج۔ کبھی کبھی سوالات کر کے اندازہ کر لیا کرے کہ سبق کو طلبہ بخوبی سمجھ رہے ہیں۔

د۔ طلبہ کا طرز نشست یا کھڑے ہونے کا انداز، کتاب کی گرفت، کتاب اور آنکھوں کے درمیان کا فاصلہ مناسب ہے۔

ہ۔ سبق کو آگے بڑھانے میں طلبہ عملی دلچسپی لے رہے ہیں۔

و۔ پوری جماعت متوجہ ہے، کوئی طالب علم غیر متعلق کام میں تو منہمک نہیں ہے۔

ز۔ بلیک بورڈ کا مناسب استعمال ہو رہا ہے۔ سبق کو واضح کرنے کے لیے توضیح، تمثیل، چارٹس وغیرہ سے مدد لی جا رہی ہے۔

ح۔ سوال و جواب یا گفتگو میں طلبہ اپنی باری، ادب و شائستگی کا لحاظ رکھتے ہیں۔

ط۔ طلبہ کے سوالات یا اعتراضات کے تشفی بخش جوابات دیئے جا رہے ہیں۔

ی۔ روزانہ زندگی سے سبق کا ربط ملایا جا رہا ہے۔

ک۔ اسباق بسم اللہ پڑھ کر شروع کیے جاتے ہیں۔

☆ عملی اور تحریری کام کے دوران مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہیں۔

الف۔ طلبہ کی نشست ٹھیک ہو، کمر سیدھی رہے۔ کاپی اور آنکھ کے درمیان فاصلہ مناسب ہو۔

ب۔ قلم، اوزار یا برش کی گرفت صحیح ہو اور کام صحت وصفائی سے انجام دیا جائے۔

ج۔ درجہ میں ٹہل گھوم کر حسب ضرورت انفرادی امداد دی جائے۔

د۔ حاشیہ، تاریخ، عنوان، پیراگراف، ڈیش وغیرہ کا لحاظ رکھا جائے۔

ہ۔ طلبہ سیاہی یا رنگ ادھر ادھر پھیلانے، چھڑکنے یا انگلیوں میں بھرنے نہ پائیں۔

و۔ کاپی، قلم، برش، پنسل یا دوسرے سامان کا استعمال مناسب طریقے سے ہو۔

☆ تحریری کام ہو یا ہوم ورک جلد از جلد جانچ کر واپس کیا جائے۔

☆ ہفتے میں پانچ دن پڑھایا جائے اور ایک دن اعادہ کے لیے رکھا جائے بہت زیادہ پڑھا دینے کے لالچ میں اعادہ سے غفلت بہت مضر ہوتی ہے۔

☆ ہفتہ وار یا ماہانہ پابندی سے جانچ (Test) کر کے ریکارڈ رکھا جائے۔

☆ سال بھر کے کام کو میقات وار، ماہوار اور ہفتہ وار اکائیوں میں تقسیم کر کے حتی الامکان منصوبے کے مطابق کام کیا جائے لیکن اعادہ کی پوری گنجائش رکھی جائے۔

☆ طلبہ کی عمر، ان کی دلچسپیوں نیز صحت اور کام کے مواقع کا لحاظ رکھ کر ہوم ورک دیا جائے۔

☆ ابتدائی جماعتوں میں جہاں تک ہو درجے میں کیے ہوئے کام ہی پر اکتفا کرنا چاہیے۔

☆ ہوم ورک پر حتی الامکان بھروسہ نہ کیا جائے۔

☆ اپنے مضمون کو آسان اور دلچسپ بنانے کے لیے ضروری توضیحی سامان اور چارٹ وغیرہ تیار یا فراہم کیے جائیں۔

☆ دوران تدریس اگر طلبہ سے کسی اخلاقی کمزوری یا آداب کی خلاف ورزی کا اظہار ہو تو بروقت اصلاح کی جائے یا حالات متقاضی ہوں تو بعد میں علیحدہ بلا کر سمجھا دیا جائے۔

☆ متعلقہ مضمون میں اپنی لیاقت بڑھانے اور تدریسی فرائض کو بخوبی انجام دینے کے لیے

استاد کو پابندی سے کچھ مطالعہ کرتے رہنا چاہیے۔

☆ معلم مضمون کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ طلبہ میں اس مضمون سے لگاؤ پیدا ہو جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ معلم کو اپنے مضمون سے خود بہت لگاؤ ہو اور وہ تدریس میں طلبہ کی دلچسپی اور آسانی کا لحاظ رکھے۔

☆ طلبہ کے سامنے اچھی سیرت و کردار کا مظاہرہ کیا جائے۔

دینی مدارس کے اساتذہ کے گونا گوں فرائض:

یہ تو تھے وہ فرائض جو ہر ادارے کے معلمین کو انجام دینے ہی پڑتے ہیں۔ رہے دینی اداروں کے اساتذہ تو ان سے کچھ مزید توقعات وابستہ کی جاتی ہیں مثلاً:

☆ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ محنت اور خلوص سے تدریس کے فرائض انجام دینا۔

☆ مادہ پرستی کے اس دور میں جب کہ ہر ایک دنیوی علوم کی طرف بڑھ رہا ہے اور اسکولوں کالجوں کا رخ کر رہا ہے، طلبہ اور ان کے سرپرستوں کو دینی تعلیم کی ضرورت و اہمیت کا احساس دلانا۔

☆ محدود وسائل اور محدود اسٹاف سے کام چلانا۔

☆ دینی تعلیم اور مادری زبان کے ساتھ دیگر مضامین میں بھی معیار اونچا کرنا۔

☆ قلت مشاہرہ پر قناعت اور کثرت کار پر تسلیم و رضا کا مظاہرہ کرنا۔

☆ تعلیم کے ساتھ محبت و شفقت سے بچوں کی تربیت و اصلاح کرنا۔

☆ اپنے حسن سلوک اور پاکیزہ اسوے سے دین و ملت اور دینی اداروں، شخصیتوں سے انس و لگاؤ پیدا کرنا۔

☆ مدرسے کو پبلک کی توجہ اور دلچسپیوں کا مرکز بنانا اور اس کی بہتری کے لیے سب کا تعاون حاصل کرنا۔

☆ مدرسے کو آبادی میں دین کی تبلیغ واشاعت کا مرکز بنانا اور اس کے واسطے سے بچوں کے سرپرستوں کی بھی دینی تربیت کرنا۔

☆ پارٹی بندی سے دامن بچاتے ہوئے ہر مکتب خیال کے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا۔

☆ عموماً خود ہی فنڈ بھی فراہم کرنا اور مدرسے کو اپنے بل بوتے پر چلانا۔

☆ منتظمین ادارہ کو مطمئن کرنا اور معترضین کے اعتراضات وشکوک کا ازالہ کرنا۔

☆ تعلیمی محکمے کے مقامی ملازمین سے نمٹنا وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ ان گوناگوں فرائض سے عہدبرآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆

باب ۲۱:

جسمانی تربیت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ (نائب یا مانیٹر) بنایا ہے، اس منصب کے شایان شان اسے ایک سڈول جسم عطا فرمایا ہے۔ جسم میں متعدد ضروری اور متوازن اعضا رکھے ہیں۔ طرح طرح کی قوتیں اور صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ انسان کی قوتیں و صلاحیتیں اسی وقت ٹھیک بروئے کار آسکتی ہیں جب اس کا جسم تندرست و توانا ہو، اس لیے ہمیں بچے کی جسمانی نشوونما اور صحت و تندرستی کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے۔ یہ کام گھر اور مدرسے دونوں کے تعاون کے بغیر ممکن نہ ہوگا۔

جسمانی نشوونما کے لیے ضروری چیزیں:

صحت و توانائی کے لیے مندرجہ ذیل چیزیں ضروری ہیں:

۱۔ متوازن غذا۔

۲۔ صاف پانی۔

۳۔ تازہ ہوا۔

۴۔ کافی روشنی۔

۵۔ جسمانی محنت یا ورزش اور کھیل۔

۶۔ موزوں لباس۔

۷۔ صفائی ستھرائی۔

۸۔ گہری نیند۔

۹۔ مسرت وشادمانی۔

۱۰۔ پاکیزہ سیرت۔

ا۔ غذا:

جسم کی مناسب نشوونما کے لیے سب سے ضروری چیز متوازن غذا ہے۔ پیدائش کے بعد بچے کے لیے سب سے موزوں غذا ماں کا دودھ ہے۔ جو بچے کسی وجہ سے ماں کے دودھ سے محروم رہ جاتے ہیں وہ عموماً طرح طرح کی جسمانی کمزوریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے جب تک انتہائی مجبوری نہ ہو، ماں کے دودھ سے ہرگز محروم نہ کیا جائے۔ دودھ چھڑانے کے بعد بھی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ بچے کو مناسب مقدار میں دودھ ملے اور دوسری غذائیں بھی پتلی اور زود ہضم ہوں۔ اس کے بعد بتدریج توازن کے ساتھ وہ تمام حلال وطیب غذائیں کھائی اور کھلائی جا سکتی ہیں جو عزت وآبرو کے ساتھ جائز طریقے سے میسر آ سکیں۔ البتہ کھانے میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا جائے۔

☆ غذا حتی الامکان متوازن ہو یعنی غذا میں وہ تمام اجزاء مناسب مقدار میں شامل ہوں جو جسم کی مناسب نشوونما کے لیے ضروری ہیں۔

☆ سادہ اور زود ہضم ہو، یعنی بہت زیادہ چٹپٹی، مسالہ دار، مرغن یا میٹھی نہ ہو اور نہ جسم میں ہیجان پیدا کرنے والی یا نشہ آور ہو۔

☆ صاف ستھری ہو یعنی اناج، سبزی یا سالن وغیرہ پکانے سے پہلے خوب صاف ستھرا کر لیا جائے۔ صاف برتن میں پکایا اور کھایا جائے۔ مکھی اور گرد وغبار سے کھانے کو بچایا جائے۔ خوانچہ والوں کی چیزوں سے پرہیز کیا جائے۔

☆ سلیقے سے پکی ہو تاکہ مزیدار اور زود ہضم ہو جائے۔ رغبت سے کھائی جائے اور جزو بدن بن سکے۔

☆ موسمی پھل اور سبزیاں، دودھ، گھی، گوشت، مچھلی، انڈا وغیرہ میں سے جو میسر آسکیں، غذا کا لازمی جزو بنائی جائیں۔ پاس پڑوس سے موسمی پھل اور ترکاریاں تو بہر حال حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

☆ حتی الامکان تر و تازہ ہو، سڑی گلی باسی یا ڈبوں میں بند غذاؤں سے گریز کرنا چاہیے۔

☆ بھوک خوب لگنے پر کھائی جائے اور کچھ بھوک باقی ہو تو ہاتھ روک لیا جائے۔

☆ کھانا اطمینان سے خوب چبا چبا کر کھایا جائے۔

☆ دو کھانوں کے بیچ میں کم از کم تین گھنٹے کا وقفہ دیا جائے تاکہ غذا خوب ہضم ہو جائے۔

☆ خوش خوش، بسم اللہ کر کے کھانا شروع کیا جائے اور فارغ ہو کر اللہ کا شکر ادا کیا جائے۔

متوازن غذا:

وہی غذا متوازن کہلاتی ہے جس میں وہ تمام اجزا مناسب مقدار میں موجود ہوں جو جسم کے لیے ضروری ہیں اور وہ مقاصد حاصل ہوں جن کے لیے غذا استعمال کی جاتی ہے۔

غذا اس لیے استعمال کی جاتی ہے کہ:

☆ کام کاج کے لیے جسم کو قوت اور حرارت حاصل ہو۔

☆ کام کاج یا حرکات وسکنات میں جسم کا جو جز کام آگیا ہے یا ٹوٹ پھوٹ گیا ہے، اس کی مرمت ہو جائے۔

☆ جسم کے بڑھنے اور نشو ونما پانے میں مدد ملے۔

☆ بیماریوں کے جراثیم سے لڑنے کی جسم میں سکت وصلاحیت پیدا ہو۔

یہ مقاصد اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب غذا میں مندرجہ ذیل اجزاء پائے جاتے ہوں

۱۔ نشاستہ (کاربوہائیڈریٹ) ۲۔ چکنائی

۳۔ پروٹین (جسم کو نشو ونما دینے والے اجزا) ۴۔ نمکیات (معدنی اشیاء)

۵۔ پانی ۶۔ حیاتین (وٹامن)

۱۔ نشاستہ (کاربوہائیڈریٹ):

غذا کا یہ جز آکسیجن کے ساتھ جسم کو حرارت اور قوت بہم پہنچاتا ہے۔ گیہوں، جو، چاول، آلو، گاجر، ساگودانہ، مکئی، گڑ، شکر، چقندر، انگور وغیرہ سے حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ چکنائی:

یہ بھی آکسیجن کے ساتھ مل کر جلتی اور جسم کو قوت وحرارت پہنچاتی ہے۔ بال، جلد اور ناخنوں کو اچھی حالت میں رکھتی ہے۔ دوسرے اجزا کو ہضم کرنے میں بھی مدد دیتی ہے۔ تیل، گھی، مکھن، اور چربی سے حاصل ہوتی ہے، چکنائیوں میں عموماً وٹامن اے اور ڈی پائے جاتے ہیں۔

۳۔ پروٹین:

غذا کا یہ جز ہضم ہو کر جسم کی نشوونما اور ٹوٹے پھوٹے حصوں کی مرمت میں مدد دیتا ہے۔ چنا، مٹر، مختلف قسم کی دالوں، گوشت، انڈا، مچھلی، دودھ، دہی اور اناجوں کی اوپری پرت میں (جسے چوکر سمجھ کر پھینک دیا جاتا ہے) یہ جز پایا جاتا ہے۔

۴۔ نمکیات (معدنی اشیاء):

یہ جز ہڈیاں، دانت، لعاب، رگ، پٹھے وغیرہ بنانے میں کام آتا ہے۔ خون کی مناسب تولید اور جسم کی متوازن نشوونما میں مدد دیتا ہے۔ ان میں نمک فولاد، چونے اور فاسفورس وغیرہ کے اجزا شامل ہوتے ہیں۔ کھانے کے نمک، موسمی پھل، ترکاریوں، تازہ سبزیوں، گوشت، انڈا، مچھلی وغیرہ سے یہ جز حاصل ہوتا ہے۔

۵۔ پانی:

یہ بھی کھانے کا اہم اور بڑا جز ہے۔ اس کی مدد سے کھانا ہضم ہوتا ہے اور پتلا ہو کر جسم کے

مختلف حصوں میں پھیلتا ہے۔ دوران خون اسی کی مدد سے ہوتا ہے۔ جسم کی گندگی ڈھل کر باہر نکلتی ہے، جسم کے مختلف حصوں سے جو مفید لعاب نکلتا ہے اس کے بننے میں بھی پانی سے مدد ملتی ہے۔ اس لیے کھانے کے ساتھ تھوڑا مگر ڈیڑھ دو گھنٹے بعد کافی مقدار میں پانی پینا چاہیے۔

۶۔ حیاتین (وٹامن):

جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ غذا کے وہ ضروری اجزا ہیں جو زندہ اور تندرست رہنے کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ ان کے بغیر

☆ صحت اچھی نہیں رہ سکتی۔

☆ جسم کی مناسب نشو ونما نہیں ہوسکتی۔

☆ امراض کا مقابلہ کرنے کی جسم میں سکت نہیں رہ جاتی۔

☆ جسم طرح طرح کے امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔

وٹامن کی متعدد قسمیں ہیں جن میں خاص خاص یہ ہیں:

الف: وٹامن اے: جسم کو نشو ونما دینے، چھوت کی بیماریوں سے بچانے اور امراض کا مقابلہ کرنے کے لیے وٹامن اے نہایت ضروری ہے۔ اس سے پھیپھڑے اور دانت مضبوط ہوتے ہیں۔ آنکھوں اور جلد کو صحت مند رکھنے میں بھی اس سے مدد ملتی ہے۔ کلیجی، گردہ، ساگ، سبزی، دودھ، مکھن، انڈا وغیرہ میں ہوتا ہے۔ تیز آنچ میں پکانے یا بھوننے سے حیاتین ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس کا لحاظ کرنا چاہیے۔ پھل سبزیاں، سلاد وغیرہ حتی الامکان کچے کھانے چاہئیں۔ اس کی کمی سے رتوندھی ہو جاتی ہے۔ اور بچوں کی مناسب نشو ونما نہیں ہو پاتی۔

ب۔ وٹامن بی: بھوک بڑھانے، ہاضمے کو ٹھیک کرنے، خون میں سرخ ذرات بنانے کے لیے ضروری ہے۔ اس سے قبض، چڑچڑاپن اور دردسر دور ہوتا ہے۔ دودھ، انڈے، خمیر، انکھوا

نکلے ہوئے چنے، بغیر چھنے ہوئے موٹے آٹے میں پایا جاتا ہے۔ چاول کی اوپری پرت میں بھی ہوتا ہے لیکن بہت زیادہ صاف کر دینے یا پیچ نکال دینے سے ضائع ہو جاتا ہے۔ اس کی کمی سے جسم پھول جاتا ہے۔ ہاتھ پیر کمزور ہو جاتے ہیں اور طرح طرح کی اعصابی تکالیف کا اندیشہ رہتا ہے۔

ج: وٹامن سی: دانتوں کے لیے ضروری ہے۔ اس کی کمی سے مسوڑھے سوج جاتے ہیں اور ان سے خون نکلنے لگتا ہے۔ جلدی بیماری کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ سیاہ کشمش، لیموں، سنترے، ٹماٹر، گاجر، آلو، تازہ پھل اور سبزیوں میں پایا جاتا ہے۔ پھل اور سبزی کے خشک ہو جانے پر ضائع ہو جاتا ہے۔

د: وٹامن ڈی: دودھ، مکھن، انڈے، کلیجی، مچھلی کا تیل اور سورج کی روشنی میں پایا جاتا ہے۔ یہ ہڈیاں بنانے، جسم کو بڑھانے اور مضبوط کرنے میں مدد دیتا ہے، اس کی کمی سے بچوں کو سوکھے کی بیماری ہو جاتی ہے یا ہڈیوں کی ساخت میں خرابی آجاتی ہے۔

ہ: وٹامن ای: مادہ تولید کے لیے ضروری ہے۔ ساگ، نباتاتی تیل، بنولے، مٹر، بادام، پستہ، کھجور، چھوارے، خربوزے کے بیج وغیرہ میں ہوتا ہے اس کی کمی سے جنسی کمزوری کا اندیشہ رہتا ہے۔

ظاہر ہے متوازن غذا میں ان تمام اجزا کا مناسب مقدار ہونا ضروری ہے۔

روزانہ غذا میں کم وبیش:

☆ نشاستہ (کاربوہائیڈریٹ) آدھ سیر۔

☆ پروٹین آدھ پاؤ۔

☆ چکنائی ڈیڑھ چھٹانک۔

☆ نمک پون چھٹانک ملنا چاہیے۔

دودھ ایک ایسی غذا ہے جس میں تقریباً تمام اجزاء پائے جاتے ہیں، موسمی پھل، ترکاریوں،

ساگ، سبزیوں، گوشت، مچھلی، انڈے وغیرہ میں بھی متعدد اجزاء ملتے ہیں اسی لیے بچوں کو یہ چیزیں ملنی چاہئیں۔ ایک دن رات کے مختلف اوقات میں سات آٹھ سال سے چودہ پندرہ سال کی عمر تک کے بچوں کے لیے متوازن غذا کی مجموعی مقدار کم وبیش یہ ہونی چاہیے۔

☆ آٹا چاول وغیرہ ایک چھٹانک۔

☆ ساگ، سبزی، آلو، گوشت، مچھلی، انڈا، دالیں وغیرہ ملا کر ایک پاؤ۔

☆ دودھ ایک پاؤ۔

☆ گھی مکھن تیل چربی ایک چھٹانک۔

☆ پھل گاجر ٹماٹر وغیرہ آدھ پاؤ۔

☆ گڑ یا شکر ڈیڑھ چھٹانک۔

۲۔ صاف پانی:

صحت کے لیے دوسری ضروری چیز صاف پانی ہے۔ ہر آدمی کو ایک دن رات میں کم وبیش ڈیڑھ سیر پانی پینا پڑتا ہے۔

پانی کی مدد سے:

☆ دوران خون ٹھیک رہتا ہے اور خون جسم کے ہر حصے تک بآسانی پہنچ جاتا ہے۔

☆ غذا بخوبی ہضم ہوتی اور جزو بدن بنتی ہے۔

☆ جسم کی حرارت متوازن رہتی ہے۔

☆ جسم کے اندر کی گندگی اور سمیت، پیشاب، پسینہ، تھوک بلغم وغیرہ کے ساتھ باہر نکلتی ہے۔

☆ معدہ، آنتیں اور نالیاں وغیرہ دھل کر صاف ہو جاتی ہیں۔

پانی صاف اور تازہ ہونا چاہیے۔ صاف پانی کی پہچان یہ ہے کہ اس میں کسی طرح کا مزہ، رنگ یا بو نہ ہو۔ گندہ پانی صحت کے لیے انتہائی مضر ہے۔ متعدد مہلک بیماریاں اسی سے پھیلتی ہیں۔

اس لیے صاف اور تازہ پانی حاصل کرنے کا پورا اہتمام ہونا چاہیے۔ وبائی امراض کے زمانے میں پانی ابال کر پینا چاہیے۔

۳۔ تازہ ہوا:

صحت کے لیے تیسری اہم چیز صاف اور تازہ ہوا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے ہوا کی ضرورت وافادیت محتاج بیان نہیں۔ صاف پانی کی طرح صاف ہوا میں بھی نہ تو کوئی رنگ ہوتا ہے نہ مزہ اور نہ بو۔ ہوا میں یوں تو مختلف گیسیں شامل ہوتی ہیں لیکن ان میں دو خاص ہیں:

۱۔ آکسیجن ۲۱ فیصدی یعنی کم وبیش پانچواں حصہ۔

۲۔ نائٹروجن ۷۸ فیصدی یعنی تقریباً ۴/۵ حصہ باقی ایک فی صدی سے کچھ کم آرگن اور برائے نام کاربن ڈائی آکسائیڈ، پانی کے بخارات اور مٹی کے ذرات وغیرہ۔

آکسیجن کی خاصیت چیزوں کے جلنے میں مدد دینا اور نائٹروجن کا کام آکسیجن کی شدت کو معتدل اور قابل برداشت بناتا ہے۔ آکسیجن جسم کے لیے بہت ضروری ہے، اس کی بدولت:

☆ جسم میں حرارت خون میں گرمی اور پھرتی وچستی پیدا ہوتی ہے۔

☆ جسم کے اندر کا زہریلا مادہ گیس بن کر باہر نکلتا ہے۔ اگر جسم کو مناسب مقدار میں آکسیجن نہ ملے تو زندگی محال ہو جائے۔

ہوا کیوں گندی ہو جاتی ہے؟

ہوا کی گندگی کے عموماً مندرجہ ذیل اسباب ہوتے ہیں:

☆ سانس نکالنے سے جسم کے اندر کی زہریلی گیس ہوا میں مل کر ہوا کو گندہ کر دیتی ہے۔

☆ آگ کے جلنے سے آکسیجن خرچ ہو جاتی ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ ہوا میں مل کر ہوا کو خراب کر دیتی ہے۔

☆ چیزوں کے سڑنے گلنے سے بدبودار اور زہریلی گیسیں ہوا میں شامل ہو کر ہوا کو گندہ کر دیتی

ہیں۔

☆ ہوا میں گردوغبار شامل ہو جانے سے بھی ہوا مضر صحت ہو جاتی ہے۔

اسی لیے منہ ڈھانپ کر یا کمرہ بند کر کے سونا، بند کمرے میں جلتی ہوئی آگ یا انگیٹھی سلگا کر سونا، بدبودار ہوا میں سانس لینا، یا گردوغبار میں ناک پر رومال نہ رکھنا صحت کے لیے انتہائی مضر بلکہ بسا اوقات مہلک ثابت ہوتا ہے۔

ہوا کو صاف کرنے کے فطری ذرائع:

☆ پیڑ پودے: ہوا کو صاف کرنے میں پیڑ پودے بڑی مدد دیتے ہیں۔ جاندار جو گندی ہوا سانس کے ساتھ باہر نکالتے ہیں، یہ انہیں جذب کر کے آکسیجن باہر نکالتے ہیں۔ اس طرح ہوا صاف ہوتی رہتی ہے۔

☆ سورج: سورج کی کرنیں ہوا میں شامل ہو کر بیماریوں کے جراثیم کو ختم کر کے ہوا کو صاف کر دیتی ہیں۔

☆ بارش: بارش کی وجہ سے ہوا میں ملی ہوئی گردوغبار نیچے گر جاتی ہے اور مضر صحت گیسیں ختم ہو جاتی ہیں۔

☆ ہوا کا چلنا: ہوا کے چلتے رہنے سے بھی گندگی صاف ہو جاتی ہے۔

☆ آکسیجن: ہوا میں ملی ہوئی آکسیجن خود بھی ہوا کی گندگی کو منتشر اور ختم کر کے صاف کرتی رہتی ہے۔

صاف ہوا حاصل کرنے کے لیے مکان ہوادار ہونا چاہیے۔ کھلے میدانوں میں کھیلنے اور باغوں یا پارکوں میں ٹہلنے گھومنے کا موقع ملنا چاہیے۔ منہ کھول کر ہوادار جگہوں میں سونے کی عادت ڈالنی چاہیے۔ صحن میں پودے لگانے کا اہتمام ہو سکے تو تھوڑے بہت پھول پودے ضرور لگانے چاہئیں۔

۴۔ کافی روشنی:

صحت کے لیے چوتھی ضروری چیز روشنی ہے۔ جو پودے روشنی سے محروم ہو جاتے ہیں وہ پیلے پڑ جاتے ہیں اور ان کی نشوونما رک جاتی ہے۔ شہروں کی تنگ وتاریک گلیوں میں رہنے اور گھٹی گھٹی فضا میں سانس لینے والوں کے مقابلے میں دیہات کی روشن اور کھلی فضا میں پلنے والوں کی صحت کا موازنہ کر کے روشنی کی ضرورت وافادیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

روشنی حاصل کرنے کے دو ذرائع ہیں:

☆ فطری: مثلاً سورج اور چاند سے۔

☆ مصنوعی: یعنی چراغ، لالٹین، بجلی وغیرہ سے۔

سورج کی روشنی صحت کے لیے بے حد ضروری ہے۔ مکان میں دھوپ آنے کی پوری گنجائش ہونی چاہیے۔ اس سے مکان میں سیلن بھی نہیں رہتی اور بیماریوں کے جراثیم مر جاتے ہیں۔ سامان کو بھی کبھی دھوپ دینا چاہیے۔ جن گھروں میں دھوپ کی گزر نہیں ہوتی اور وہ سیلے یا گھٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان میں طرح طرح کے جراثیم پلتے اور صحت پر برا اثر ڈالتے ہیں۔ اگر کمروں میں دھوپ کا گزر نہ ہو یا ان میں سیلن ہو تو وقتاً فوقتاً چونا چھڑکنا اور گندھک لوبان وغیرہ سلگانے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ پڑھنے لکھنے یا باریک کام کرنے کے لیے کافی روشنی ہونی چاہیے۔ لیکن روشنی سامنے یا دائیں سے نہ آئے بلکہ بائیں سے یا اوپر یا پیچھے سے آئے تو آنکھوں پر برا اثر نہیں پڑتا۔ بہت مدھم یا بہت تیز روشنی آنکھوں کو خراب کر دیتی ہے۔ پڑھنے لکھنے یا باریک کام کرنے والوں کو روشنی کے استعمال میں بہت محتاط ہونا چاہیے۔ کافی روشنی میں کام کریں اور آنکھوں پر براہ راست روشنی نہ پڑنے دیں۔

۵۔ محنت، مشقت یا ورزش اور کھیل:

اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ جسم کام کاج اور محنت ومشقت کے لیے دیا ہے۔ جسمانی محنت ہی سے

جسم کے اعضا مضبوط ہوتے ہیں۔ان میں چستی وتوانائی آتی ہے،بھوک خوب لگتی،گہری نیند آتی اور کھانا اچھی طرح ہضم ہوتا اور جو کچھ کھایئے جزو بدن بنتا ہے۔جسم کے اندر کی گندگی اور سمیت بآسانی باہر نکل جاتی اور طبیعت بشاش رہتی ہے۔جس عضو سے کام نہیں لیا جاتا وہ رفتہ رفتہ کمزور ہوکر بے کار ہو جاتا ہے۔اس لیے محنت مشقت کا عادی بننا چاہیے۔بچے کھیل کود کے رسیا ہوتے ہیں۔وہ کھیل ہی کھیل میں کافی جسمانی محنت کر لیتے ہیں بشرطیکہ انہیں کھیل کی سہولتیں حاصل ہوں۔البتہ لکھنے،پڑھنے،ذہنی کام کرنے یا دوکان پر بیٹھنے والے لوگوں کو عموماً جسمانی محنت کا موقع کم ملتا ہے۔ایسے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ کچھ وقت جسمانی ورزش یا کھیل کے لیے ضرور نکالیں۔زیادہ عمر کے لوگ صبح وشام ٹہلنے کا اہتمام کریں۔اگر محنت مشقت کے کاموں میں کھیل کی اسپرٹ پیدا کر دی جائے تو بچے کھیل سمجھ کر بہت سے مفید کام بھی کر سکتے ہیں اور ضروری جسمانی محنت بھی ہو سکتی ہے۔جسمانی محنت سے جو لوگ جی چراتے ہیں ان کی صحت ہمیشہ خراب رہتی ہے۔وہ سست،کاہل اور دوسروں پر بار بن کر رہتے ہیں۔(بچوں کے کھیل پر مفصل بحث آچکی ہے۔(دیکھیے صفحہ ۱۵۷ تا ۱۶۶)

۶۔ موزوں لباس:

صحت کے لیے موزوں لباس بھی ضروری ہے۔لباس وہی موزوں ہوتا ہے جس سے:

- ☆ ستر بخوبی چھپ جائے اور بے پردگی نہ ہوتی ہو۔
- ☆ گرمی سردی اور موسمی اثرات سے جسم محفوظ رہے۔
- ☆ جسم کو کسی طرح کی گزند یا نقصان نہ پہنچے۔
- ☆ جسم کی مناسب آرائش وزیبائش ہوتی ہو۔
- ☆ شائستگی،وقار،وضع داری اور ملی غیرت وحمیت کا مظاہرہ ہوتا ہو۔

لباس مختلف چیزوں سے تیار کیے جاتے ہیں لیکن ہمارے ملک کے بیشتر علاقوں کے

باشندوں کے لیے مختلف حیثیتوں سے سب سے موزوں لباس سوتی ہے کیونکہ:

- ☆ یہ نسبتاً سستا اور مضبوط ہوتا ہے۔
- ☆ بآسانی دھل جاتا ہے۔
- ☆ پسینے کو بخوبی جذب کر لیتا ہے۔
- ☆ ہر موسم کے لیے موزوں ہے۔ سردی گرمی دونوں سے جسم کو محفوظ رکھتا ہے۔
- ☆ روئی افراط سے پیدا ہوتی ہے اور بیشتر باشندوں کی ضروریات اس سے پوری ہو سکتی ہیں۔

گرمیوں میں ہلکے پھلکے اور حتی الامکان سفید یا ہلکے رنگ کے کپڑے مناسب ہوتے ہیں۔ سردیوں میں موٹے اور گہرے رنگ کے، کیونکہ سفید یا ہلکے رنگ کے کپڑوں کی بہ نسبت گہرے رنگ کے کپڑے سورج کی روشنی جذب کر کے جلد گرم ہو جاتے ہیں۔ صاحب استطاعت لوگ اگر سردیوں میں اونی کپڑے استعمال کریں تو صحت کے لیے بہتر ہے۔ اسی طرح صاحب استطاعت خواتین اگر ریشم استعمال کریں تو آرائش کے علاوہ صحت کے لیے بھی مفید ہے۔

چست لباس صحت کے لیے بہت مضر ہے۔ اس سے دوران خون متاثر ہوتا ہے۔ جسم کو ضروری مقدار میں تازہ ہوا نہیں ملتی اور جسم کے اندر اور باہر کا درجہ حرارت یکساں رہتا ہے۔

لباس میں ستر کی طرف سے بے پروائی، غیروں کی نقالی، بے جا تکلف وتصنع یا گندگی والا پروائی وغیرہ مختلف قسم کے اخلاقی ونفسیاتی امراض کا شکار بنا دیتی ہیں جو بالواسطہ جسمانی صحت کے لیے بھی مضر ہیں۔ ان سے بچنا چاہیے۔

۷۔ صفائی ستھرائی:

صحت وصفائی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اسلام نے طہارت کو ایمان کا جز قرار دیا ہے۔ صحت کے لیے ضروری ہے کہ جسم، لباس، رہائش گاہ، برتنے کے سامان، نالیوں اور گردوپیش کی صفائی کا پورا اہتمام کیا جائے، ان میں سے کسی کی صفائی کی طرف سے لاپروائی صحت کو متاثر کر سکتی ہے۔

۱۔ جسم کی صفائی:

جسم کے اندر طرح طرح کا فضلہ، گندگی اور زہریلا مادہ اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ اس کا باہر نکلتے رہنا ضروری ہے کیونکہ کسی طرح کا بھی فاسد مادہ رک جائے تو آدمی بیمار ہو جائے۔ یہ گندگی پاخانے، پیشاب، پسینہ، بلغم وغیرہ کی شکل میں مختلف راستوں سے باہر نکلتی رہتی ہے۔ جہاں اس گندگی کو باہر نکالنے کا پورا اہتمام ہونا چاہیے۔ وہیں ان راستوں کو بھی خوب صاف رکھنا چاہیے جن سے یہ گندگی باہر نکل کر انہیں بھی گندہ کر دیتی ہے۔ پاخانہ پیشاب کے بعد سلیقے سے آب دست لینا، پابندی سے مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈال کر خوب صاف کرنا، آنکھوں اور کانوں کو برابر صاف کرتے رہنا، بال اور ناخن ترشوانے کا اہتمام کرنا چاہیے، نیز پابندی سے غسل کر کے جلد کے ان سوراخوں کو کھلا رکھنا چاہیے جو پسینہ کی وجہ سے میل سے بند ہو جاتے ہیں۔ ابتدا ہی سے بچوں کو جسم کی صفائی کا پابند بنانے کی کوشش ہونی چاہیے۔

۲۔ لباس کی صفائی:

میلا کچیلا لباس کھال کو گندہ کر کے مختلف قسم کی جلدی بیماریوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس لیے لباس کی صفائی کا پورا اہتمام ہونا چاہیے، پابندی سے لباس بدلنے اور اس کے دھونے دھلانے کی طرف توجہ ہونی چاہیے۔

۳۔ رہائش گاہ کی صفائی:

کمرے، برآمدے، صحن میں برابر جھاڑو دینا۔ سامان کو گرد وغبار سے بچانا، چیزوں کو جھاڑ پونچھ کر سلیقے سے ترتیب دینا، باورچی خانے، نالیوں اور پاخانہ پیشاب خانہ وغیرہ کی صفائی کی طرف پوری توجہ دینی چاہیے۔ گھر کے آس پاس بھی گندگی نہ ہونی چاہیے۔ ورنہ جراثیم پلیں گے اور گھر بھر کی صحت متاثر ہوگی۔

۸۔ گہری نیند:

صحت کے لیے گہری نیند بھی نہایت ضروری ہے۔ ذہنی جسمانی کام، کھیل کود اور جسم کے اندر ہونے والی حرکات کے باعث جسم تھک کر چور ہو جاتا ہے۔ تکان دور کرنے اور تازہ دم ہو کر پھر کام کاج کے لائق ہونے کے لیے آرام اور گہری نیند ضروری ہے۔

نیند کے سلسلے میں مندرجہ ذیل امور ملحوظ رہیں:

☆ اللہ میاں نے سونے کے لیے رات بنائی ہے۔ گرمیوں کے سوا دن میں سونے سے حتی الامکان گریز کریں۔

☆ آدھی رات سے پہلے کی ایک گھنٹہ کی نیند بعد کی دو گھنٹے کی نیند کے برابر ہوتی ہے۔ اس لیے حتی الامکان عشاء کے فوراً بعد سونے کی عادت ڈالیں۔ نیند بھی اچھی آئے گی اور سویرے جلد اٹھ سکیں گے۔

☆ کھانے اور سونے کے مابین دو تین گھنٹوں کا فصل ہونا چاہیے اس لیے بہتر یہی ہے کہ مغرب کے بعد کھانا کھا لیا جائے۔

☆ سوتے وقت سارے معاملات اللہ کے حوالے کر کے خالی الذہن اور بے فکر ہو جائیں تاکہ گہری نیند آئے۔

☆ چت یا پیٹ کے بل ہرگز نہ سوئیں اور نہ سوتے وقت سینے پر ہاتھ رکھیں کیونکہ اس سے برے برے خواب نظر آتے ہیں اور گہری نیند نہیں آتی، کروٹ لینے کی عادت ڈالیں۔

☆ سونے سے پہلے بچوں کو ڈراؤنے قصے کہانیاں یا واقعات ہرگز نہ سنائیں ورنہ ڈراؤنے خواب دکھائیں دیں گے۔

☆ منہ ڈھانپ کر یا کمرے کے دروازے کھڑکیاں بند کر کے نہ سوئیں تاکہ سانس لینے کے لیے تازہ ہوا مل سکے۔

☆ سونے سے پہلے روشنی گل کر دیں۔آگ بجھا دیں اور بچوں کو پیشاب سے فارغ کرا دیا کریں۔

☆ بچوں کو سونے کا کافی موقع ملنا چاہیے،نوجوانوں کم وبیش آٹھ گھنٹے،مردوں کو چھ اور عورتوں کو سات گھنٹے کی گہری نیند اچھی صحت کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔

☆ بچوں کو والدین سے الگ لیٹنے کا عادی بنانا چاہیے۔دس سال کی عمر کے بعد تو بستر ضرور ہی الگ کر دینا چاہیے۔

☆ حتی الامکان چارپائی پر لیٹنا چاہیے،تاکہ زہریلے کیڑے مکوڑوں،جراثیم،دھول مٹی اور مضر صحت گیسوں وغیرہ سے جسم محفوظ رہے۔

☆ بہت زیادہ کھا لینے سے یا خالی پیٹ سونے سے بھی گہری نیند نہیں آتی۔

☆ مچھر،پسو اور کھٹمل سے بچاؤ کا پورا اہتمام کریں تاکہ نیند میں خلل نہ ہو اور بیماریوں سے بھی تحفظ ہو سکے۔

۹۔ مسرت وشادمانی:

رنج وغم گھن کی طرح جسم کو کھوکھلا کر دیتا اور بسا اوقات تپ دق کا شکار بنا دیتا ہے۔جنون،خودکشی،حرکت قلب کا بند ہونا،قبل از وقت بوڑھا ہو جانا،یہ سب غیر معمولی رنج وغم ہی کے شاخسانے ہیں۔خوش وخرم رہنے سے صحت اچھی رہتی ہے اور امراض کا مقابلہ کرنے کے لیے قوت مدافعت بڑھتی ہے۔خود بھی خوش رہنا چاہیے اور بچوں کو خوش وخرم رکھنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔رنج وغم کے مواقع اگر آ ہی جائیں تو جلد ان کو بھلا دینے یا ان کی تلافی کر دینے کی فکر ہونی چاہیے تاکہ جسم کو یہ گھن نہ لگنے پائے۔اللہ پر بھروسہ اور توکل انسان کو ہر طرح کے رنج وغم سے نجات دے دیتا ہے۔ہر حال میں اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔

۱۰۔ پاکیزہ سیرت:

آخری لیکن صحت وعافیت کے لیے سب سے مقدم شرط پاکیزہ سیرت ہے۔ سب کچھ حاصل ہو لیکن سیرت گھناؤنی ہو تو انسان کی صحت رفتہ رفتہ برباد ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس صحیح عقائد، صالح اعمال، نیک چال چلن، پسندیدہ عادات واطوار، صلہ رحمی، حسن سلوک، نصح وخیر خواہی، خدمت خلق وغیرہ سے خدا اور خلق دونوں خوش ہوتے ہیں، چنانچہ اطمینان قلب نصیب ہوتا ہے۔ موٹا جھوٹا کھا کر بھی انسان خوش وخرم رہتا ہے، اس کی صحت سنورتی اور عمر بڑھتی ہے۔ ہمارا آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ بدچلنی اور برے عادات واطوار انسان کو طرح طرح کے مہلک امراض میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ آخرت کی کامیابی کے ساتھ ساتھ صحت اور دنیوی فلاح کے لحاظ سے بھی پاکیزہ سیرت اور پسندیدہ عادات نہایت ضروری ہیں۔ آئندہ نسلوں کے ہر بہی خواہ کا فرض ہے کہ وہ سب سے زیادہ اس طرف توجہ دے۔

بچوں کی صحت اور مدرسہ:

مدرسے کا کام صرف لکھنا پڑھنا سکھا دینا ہی نہیں ہے۔ جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ طلبہ کی صحت اور جسمانی تربیت کی طرف توجہ دینا بھی مدرسے کا بنیادی فریضہ ہے کیونکہ:

☆ جسمانی حیثیت سے بچوں کی نشوونما کا بہترین اور طویل ترین دور مدرسے ہی میں گزرتا ہے۔

☆ والدین کی جہالت، حفظان صحت کے اصولوں سے ان کی ناواقفیت، رہن سہن کی خرابیاں اور معاشرے کی زبوں حالی کے اس دور میں مدرسے ہی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ بچوں کی صحت کے ضمن میں مناسب مدد اور رہنمائی کرے گا۔

☆ بچوں کی صحت ہی اچھی نہ ہوگی تو ان کی تعلیم وتربیت کیسے ہو سکے گی۔

اس لیے پڑھائی لکھائی پر صحت کو قربان کر دینے کا جو غلط تصور پھیل گیا ہے وہ انتہائی مضر اور

مہلک ہے۔ مدرسے سے فارغ ہونے کے بعد صرف ہڈی چمڑا واپس نہیں جانا چاہیے بلکہ انفرادی واجتماعی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے توانا وتندرست جسم بھی ملنا چاہیے۔

مدرسے کی ذمہ داریاں:

صحت کے ضمن میں مدرسے کو مندرجہ ذیل امور کی طرف توجہ دینی چاہیے:

☆ مدرسے کا موقع محل: مدرسہ حتی الامکان آبادی سے باہر کھلی فضا اور ستھرے ماحول میں ہو، آس پاس پیڑ پودے بھی نصب کیے جائیں۔

☆ عمارت خواہ کچی ہو یا پکی، معمولی ہو یا عالی شان، کشادہ اور ہوادار ہونی چاہیے۔

☆ کمرے ہوادار اور روشن ہونے چاہئیں۔ دیواریں اونچی، کھڑکیاں روشن اور دروازے کافی نیز طلبہ کی تعداد کے لحاظ سے بیٹھنے کے لیے جگہ کشادہ ہونی چاہیے۔

☆ تختہ سیاہ ایسی جگہ رکھا جائے کہ پورا درجہ بآسانی دیکھ سکے اور اس پر روشنی اس انداز سے پڑے کہ چمک نہ پیدا ہو، تختہ سیاہ پر صاف اور موٹے خط میں لکھا جائے تاکہ پڑھنے میں آنکھوں پر زور نہ پڑے۔ بچوں کی نشست ایسی ہو کہ روشنی بائیں یا پیچھے سے آئے۔ سامنے یا دائیں سے روشنی آنکھوں کے لیے مضر ہوتی ہے۔ لکھتے پڑھتے وقت کتاب یا کاپی سے آنکھ کا فاصلہ ایک فٹ ہو اور بیٹھنے کا انداز ایسا ہو کہ ریڑھ کی ہڈی سیدھی رہے۔ بچوں کی طرز نشست کی طرف اس پہلو سے خاص توجہ دینی چاہیے ورنہ آنکھیں خراب ہو جاتی ہیں اور ریڑھ کی ہڈی جھک جاتی ہے۔

☆ درجے، برآمدے، صحن، پاخانہ، پیشاب خانہ، نالیوں وغیرہ کی صفائی کا پورا اہتمام ہو اور کوڑا کرکٹ دور ڈالنے کا انتظام کیا جائے۔ پینے کے پانی کی خاص طور پر دیکھ بھال کی جائے تاکہ بچے گندہ نہ کردیں۔ بیشتر وبائی امراض پانی کی گندگی سے پھیلتے ہیں۔

☆ نظام الاوقات ایسا بنایا جائے کہ مشکل اور تھکا دینے والے مضامین مسلسل نہ پڑیں بلکہ

آسان اور مشکل، زبانی اور تحریری ذہنی اور جسمانی کام یکے بعد دیگرے ہوں۔ تازہ دم ہونے کے لیے وقفے دیے جائیں۔ وقفے ایسے ہوں کہ کھانے، ناشتے، نماز اور کھیل کے لیے مناسب وقت مل سکے۔

☆ باقاعدہ تدریس سے قبل بیس پچیس منٹ اجتماعی حاضری کے لیے رکھے جائیں۔ جس میں قد اور درجے کے اعتبار سے تمام طلبہ قطار میں کھڑے ہوں۔ کبھی کبھی ان کی صحت وصفائی کی جانچ کی جائے، خاص طور پر جسم اور لباس کی صفائی، ناخن، دانت، آنکھ، کان، ناک وغیرہ کی صفائی دیکھی جائے اور حسب ضرورت انفرادی واجتماعی ہدایات دی جائیں۔ اجتماعی طور پر ڈرل اور پی ٹی (جسمانی تربیت) کا ہلکا سا پروگرام بھی رکھا جائے اور چند منٹ بلند آواز سے ایک ساتھ دعا یا ترانہ وغیرہ کا بھی انتظام کیا جائے۔

☆ ابتدائی درجات کے بچوں کو حتی الامکان کھیل کھیل میں تعلیم دی جائے۔ انہیں زیادہ دیر تک سکون سے بیٹھنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ تدریس کے اوقات ہی میں سے کچھ وقت ان کے کھیل اور پی ٹی کے لیے بھی نکالا جائے۔

☆ محکمہ صحت کے ذمہ داروں سے ربط قائم کر کے وقتاً فوقتاً طلبہ کے طبی معائنے، چیچک، ہیضے، ٹائیفائڈ، طاعون وغیرہ کے ٹیکے لگوانے کا اہتمام کیا جائے۔ بچوں کی بصارت وسماعت کی خاص طور پر جانچ کرائی جائے۔

☆ طلبہ کو ایک تدریج سے حفظانِ صحت کے ضروری اصول سمجھائے جائیں اور ان پر عمل کرنے کے طریقے وضاحت سے بتائے جائیں۔ بڑے بچوں کو ابتدائی طبی امداد اور تیمارداری کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچائی جائیں اور پٹیاں باندھنے، بخار دیکھنے، دوا دینے وغیرہ کے ضمن میں عملی تربیت بھی کی جائے۔ مدرسے میں ابتدائی طبی امداد بہم پہنچانے کے لیے ضروری سامان بھی رکھا جائے تاکہ کھیل کود اور بھاگ دوڑ وغیرہ میں اگر بچوں کو چوٹ لگ جائے یا اور کوئی حادثہ پیش آجائے تو بروقت طبی امداد بہم پہنچائی جاسکے۔

☆ ابتدائی درجات میں بچوں پر ہوم ورک (گھر پر پڑھنے لکھنے کا کام) کا بار نہ ڈالا جائے تاکہ وہ فرصت کے اوقات میں بے فکری سے کھیل کود یا اپنی مرضی سے کچھ بنا بگاڑ سکیں۔ بعد کے درجات میں بھی حتی الامکان آزاد مطالعے یا ہابیز وغیرہ سے متعلق ہی ہوم ورک ہونا چاہیے، تاکہ بچے بار محسوس نہ کریں بلکہ فرصت کے اوقات کو ہنسی خوشی مفید مشاغل میں استعمال کرنے کے عادی بنیں۔

☆ مدرسے کے اہتمام میں کھیل کود، ورزش (پی ٹی) جسمانی محنت اور بیرون نصاب مصروفیات ومشاغل (باغبانی، تعلیمی سیر وسیاحت، پکنک، خدمت خلق وغیرہ) کا اہتمام کیا جائے اور اس کے لیے میدان اور ضروری سامان فراہم کیا جائے۔ کھیلوں کے مقابلے اور دوسرے اداروں سے میچ کھیلنے کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔

☆ کھانے پینے، لکھنے پڑھنے، سونے جاگنے، نہانے دھونے، کھیلنے کودنے اور صاف ستھرا رہنے وغیرہ کے متعلق صحت بخش عادات ڈلوائی جائیں۔ کلاس ٹیچر حضرات اپنے درجے کے بچوں کو اس ضمن میں برابر توجہ دلاتے رہیں۔

☆ ایک تدریج سے احتیاطی تدابیر بھی بتلائی جائیں۔ مثلاً بیمار ہونے پر بڑوں کو مطلع کرنا، علالت میں دوا اور پرہیزی غذا استعمال کرنا، سڑک پر چلنے کے قواعد وضوابط اور وبائی بیماریوں کے سلسلے میں ضروری احتیاطیں وغیرہ۔

☆ قابل توجہ بچوں کے ضمن میں ان کے سرپرستوں کو متوجہ کرکے مناسب اقدام پر آکسایا جائے۔

☆☆☆

باب ۲۲:

سیکھنا

(علم و فن کا اکتساب)

تعلیم و تربیت کا پورا نظام ہی دراصل سیکھنے اور سکھانے کے لیے قائم کیا جاتا ہے۔ مدرسے نادان اور ناواقف بچوں کو ایک تدریج سے وہ باتیں سکھانے ہی کے لیے کھولے جاتے ہیں جو وہ نہیں جانتے یا جو انہیں بہر حال جاننا چاہئیں۔ مثلاً لکھنا پڑھنا، مختلف علوم و فنون میں مہارت، پسندیدہ عادات و اطوار، مختلف مواقع کے آداب اور لوگوں کے ساتھ مناسب برتاؤ وغیرہ۔ سیکھنے کا یہ کام پیدائش سے لے کر موت تک برابر جاری رہتا ہے۔

سیکھنے کا کام عموماً مندرجہ ذیل طریقوں سے انجام پاتا ہے۔

ا۔ خود کر کے سیکھنا:

بچے طبعاً بہت چلبلے ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھ پیر برابر چلتے رہتے ہیں۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ کرتے، کچھ بناتے اور کچھ بگاڑتے نظر آتے ہیں۔ اپنی ان حرکات و سکنات کے دوران وہ متعدد تجربات سے دوچار ہوتے ہیں۔ جن میں بعض تلخ اور بعض خوشگوار ہوتے ہیں۔ کبھی نشانہ ٹھیک بیٹھتا ہے، کبھی چوک جاتا ہے۔ اس طرح وہ تجربات کے ذریعے متعدد باتیں سیکھتے ہیں۔

۲۔ تربیت سے سیکھنا:

والدین، اساتذہ اور دوسرے متعلقین بچوں کی تربیت کو اپنا اہم فریضہ سمجھتے ہیں۔ وہ انہیں پیار محبت یا سختی نرمی سے کچھ نہ کچھ سکھاتے رہتے ہیں، کوئی غلط کام کرتے دیکھتے ہیں تو روک ٹوک کر کے اصلاح کر دیتے اور صحیح طریقہ بتا دیتے ہیں۔ چنانچہ متعدد باتیں بچے تربیت کے طفیل سیکھتے ہیں۔

۳۔ مشاہدہ اور تقلید سے سیکھنا:

ہر فرد کی معلومات کا سب سے اہم ذریعہ اس کی آنکھیں ہیں۔ وہ جو کچھ جانتا ہے اس کا ۴/۵ حصہ عموماً آنکھوں ہی کے ذریعے حاصل کیا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی آنکھیں ہر وقت اسے متعدد باتوں کا مشاہدہ کراتی اور ان کے متعلق معلومات فراہم کرتی رہتی ہیں۔ بہت سی باتیں بچے دوسروں کی دیکھا دیکھی اور ان کی نقل میں کرنے لگتے ہیں۔ غرض مشاہدہ اور تقلید بھی سیکھنے کے نہایت اہم ذرائع ہیں۔

۴۔ سوجھ بوجھ سے سیکھنا:

ہر بچے کو مختلف قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے کبھی گیند لڑھک کر نالی میں چلی جاتی ہے۔ اسے نکالنے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ پتنگ کی ڈوری کسی چیز میں پھنس جاتی ہے، اسے چھڑانے کا سوال ہوتا ہے۔ کبھی کھانے پینے کی چیز دسترس سے باہر ہوتی ہے۔ اسے حاصل کرنے کی فکر ہوتی ہے۔ کبھی استاد کی خفگی سے بچنے اور کبھی والدین کی خوشنودی حاصل کرنے کا سوال درپیش ہوتا ہے وغیرہ۔ غرض طرح طرح کے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان سے نمٹنے اور عہدہ برآ ہونے کے لیے بچوں کو سوجھ بوجھ اور غور و فکر نیز غیر معمولی جدوجہد سے کام لینا پڑتا ہے۔ مختلف حل سامنے آتے ہیں وہ انہیں آزماتے ہیں اور اپنی کوششوں میں اکثر وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس طرح متعدد باتیں وہ سوجھ بوجھ سے سیکھ لیتے ہیں۔

۵۔ مشروط اضطرار سے سیکھنا:

اپنے جبلی تقاضوں اور فطری داعیات کی تکمیل کے دوران میں بچوں کو متعدد تجربات ہوتے ہیں۔ یہی تجربات بچوں کو کسی کے بارے میں اپنا رویہ متعین کرنے میں امداد بہم پہنچاتے ہیں۔ مثلاً والدین اور بہن بھائیوں سے محبت، اساتذہ کا احترام، مضامین سے لگاؤ، مشاغل میں دلچسپی، اندھیرے اور موذی جانوروں کا خوف وغیرہ۔

یہ ہیں مختلف طریقے اور ذریعے جو سیکھنے کے عمل میں معاون ہوتے ہیں۔

سیکھنے کے قوانین:

سیکھنے کے تین بنیادی قوانین ہیں:

۱۔ قانون آمادگی۔ ۲۔ قانون تاثیر۔ ۳۔ قانون مشق

ان قوانین کی پابندی سے ہی بچوں کو کچھ سکھایا جا سکتا ہے۔

۱۔ قانون آمادگی:

سیکھنے کا کام اسی وقت انجام پا سکتا ہے جب سیکھنے والا اس کے لیے آمادہ ہو۔ آمادگی کے بغیر کچھ نہیں سیکھا جا سکتا کیونکہ ایسی صورت میں وہ اس کے لیے کوئی کوشش ہی نہیں کرے گا۔ اسی لیے سبق پڑھانے یا کچھ سکھانے سے پہلے بچوں کو اس کے لیے پوری طرح تیار اور آمادہ کر لینے پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ سزا کے خوف یا خارجی دباؤ اور جبر و تشدد کے تحت جو کام لیا جاتا ہے، اس میں بچے کی پوری آمادگی شامل نہیں ہوتی۔ اسی لیے بہت کم نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر بچے کی فطری خواہشات اور اس کی دلچسپیوں کا لحاظ کر کے، نیز کام کی ضرورت و افادیت بخوبی ذہن نشین کرا کے کام لیا جاتا ہے تو وہ پوری آمادگی سے کام کرتا ہے اور اس کے انجام دینے میں اپنی پوری طاقت جھونک دیتا ہے۔ چنانچہ ایسا کام نتیجہ خیز ہوتا ہے۔

۲۔ قانون تاثیر:

کوئی کام اس وقت دلچسپی اور انہماک سے کیا جاتا ہے جب اس سے خوشگوار نتائج برآمد ہوں۔ اگر کسی کام کے کرنے سے راحت کے بجائے تکلیف پہنچے گی یا تلخ تجربات سے دوچار ہونا پڑے گا تو کوئی فرد اس کے پاس بھی نہیں پھٹکے گا، چہ جائیکہ اس کو خوشی سے انجام دینا۔ بچے ابتداء میں نادانی سے بعض ایسے کام کر بیٹھتے ہیں جن کے نتائج تکلیف دہ ہوتے ہیں لیکن یہی تلخ تجربات انہیں آئندہ ان کاموں سے باز رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ ایسے کاموں کو بار بار کرتے ہیں جن

سے انہیں سکون، مسرت اور راحت نصیب ہو۔ اسی اصول کی بنا پر ناپسندیدہ حرکات کے تلخ تجربات اور پسندیدہ عادات واطوار کے ساتھ خوشگوار تجربات وابستہ کرنے کے لیے غلطیوں اور کوتاہیوں پر سزا دی جاتی ہے اور اچھے کاموں پر شاباشی اور انعام۔

۳۔ قانون مشق:

کسی کام کو بار بار کرنے سے اس میں مہارت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ بآسانی انجام پانے لگتا ہے۔ اگر کچھ عرصہ چھوڑ دیا جائے تو مہارت گھٹ جاتی ہے۔ کچھ سکھانے اور کام میں مہارت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مشق کے کافی مواقع ملیں۔ اسی اصول کی بنا پر کوئی قاعدہ سکھانے اور بخوبی ذہن نشین کرانے، کوئی طریقہ سلیقہ بتانے یا پسندیدہ عادات واطوار مستحکم کرانے کے لیے بار بار مشق کرائی جاتی ہے اور برے عادات واطوار ترک کرانے کے لیے ان کے بروئے کار آنے کے مواقع سے محروم کر دیا جاتا ہے اور پوری نگرانی کی جاتی ہے کہ اس کے عمل میں آنے کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔ سگریٹ نوشی یا چوری وغیرہ چھڑانے کے لیے عموماً ترک استعمال ہی پر عمل کیا جاتا ہے۔

سیکھنے میں رفتار ترقی:

کچھ سیکھنے کے دوران میں ترقی کی رفتار یکساں نہیں رہتی۔ اگر پوری آمادگی کے ساتھ کام شروع کیا گیا ہے۔ محنت وانہماک سے کام کیا جا رہا ہے، فضا سازگار ہے، مزاحمت ومخالفت کے امکانات نہیں ہیں۔ اس کام کی ضرورت وافادیت بھی بخوبی سمجھ میں آ گئی ہے۔ تکان اور بیزاری کے بھی اندیشے نہیں ہیں، مشق کے کافی مواقع مل رہے ہیں، نتائج بھی خوشگوار برآمد ہو رہے ہیں تو سیکھنے کی رفتار تیز ہوتی ہے ورنہ سست۔ اس لیے ان شرائط کو پورا کرنے کی پوری کوشش ہونی چاہیے۔

☆ اگر مندرجہ بالا تمام شرائط پوری ہو جاتی ہیں تو ابتداء میں رفتار بہت تیز ہوتی ہے لیکن کچھ عرصہ بعد ترقی بالکل رک جاتی ہے۔ یہ فطری ہے۔ ایسی نوبت آئے تو بددل یا مایوس نہ ہونا چاہیے۔ سیکھی ہوئی بات کو جمنے یا جگہ پکڑنے کے لیے مہلت درکار ہوتی ہے۔ البتہ اگر رفتار کی سستی کا کوئی اور سبب ہو تو اسے دور کرنا چاہیے۔

☆ پورے طور پر ماہر ہونے سے پہلے رفتار ترقی میں اس طرح کے متعدد اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ کبھی رفتار یکبارگی تیز ہو جاتی ہے۔ کبھی مدھم پڑ جاتی ہے، یا بالکل رک جاتی ہے۔

☆ مہارت کی انتہا ہوتی ہے۔ وہاں تک پہنچنے پر ترقی ہمیشہ کے لیے بالکل رک جاتی ہے۔ اب خواہ کتنی بھی کوشش کی جائے مزید ترقی ممکن نہیں۔ اس لیے جب اندازہ ہو جائے کہ کسی کام میں مہارت اپنے درجہ کمال کو پہنچ چکی ہے تو مزید کوشش میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔ البتہ مشق واعادہ برابر جاری رکھا جائے تاکہ کیے دھرے پر پانی نہ پھرنے پائے۔

سیکھنے میں مہارت:

سیکھنے میں مہارت کا انحصار متعدد امور پر ہے۔

ا۔ سیکھنے کا مصمم ارادہ:

مہارت حاصل کرنے کے لیے سب سے اہم شرط سیکھنے والے کا اپنا عزم راسخ ہے۔ جب تک سیکھنے والا کسی کام کے سیکھنے کا خود مصمم ارادہ نہ کرے وہ قطعاً کچھ نہیں سیکھ سکتا۔ سکھانے والا خواہ کتنا ماہر ہو اور سکھانے کے لیے لاکھ سر مارے، مگر سیکھنے والے کی آمادگی اور ارادے کے بغیر وہ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مصمم ارادے کے لیے زوردار تحریک ہونی چاہیے۔ کام کی افادیت واہمیت بخوبی ذہن نشین ہونی چاہیے۔ نیز اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ وہ اس کام کو سیکھ سکتا ہے۔

۲۔ سیکھنے کے لیے اقدام:

محض ارادے سے کچھ نہیں بنتا، سیکھنا ہے تو اس کے لیے عملی جدوجہد کرنی ہوگی۔ ہاتھ پیر

مارے بغیر سیکھا نہیں جا سکتا۔ خود کرنے ہی سے فن آتا ہے۔ مثلاً تیراکی کا فن ہے۔ سکھانے والا خواہ زبردست تیراک ہو اور پوری دلچسپی اور مہارت فن کے ساتھ نظری طور پر تیرنے کے طریقے بتاتا یا عملاً کر کے دکھاتا رہے۔ نیز خود سیکھنے والا پوری دلچسپی سے اس کی باتیں سنتا اور غور سے اس کی تیراکی کا مشاہدہ کرتا رہے، پھر بھی جب تک خود دریا میں اتر کر ہاتھ پیر نہ مارے گا، تیرنا ہرگز نہیں سیکھ سکتا۔ اسی لیے مدارس میں علم کو عمل میں لانے اور خود کر کے سیکھنے پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ کیونکہ مجہول سامع بن کر کسی فن میں مہارت ہرگز نہیں حاصل ہو سکتی۔

۳۔ کام کے لیے موزوں حالات:

سیکھنے کے لیے حالات جتنے موافق اور سازگار ہوں گے، سیکھنے میں اتنی ہی سہولت اور آسانی ہوگی۔ اگر گرد و پیش حالات پرسکون ہوں، فضا سازگار اور موسم موافق ہو۔ توجہ مرکوز کرنے اور یکسوئی کے ساتھ کام پر لگنے میں کوئی خاص امر مانع نہ ہو تو سیکھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ لیکن اگر توجہ کو بھٹکانے، بیزاری پیدا کرنے اور کام میں رکاوٹ ڈالنے والے عوامل موجود ہوں تو سیکھنے میں بڑی زحمت پیش آئے گی۔ بمشکل کچھ سیکھا جا سکے گا۔ اس لیے پرسکون ماحول اور سازگار فضا میں تعلیم دینے پر زور دیا جاتا ہے اور توجہ کو بھٹکانے والی اشیاء کو بچوں سے دور رکھا جاتا ہے۔

۴۔ سخت جدوجہد:

مہارت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پوری توجہ، انہماک اور جانفشانی سے کام کیا جائے۔ پوری کوشش، سخت محنت اور غیر معمولی جدوجہد کے بغیر مہارت حاصل نہیں ہوتی۔ مہارت اور چابک دستی کے ساتھ کام میں تیز رفتاری اور سرعت کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔ اطمینان کے ساتھ کام کرنا تو بہر حال ضروری ہے لیکن اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ کاہلی اور سست رفتاری سے کام کیا جائے۔ ماہر فن عموماً سست رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ابتدا ہی سے اس طرف توجہ دی جائے تو مہارت کے ساتھ تیز رفتاری بھی بآسانی پیدا ہو سکتی ہے۔

۵۔ مدت کارکردگی:

کارکردگی کی مدت نہ تو بہت طویل ہونی چاہیے کہ بچہ تھک کر چور چور ہو جائے اور نہ اتنی مختصر کہ کوئی خاص نتیجہ ہی برآمد نہ ہو سکے۔ بلکہ عمر اور صحت کا لحاظ کر کے مقرر کی جائے۔ اگر تکان غالب آنے لگے تو کام روک کر آرام کا موقع ملنا چاہیے۔ غیر معمولی تکان اور خستگی کی حالت میں کام کرنا صحت کے لیے انتہائی مضر بھی ہوتا ہے اور بے سود بھی۔ نظام الاوقات میں تکان اور بیزاری کا اس لیے غیر معمولی لحاظ رکھا جاتا ہے۔

بچوں کے سیکھنے کے عمل پر اثر انداز عوامل

تجربہ سے پتہ چلتا ہے کہ بچوں کے سیکھنے کے عمل پر مندرجہ ذیل عوامل بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں:

ا۔ ذہانت:

جو بچہ جتنا زیادہ ذہین ہوتا ہے وہ اتنی ہی آسانی سے سیکھتا ہے اور سیکھی ہوئی باتوں کو نئے حالات پر منطبق یا نئی صورت حال سے نمٹنے میں استعمال کر سکتا ہے۔

۲۔ عمر:

پندرہ سولہ سال تک عام عمر کے ساتھ۔ بچے کی ذہنی عمر میں بھی برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے سیکھنے کا عمل بھی سرعت اور سہولت کے ساتھ برابر جاری رہتا ہے۔ اس عمر تک بچوں کو بہت کچھ سکھایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ذہنی عمر میں کم ہی اضافہ ہوتا ہے اور سیکھنے کی رفتار بہت سست ہو جاتی ہے اور صرف کسی خاص فن یا چند ہی علوم میں مہارت حاصل کر سکتا ہے۔ اس لیے ذوق پیدا کرانے اور مختلف علوم وفنون سے لگاؤ پیدا کرنے کا سب سے اچھا دور پندرہ سولہ سال کی عمر ہی تک ہوتا ہے۔ اسی دوران میں مختلف علوم وفنون کی شد بد کرا دینی چاہیے تا کہ وہ خود یا اس کے بڑے بعد کے مرحلے کے لیے مناسب مضامین ومشاغل کا انتخاب کر سکیں۔

۳۔ تجربہ:

سیکھے ہوئے کام کو عمل میں لا کر تجربات حاصل کرنے کے لیے جتنے زیادہ مواقع ملیں گے اتنی ہی زیادہ مہارت بھی ہوگی اور اس ضمن میں یا اس طرح کی نئی باتیں سیکھنے میں آسانی بھی ہوگی اس لیے تجربات کے زیادہ سے زیادہ مواقع دیئے جائیں۔

۴۔ تحریک:

سیکھنے کے لیے جتنی زوردار تحریک اور بچے کی طرف سے جتنی زیادہ آمادگی ہوگی اتنی ہی زیادہ وہ قوت لگائے گا اور اتنی ہی سخت محنت اور غیر معمولی جدوجہد کرے گا۔ نتیجے میں اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوگا اس لیے کچھ سکھانے سے پہلے بچوں کو اس کے لیے پورے طور پر آمادہ کر لینا چاہیے۔

۵۔ خوشگوار نتیجہ:

سیکھنے کے دوران اگر جدوجہد کا اطمینان بخش نتیجہ بھی آنکھوں کے سامنے آتا رہے تو جدوجہد میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ کامیابی بذات خود بہت زبردست محرک ہے۔ اس لیے بچوں کو اپنی کوششوں کے نتائج کا مشاہدہ کرنے کے برابر مواقع ملنے چاہئیں۔

۶۔ مزید تقویت:

سیکھنے کے دوران میں انعام یا شاباشی کے ذریعہ برابر مزید تقویت بہم پہنچاتے رہنا چاہیے۔ اس سے سیکھنے کے عمل میں آسانی اور رفتار ترقی میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ بچے اپنی کوششوں میں جس درجہ بھی کامیابی کا مظاہرہ کریں اس پر انہیں شاباشی ملنی چاہیے اور ان کی کوششوں کو استحسان کی نظر سے دیکھنا چاہیے اور مختلف طریقوں سے ان کی ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ اس سے چستی اور دل جمعی پیدا ہوتی اور قوت کارکردگی بڑھتی ہے۔ انعامات، پوزیشن، نمبر، سندات وغیرہ اس سلسلے کے مفید حربے ہیں۔

۷۔ اعادہ:

اعادہ اور تکرار کا جتنا زیادہ موقع ملے گا، سیکھنے کا عمل اتنا ہی زیادہ آسانی اور سرعت سے انجام پائے گا اور اس سے متعلق نئی نئی باتیں سیکھنے کی بھی تحریک ہوگی۔

۸۔ تعلق خاطر:

بچوں میں نئی باتیں جانے یا نئی چیزیں سیکھنے کی جتنی زیادہ تڑپ، بے چینی اور لگن ہوگی اتنی ہی زیادہ توجہ، انہماک اور کوشش سے وہ اسے سیکھیں گے۔ لگن اور پیاس پیدا کرنے یا تجسس ابھار دینے سے سکھانے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ بغیر تعلق خاطر کے کچھ سیکھنا سکھانا مشکل ہے۔

...... ☆☆☆ ......

باب ۲۳:

توجہ اور دلچسپی

ذہن کی اس کیفیت کو توجہ کہتے ہیں جب اسے دوسری تمام چیزوں سے ہٹا کر کسی ایک چیز پر مرکوز کر دیا جاتا ہے تاکہ اس ایک چیز کے بارے میں کافی معلومات حاصل کی جا سکیں۔

اساتذہ اپنے طلبہ سے عام طور پر توجہ دینے کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کا یہ مطالبہ ہے بھی معقول کیونکہ تعلیم وتربیت میں کسی پیش رفت کی اس وقت تک توقع ہی نہیں کی جا سکتی جب تک طلبہ لکھنے پڑھنے، استاد کی باتیں غور سے سننے اور مفوضہ کاموں کو انجام دینے کی طرف ہمہ تن متوجہ نہ ہوں۔

☆ بیداری اور شعور کی حالت میں ذہن برابر کسی نہ کسی چیز کی طرف متوجہ رہتا ہے، کبھی کسی کی باتوں یا حرکات کی طرف، کبھی خود اپنے ہی کاموں یا تصورات وخیالات کی طرف۔ جب ہم بظاہر خالی بیٹھے ہوتے ہیں، اس وقت بھی خیالات وتصورات کا ایک دھارا برابر رواں دواں رہتا ہے، کبھی ایک بات سمجھ میں آتی ہے کبھی دوسری۔

☆ ذہن جب کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے وہ چیز ذہن کے مرکز میں آ جاتی ہے۔ باقی چیزیں ذہن کے حاشیے میں پہنچ جاتی ہیں۔ ایک دفعہ میں توجہ ایک ہی چیز پر مرکوز ہوتی ہے۔ دوسری چیز جوں ہی مرکز توجہ بنتی ہے پہلی فوراً ہٹ کر حاشیے میں چلی جاتی ہے۔ شعور کی حالت میں یہی عمل جاری رہتا ہے۔

☆ ایک ہی چیز پر دیر تک توجہ مرکوز نہیں رہ سکتی۔ منٹ میں عموماً چار پانچ بار توجہ بھٹکتی ہے۔ چھوٹے بچے تو پانچ سات سیکنڈ سے زیادہ کسی ایک چیز پر توجہ مرتکز کر ہی نہیں سکتے۔ الا یہ کہ اس چیز کے مختلف پہلو باری باری سامنے لائے جائیں۔ ایسی صورت میں کچھ دیر تک توجہ

مرکوز ہوسکتی ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو چند ہی سیکنڈ میں توجہ کسی اور طرف چلی جائے گی۔ نماز میں برابر متوجہ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ جو کچھ پڑھا جائے اس کے مفہوم اور تقاضوں پر بھی ساتھ ہی غور کیا جائے ورنہ معلوم نہیں کیا کیا خیالات آنے لگتے ہیں۔

☆ ایک فرد کی ایک دفعہ میں ایک ہی چیز پر توجہ ہوسکتی ہے۔ جو لوگ بیک وقت کئی باتوں پر توجہ دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ سخت غلطی کرتے ہیں۔ اس طرح وہ یکسوئی کے ساتھ ایک چیز کی طرف بھی توجہ نہیں دے سکتے۔ کئی چیزوں پر بیک وقت اس صورت میں توجہ دی جاسکتی ہے جب وہ سب مل کر ایک ایسے کل میں تبدیل ہو جائیں جس پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جا سکے، مثلاً تاروں کے جھرمٹ، عقد ثریا اور دب اکبر وغیرہ یا انسانی جسم جو مختلف اعضاء سے مل کر بنتا ہے یا کوئی منظر جو متعدد اشیاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ بحیثیت مجموعی ایک نظر میں یہ چیزیں توجہ کا مرکز بن سکتی ہیں لیکن جب بھی ان کے کسی ایک جز پر توجہ مرکوز ہوگی باقی اجزاء مرکز سے پرے ہٹ جائیں گے۔

☆ بعض بچے لکھتے پڑھتے یا آموختہ دیکھتے وقت کچھ کھاتے بھی جاتے ہیں یا ادھر ادھر دیکھتے یا تعلیمی سامان کو بلاضرورت چھوتے یا اس سے کھیلتے رہتے ہیں۔ یہ ٹھیک نہیں اس طرح توجہ مرکوز نہیں رہ سکتی بلکہ بھٹک کر دوسری طرف چلی جاتی ہے۔ ان حرکات سے بچوں کو روکنا چاہیے۔ ایک وقت میں ایک ہی کام ہوسکتا ہے۔

توجہ کی شرائط:

اساتذہ اور والدین کو عام طور پر یہ شکایت رہتی ہے کہ بچے لکھنے پڑھنے یا کسی اور سنجیدہ کام کو انجام دینے کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ عموماً کھیلنے کودنے، آوارہ گردی کرنے، ہم جولیوں سے خوش گپیاں کرنے یا کچھ بنانے بگاڑنے ہی میں اپنا وقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔ تعلیم کی بجائے ان کی توجہ دوسری لغو اور لایعنی چیزوں کی طرف ہوتی ہے۔ ان کی شکایت ہے تو دراصل حقیقت پر مبنی

لیکن اس میں تنہا بچوں کا قصور نہیں بلکہ وہ بھی اس میں برابر کے شریک ہیں کیونکہ ان کی طرف سے دراصل وہ شرطیں پوری نہیں کی جاتیں جو بچوں کو لکھنے پڑھنے یا کسی مناسب کام پر توجہ دینے کے لیے ضروری ہیں۔

کسی طرف توجہ مبذول ہونے کی متعدد شرطیں ہیں ان میں سے کچھ (۱) خارجی ہیں اور کچھ (۲) داخلی۔

خارجی شرطیں:

خارجی شرطیں حسب ذیل ہیں:

☆ **شدت:** جو چیز شدت میں جتنی زیادہ اور سائز میں جتنی بڑی ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ جاذب توجہ ہوتی ہے۔ مثلاً شوخ رنگ، تیز روشنی، بلند آواز، حسین صورت، بڑا پوسٹر وغیرہ۔ اس کے برعکس سائز میں چھوٹی یا شدت میں معمولی چیزیں نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ اس لیے تختہ سیاہ پر اسکیچ بڑا اور خط جلی ہونا چاہیے اور حتی الامکان چاک بھی رنگین ہی استعمال کرنی چاہیے۔ طلبہ کے سامنے بہت دھیمی آواز میں بولنا بھی ٹھیک نہیں۔ اتنی بلند آواز سے بولنا چاہیے کہ پورا درجہ بخوبی سن سکے البتہ چیخنا چلانا مختلف وجوہ سے درست نہیں۔

☆ **تکرار یا اعادہ:** کسی لفظ، فقرے یا جملے کی تکرار مثلاً دوڑو! دوڑو!! سانپ! سانپ! چور! چور!! ہلاک ہوا وہ! ہلاک ہوا وہ!! وغیرہ بڑی آسانی سے توجہ کو کھینچ لیتے ہیں۔ ایسی کہانیاں بچے بڑے غور سے سنتے ہیں جن میں ایک شگفتہ جملہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد دہرایا جاتا ہے۔ اسی طرح کسی اشتہار کا متعدد بار سامنے آنا بھی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرا لیتا ہے۔

☆ **حرکت یا تبدیلی:** حرکت کرنے، پھیلنے، بڑھنے یا برابر روپ بدلنے والی چیزیں بھی توجہ و بآسانی کھینچ لیتی ہیں اور دیر تک متوجہ رکھتی ہیں۔ سائن بورڈوں پر لگے ہوئے بلب جو جلتے

بجھتے رہتے ہیں، اسی غرض سے لگائے جاتے ہیں کہ لوگ بآسانی ادھر متوجہ ہوں۔ آوازوں میں اتار چڑھاؤ بھی توجہ کو مرکوز رکھتا ہے۔ چلتے چلتے کسی کا پھسل کر گر پڑنا، جلتی ہوئی بتی کا اچانک بجھ جانا، روشنی کا مدھم ہونے لگنا یا چلتے چلتے پنکھے کا رک جانا۔ عام حالات میں ان پر توجہ نہیں ہوتی لیکن جوں ہی ان میں کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہے، توجہ فوراً اس کی طرف منعطف ہو جاتی ہے۔

☆ **جدت یا نیاپن:** کوئی نئی چیز سامنے آتی ہے تو فوراً توجہ کو کھینچ لیتی ہے۔ کوئی مانوس چیز بھی خلاف توقع اگر ہیئت بدل کر یا کسی غیر معمولی حالت میں سامنے آتی ہے تو جاذب توجہ بن جاتی ہے۔ مثلاً کسی ساتھی کا عجیب وغریب لباس میں آنا، البتہ کسی نئی چیز کا بالکل نامانوس ہونا ٹھیک نہیں۔ سابقہ معلومات سے ہر نئی چیز کا کچھ ربط ہونا چاہیے خواہ یہ تعلق مماثلت کے بجائے تضاد ہی کا کیوں نہ ہو، ورنہ نظر انداز ہو جائے گی۔ یا بچے اس سے وحشت محسوس کریں گے۔

☆ **واضح اور قابل فہم ہونا:** وہ چیزیں نسبتاً زیادہ جاذب توجہ ہوتی ہیں جو صاف ستھری، خوبصورت اور واضح ہوں، نیز آسانی سے سمجھ میں آجائیں۔ مبہم یا غیر واضح اشیاء پر کم ہی توجہ جاتی ہے۔

☆ **موازنہ ومقابلہ:** دو متضاد چیزوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں پیش کیا جائے تو جاذب توجہ بن جاتی ہیں۔ دو متضاد رنگوں میں بنی ہوئی تصویریں یا چارٹس، دو مقامات کی پیداوار، دو افراد کی آمدنیاں، دو ممالک کی شرح اموات وغیرہ جن میں نمایاں فرق ہو۔ اگر ساتھ ساتھ پیش کی جائیں تو توجہ کو زیادہ آسانی سے کھینچ لیتی ہیں۔

داخلی شرطیں

یہ تو رہیں خارجی شرطیں، توجہ کی کچھ داخلی شرطیں بھی ہیں مثلاً:

☆ دلچسپی: ہم عموماً صرف ان چیزوں کی طرف توجہ دیتے ہیں جن سے ہمیں فطری دلچسپی یا طبعی مناسبت ہوتی ہے، ایک بچہ کھانے کھیلنے کی چیزوں کی طرف بآسانی متوجہ ہوگا۔ جب کہ ایک محقق قلمی مسودات اور کرم خوردہ مخطوطات کی طرف۔

☆ عادت: تربیت کے ذریعے جس چیز پر توجہ دینے کی عادت ڈلوائی جائے گی رفتہ رفتہ اس طرف توجہ ہونے لگے گی خواہ وہ چیز بذات خود بہت زیادہ جاذب توجہ نہ ہو۔ ایک انجینئر انجن پر، تار بابو تار کی آواز پر، قاری کسی کی قرأت پر اور طبیب نسخوں کی طرف بآسانی متوجہ ہو جاتا ہے کیونکہ ان پر توجہ دینے کی انہیں عادت ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف محکموں میں کام کرنے والے لوگ جب گھروں پر بھی آپس میں ملتے ہیں تو اپنے محکمے ہی کی باتیں کرتے رہتے ہیں حالانکہ محکمہ جاتی کام عموماً خشک ہی ہوتے ہیں۔

☆ فطری داعیات اور حیاتیاتی ضروریات: وہ چیزیں بآسانی بچوں کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں جن سے ان کی کوئی فطری خواہش یا حیاتیاتی ضرورت پوری ہو، مثلاً کھانے پینے یا کھیلنے کودنے کی چیزیں وغیرہ۔

☆ مزاج اور موڈ: توجہ پر مزاج اور موڈ کا بھی اثر پڑتا ہے۔ بعض لوگ اپنے مزاج ہی کی وجہ سے اپنے تصورات ہی میں مگن اور اپنے خیالات میں گم رہتے ہیں تو بعض بیرونی دنیا اور گرد وپیش میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور ان پر توجہ دیتے ہیں۔ اسی طرح جب خفگی کا موڈ طاری ہوتا ہے تو گرد وپیش کی معمولی بے اعتدالیاں بھی متوجہ کر لیتی اور غصے کو مزید بھڑکا دیتی ہیں۔ جب کہ خوش وخرم ہونے کی صورت میں اس طرح کی معمولی کوتاہیوں کی طرف سے صرف نظر کر لیتے ہیں اور ان پر قطعاً کوئی توجہ نہیں دیتے۔

☆ دماغی قوت: تازہ دم اور ہشاش بشاش ہونے کی صورت میں کسی چیز کی طرف دیر تک توجہ مرکوز رہ سکتی ہے۔ لیکن رنج یا صدمے کی صورت میں بیرونی کی بجائے اندرونی چیزوں پر توجہ رہتی ہے۔ تکان کی صورت میں توجہ بار بار بھٹکتی ہے اور ذہن کسی ایک چیز پر مرکوز نہیں ہوتا۔

توجہ کی قسمیں

توجہ کی مختلف قسمیں ہیں:

ا۔ ارادی اور غیر ارادی توجہ:

☆ جب کسی چیز پر اس لیے توجہ دی جاتی ہے کہ وہ کسی اور مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے تو اسے ارادی توجہ کہتے ہیں مثلاً امتحان پاس کرنے، طلبہ میں نمایاں ہونے، اساتذہ کی خوشنودی حاصل کرنے یا والدین کی نظروں میں محبوب بننے کے لیے تعلیم یا کسی اور کام پر توجہ دینا۔

☆ جب کوئی چیز بذات خود جاذب توجہ ہو اور اس کی طرف توجہ دینے کے لیے کسی ارادے کی ضرورت پیش نہ آئے تو اسے غیر ارادی توجہ کہتے ہیں۔ مثلاً تیز آواز، شوخ رنگ، شور وغل، ڈگڈگی کی آواز، چلتی ہوئی ٹرین، اڑتے ہوئے جہاز، گزرتے ہوئے جلوس وغیرہ کی طرف متوجہ ہونا۔

ارادی اور غیر ارادی کی بھی مزید دو قسمیں ہیں۔ ذیل کی شکل ملاحظہ ہو۔

توجہ

ارادی | غیر ارادی

صریح ارادی | مضمر ارادی | بیساختہ غیر ارادی | جبری غیر ارادی

☆ مضمر ارادی توجہ: جب کسی چیز کی طرف متوجہ رہنے کے لیے صرف ایک بار ارادہ کر لینا کافی ہو تو یہ ارادی مضمر توجہ کہلائے گی۔ مثلاً ارادہ کر کے مطالعہ یا کسی کام پر بچہ لگ گیا اور بغیر مزاحمت دیر تک لگا رہا۔

☆ صریح ارادی توجہ: جب کسی وجہ سے توجہ بھٹکتی رہے اور کسی چیز کی طرف متوجہ رہنے کے لیے بار بار ارادے اور کوشش کی ضرورت پیش آئے تو وہ صریح ارادی توجہ کہلائے گی۔ مثلاً

مطالعہ یا کسی کام کے وقت توجہ کو اپنی طرف کھینچنے والی متعدد چیزیں گرد وپیش میں ہوں یا کوئی خیال بار بار ذہن میں آ کر توجہ کو بھٹکانے کی کوشش کرے لیکن بار بار ان کی طرف سے صرف نظر کر کے توجہ کو کام پر مرکوز رکھنے کی کوشش کی جائے۔

☆ **جبری غیر ارادی توجہ:** جب ارادے اور مرضی کے خلاف جبراً توجہ کسی چیز کی طرف منعطف ہو جاتی ہے تو اسے جبری غیر ارادی توجہ کہتے ہیں۔ مثلاً ایک بچہ بالقصد مطالعے کے لیے بیٹھا۔ امتحان قریب ہے وہ محنت اور توجہ سے تیاری کرنا چاہتا ہے لیکن گرد وپیش شور وغل یا لوگوں کی آمد ورفت کی وجہ سے وہ مجبوراً مطالعہ کے بجائے دوسری طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

☆ **بے ساختہ غیر ارادی توجہ:** جب فطری دلچسپی یا تعلق خاطر کے باعث ذہن کسی چیز کی طرف یکا یک متوجہ ہو جاتا ہے تو اسے بے ساختہ غیر ارادی توجہ کہتے ہیں۔ مثلاً مطالعہ کے دوران میں کسی جگری دوست کی آمد یا نظروں کے سامنے ہم جولیوں کا کوئی دلچسپ کھیل شروع کر دینا وغیرہ۔ ایسی صورت میں بچہ جوش مسرت یا فطری دلچسپی کی وجہ سے اصل کام کو بھول کر بے ساختہ دوسری طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ مرتکز اور منقسم توجہ:

بعض افراد فطرتاً گہری توجہ کے مالک ہوتے ہیں اور کسی ایک ہی چیز پر دیر تک توجہ مرکوز رکھ سکتے ہیں، بعض کی توجہ منقسم ہوتی ہے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بدل بدل کر مختلف چیزوں کی طرف ایک ساتھ توجہ کر سکتے ہیں۔ علمی کام کرنے کے لیے گہری توجہ کی ضرورت ہوتی ہے اور عملی کام یا انتظامی امور کے لیے منقسم توجہ کی۔ لڑکیاں منقسم توجہ کی مالک ہوتی ہیں اس لیے ریاضی میں وہ کمزور رہتی ہیں کیونکہ یہ مضمون گہری توجہ چاہتا ہے۔

۳۔ ڈانواڈول اور پائیدار توجہ:

چھوٹے بچوں کی توجہ بار بار بھٹکتی ہے، وہ کسی ایک چیز پر زیادہ دیر تک توجہ نہیں دے سکتے جب کہ بڑوں کی توجہ نسبتاً پائیدار ہوتی ہے اور وہ دیر تک ایک ہی طرف متوجہ رہ سکتے ہیں۔ علالت یا تکان کی وجہ سے بھی توجہ جلد جلد بھٹکتی ہے۔

توجہ اور دلچسپی

توجہ اور دلچسپی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر فرد عموماً ان چیزوں کی طرف توجہ دیتا ہے جو اس کے لیے دلچسپ ہوتی ہیں۔

بچوں کے بارے میں ہم سب جانتے ہیں کہ وہ

☆ محنت مشقت سے جی چراتے ہیں اور جم کر کوئی کام کرنا نہیں چاہتے۔
☆ چھٹیوں کا بے چینی سے انتظار کرتے رہتے اور سیر و تفریح یا کھیل کود کے منصوبے بنایا کرتے ہیں۔
☆ آزاد منش ہوتے ہیں، کسی کا دباؤ اور تسلط پسند نہیں کرتے اور نہ کوئی پابندی گوارا کرتے ہیں۔
☆ توجہ اور انہماک سے گھبراتے اور کوسوں دور بھاگتے ہیں۔
☆ توڑ پھوڑ، شور و شغب، ہنگامہ آرائی اور کھیل کود کے رسیا ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے ایسی مخلوق کو لکھنے پڑھنے یا کسی سنجیدہ کام پر لگانا آسان نہیں ہے۔ بچے ان چیزوں پر اسی صورت میں توجہ دیں گے جب یہ کام ان کے لیے دلچسپ بنا دیے جائیں۔

اسباق کو دلچسپ بنانے کے لیے مندرجہ ذیل تدابیر کارگر ہو سکتی ہیں:

☆ سب سے پہلے سبق کی غرض و غایت بچوں کے ذہن میں بخوبی بٹھا دی جائے یہاں تک کہ وہ اپنے طور پر اس کی ضرورت و افادیت محسوس کر لیں۔

☆ سبق اس انداز سے پیش کیا جائے کہ اس سے بچے کی اپنی کوئی بنیادی خواہش، فطری داعیہ، جبلی تقاضا یا ذاتی غرض پوری ہوتی ہو۔ مثلاً کھیل کھیل میں تعلیم دی جائے یا تجسس کو ابھار کر اس کی تسکین کا سامان کیا جائے۔ کچھ تعمیری کام اور بنانے بگاڑنے کا موقع دیا جائے، ہم جولیوں کی قدر دانی، بڑوں کی ہمت افزائی، اساتذہ کی خوشنودی وغیرہ کے حصول کا ذریعہ بنایا جائے وغیرہ۔

☆ اگر ممکن ہو تو سبق کا مواد کہانی یا مکالمے کی شکل میں پیش کیا جائے۔

☆ اصولی باتوں اور مجرد تصورات کو ٹھوس اشیاء، دلچسپ مثالوں اور نقشوں، چارٹوں وغیرہ کی مدد سے سمجھایا جائے۔

☆ توضیحی وتشریحی سامان، گلوب، چارٹس، نقشہ جات، تصاویر، ماڈل، رنگین چاک کے اسکیچ وغیرہ سے سبق کو واضح کیا جائے۔

☆ بچوں کی شخصیت اور ان کی کوششوں کو اہمیت دی جائے۔ سبق کو آگے بڑھانے میں ان سے امداد لی جائے۔ ان سے مشورے مانگے جائیں۔ البتہ ناکامی کے مواقع نہ آنے پائیں۔

☆ کسی حد تک مقابلے ومسابقت کے مواقع دیئے جائیں۔

☆ بچوں کو اپنی کوششوں کے مفید نتائج اپنی نظروں سے دیکھ لینے کا بندوبست کیا جائے۔

☆ کوششوں میں کامیابی پر دل کھول کر سراہا جائے اور شاباشی دی جائے۔

☆ سبق کو اس کی روزمرہ کی زندگی سے مربوط کر دیا جائے اور اس سے متعلق گھر کے لیے کوئی ایسا کام دیا جائے جس سے اس کی کسی جبلت کی تسکین ہوتی ہو مثلاً ٹکٹ، پتیاں، تصاویر، بیج وغیرہ جمع کرنا، کوئی ماڈل بنانا وغیرہ۔

☆ سویرے جب بچے مدرسے آتے ہیں تو ان کی توجہ بھٹکتی رہتی ہے۔ اس لیے پہلے گھنٹے میں کوئی آسان یا فطری دلچسپی کا مضمون رکھا جائے۔

☆ تھوڑی دیر کے بعد بچوں کی توجہ بہت تیزی سے بڑھتی ہے اور دوسرے تیسرے گھنٹے میں

اپنے شباب پر پہنچ جاتی ہے۔ ان گھنٹوں میں توجہ طلب اہم اور مشکل مضامین رکھے جائیں۔ مثلاً حساب عربی اور مادری زبان وغیرہ۔

☆ چھوٹے بچوں کی توجہ جلد جلد بھٹکتی ہے وہ کسی ایک چیز پر زیادہ دیر تک توجہ مرکوز نہیں رکھ سکتے اس لیے ان کے گھنٹے مختصر رکھے جائیں اور دیر تک توجہ مرکوز کرنے کا عادی بنانے کے لیے پہلو بدل بدل کر اور ندرت کی کچھ چاشنی شامل کر کے چیزوں کو پیش کیا جائے تا کہ وہ کچھ دیر تک متوجہ رہ سکیں۔

☆ بچوں کو متوجہ کرنے اور سبق میں ان کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مدرس خود اپنے کام کی طرف غیر معمولی توجہ دے اور سبق میں پوری توجہ اور دلچسپی کا مظاہرہ کرے۔

☆ سبق کے مختلف اجزاء کو اس انداز سے ترتیب دے کر اور باہم مربوط کر کے پیش کیا جائے کہ ایک جز دوسرے کا تتمہ معلوم ہو اور فطری طور پر توجہ اگلے جز کی طرف منتقل ہو جائے۔ ایسا نہ ہونے پائے کہ ایک جز ختم ہونے پر ساتھ ہی توجہ بھی ختم ہو جائے۔

☆ اسی طرح مختلف مضامین کو بھی باہم اس طرح مربوط کر کے پڑھایا جائے کہ ایک مضمون سے فطری طور پر ذہن دوسرے مضمون کی طرف منتقل ہو جائے تا کہ ایک مضمون ختم ہونے پر توجہ بھٹکنے نہ پائے۔

☆ ہر نئی بات سابقہ معلومات سے مربوط کر کے پیش کی جائے تا کہ سبق بچوں کے لیے بالکل نامانوس یا ناقابل فہم نہ رہے۔

☆ ابتدائی درجات کے بچے صرف ان چیزوں کی طرف توجہ دیتے ہیں جن میں فطری دلچسپی ہوتی ہے یا جو توجہ کو بے ساختہ کھینچ لیتی ہیں۔ مثلاً کھیل، آرٹ وکرافٹ کے کام، شوخ رنگ، تیز آواز، متحرک اور پھیلنے والی اشیاء وغیرہ۔ ان چیزوں کے ذریعے اگر تعلیم دی جائے تو ان کی توجہ کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ مثلاً کھیل کھیل میں تعلیم دینا، تدریس میں رنگین تصاویر کا استعمال وغیرہ لیکن بتدریج بچوں کو ارادی توجہ کا عادی بنانا چاہیے کیونکہ زندگی میں

انسان کو بیشتر ایسے کاموں سے سابقہ پیش آتا ہے جو بذات خود دلچسپ نہیں ہوتے تاکہ بچے ان کاموں پر بھی توجہ دینے لگیں جو بہر حال ان کے لیے بہت مفید اور نہایت ضروری ہوتے ہیں لیکن ان میں فطری دلچسپی نہیں ہوتی۔

☆ تدریس کا کام پر سکون ماحول اور اچھی فضا میں انجام دیں تاکہ طلبہ بآسانی متوجہ ہوں اور توجہ ہٹانے والی اشیاء کو قریب نہ پھٹکنے دیں۔ غیر متعلق تعلیمی سامان بستے میں رکھوا دیں۔ تختہ سیاہ پر سے غیر متعلق تحریر مٹا دیں۔ غیر متعلق تصاویر اور چارٹس سامنے سے ہٹا دیں۔

☆ بچوں کو متوجہ کرنے کے لیے بار بار ڈرانا، دھمکانا، میز پر ہاتھ مارنا، چھڑی دکھانا، چیخنا، چلانا مناسب نہیں ایسا کرنے سے تھوڑی دیر کے لیے بچہ متوجہ تو ہو جاتا ہے لیکن ایسی توجہ میں پائیداری نہیں ہوتی، ساتھ ہی ان چیزوں کا زیادہ استعمال بعض ایسے جذبات پیدا کر دیتا ہے جو اصل چیز کی طرف توجہ دینے میں مانع ہوتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد اس طرح کی کوششیں غیر مؤثر اور بے سود ثابت ہوتی ہیں۔

☆ درجے پر برابر نظر رکھنی چاہیے۔ تختہ سیاہ لکھتے وقت بھی درجے کی طرف پیٹھ نہ کرنی چاہیے بلکہ ایک جانب سے لکھنا اور بار بار درجے کی طرف دیکھتے رہنا چاہیے۔ غیر متوجہ طلبہ سے اچانک سوال کر لینا چاہیے۔ اس طرح سبق کی طرف درجے کی توجہ برقرار رہے گی۔

☆ بچوں کی توجہ کا دائرہ بہت محدود ہوتا ہے، وقت واحد میں چند ہی اشیاء سما سکتی ہیں۔ اس لیے پڑھاتے وقت مختصر جملے استعمال کرنے چاہئیں۔ بہت ٹھہر ٹھہر کر بولنا چاہیے۔ املا لکھاتے وقت ایک دفعہ میں بہت مختصر فقرہ بولنا چاہیے۔

............☆☆☆............

باب ۲۴:

حافظہ

(یادداشت)

حافظہ ہمارے ذہن کی وہ قوت ہے جس کے ذریعے ہم پیش آمدہ باتوں، واقعات، تجربات اور اشکال وغیرہ کو ذہن میں جماتے، دوبارہ ذہن میں لاتے اور سابقہ کی حیثیت سے انہیں شناخت کرتے ہیں۔

حافظے کی اہمیت وافادیت محتاج بیان نہیں۔ اس کے بغیر ہم ایک قدم نہیں چل سکتے۔ ذرا غور فرمایئے۔ اگر ہم اپنے سابق تجربات بھولتے جائیں، ہمیں اپنے وعدے، قرض اور لین دین کے معاملات یاد ہی نہ رہیں۔ مختلف مقامات، وہاں تک آنے جانے کے راستے، جانی پہچانی صورتیں، لوگوں سے رشتے ناطے اور ان کی باتیں اور شکلیں اگر ہمارے ذہن سے محو ہو جائیں یا خدا رسول ﷺ کی ہدایات اگر ہمیں یاد ہی نہ رہیں تو سوچیے زندگی دوبھر اور وبال جان ہو جائے۔ حافظے کے بغیر ہم جن زحمتوں سے دوچار ہو سکتے ہیں، ہر ایک اس کا بآسانی اندازہ کر سکتا ہے۔

حافظہ ایک فطری قوت ہے اس کا تعلق دماغ کی طبعی ساخت سے ہے۔ اس لیے اس میں کسی طرح کی کمی بیشی کا تو سوال نہیں۔ جیسا کچھ باری تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو جائے ویسا ہی برقرار رہے گا۔ البتہ اگر اس سے کام لینے کا سلیقہ آتا ہو تو معمولی حافظے کا آدمی بھی ان شاءاللہ اپنا کام بخوبی چلا سکتا ہے اس لیے اس قوت سے مناسب کام لینے کا طریقہ بہر حال ہر ایک کو جان لینا چاہیے۔

حافظے میں اگر مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جائیں تو وہ اچھا حافظہ کہلاتا ہے۔

☆ جلد یاد کر لینا۔

☆ دیر تک یاد رکھنا۔

☆ بوقت ضرورت یاد آجانا۔

☆ بیکار باتوں کو بھول جانا۔

اگر ہم اس قوت کو سلیقے سے کام میں لانا سیکھ لیں تو حافظے میں یہ صفات پیدا ہو سکتی ہیں۔ اس ضمن کی تدابیر پر غور کرنے سے پہلے حافظے کے عمل سے متعلق کچھ اور ضروری باتیں جان لینی چاہئیں۔

حافظے کے ارکان

حافظے کے ہر عمل میں مندرجہ ذیل ارکان پائے جاتے ہیں۔

ا۔ تحفظ:

یعنی کسی واقعہ، بات یا چیز وغیرہ کا ذہن میں داخل ہو کر جگہ پکڑ لینا۔ جو بات ذہن میں جتنی وضاحت سے داخل ہوتی اور جتنی توجہ سے جمائی جاتی ہے، ذہن پر اتنے ہی گہرے نقوش چھوڑتی اور دیر تک محفوظ رہتی ہے۔ اگر اس ضمن میں لاپروائی برتی جائے یا اس پر سے سرسری گزر جایا جائے تو نقوش دھندلے ہوں گے اور جلد محو ہو جائیں گے۔ یاد کرانے سے پہلے اگر اس کا مفہوم، اس کی ضرورت و افادیت بخوبی ذہن نشین کرادی جائے تو وہ سوچ سمجھ کر اور زیادہ توجہ سے یاد کی جائے گی اور زیادہ دنوں تک یاد رہے گی۔ ابتداء میں بچے بہت سی باتیں بے سمجھے بوجھے محض سن سنا کر اور بار بار دہرا کر نقالی میں رٹ لیتے ہیں اور اس طرح بھی ان کو بہت کچھ رٹایا جا سکتا ہے۔ اس طرح کی رٹائی ہوئی باتیں بھی بڑی اہمیت و افادیت کی حامل ہوتی ہیں۔ مثلاً دعائیں، افکار، اشعار، ضرب الامثال، پہاڑے وغیرہ لیکن اگر یاد کرنے سے پہلے بچوں کو ان کا مفہوم سمجھا دیا جائے اور ان کی اہمیت و افادیت بھی اختصار سے ذہن نشین کرادی جائے یا کھیل کھیل میں یاد کرائی جائیں تو یاد کرنے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے اگر کوئی بات توجہ اور دلچسپی سے یاد کی جاتی ہے تو وہ زیادہ دنوں تک یاد رہتی ہے، یوں بھی انسان کی فطرت ہے کہ عموماً وہی باتیں وہ زیادہ یاد رکھتا ہے، جن سے

اسے دلچسپی اور لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ تذکر:

یعنی محفوظ کی ہوئی بات کو حسب ضرورت دوبارہ ذہن میں لانا، یہ بھی حافظہ کا نہایت ضروری رکن ہے۔ ہمارے ذہن میں متعدد باتوں کا ذخیرہ ہو لیکن وقت پہ اگر یاد ہی نہ آئے تو کس کام کا۔ اس کے برعکس جتنا کچھ بھی یاد ہو اگر بوقت ضرورت یاد آجایا کرے تب تو ہمارے لیے افادیت رکھتا ہے۔

جتنے سلیقے سے کوئی بات ذہن میں محفوظ کی جاتی ہے اتنی ہی آسانی سے حسب ضرورت یاد آجاتی ہے۔ حفظ کرتے وقت مندرجہ ذیل امور کا اگر لحاظ رکھا جائے تو تذکر میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

☆ ایک بات دوسری بات کے سہارے بآسانی یاد آجاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ہر بات الگ الگ ذہن میں جمائی جائے تو بوقت ضرورت اس کے یاد آنے میں دشواری ہوتی ہے۔ اس لیے جونئی بات بھی یاد کرائی جائے سابقہ معلومات سے اس کا ربط ضرور ملا دیا جائے مثلاً علامہ شبلی کی پیدائش (۱۸۵۷ء) پر غدر ہوا اور وفات (۱۹۱۴ء) پر جنگ عظیم چھڑی۔ مولانا آزاد کے سن پیدائش (۱۸۸۸ء) میں آٹھ کے تین ہندسے ہیں۔ موصوف پنڈت نہرو (۱۸۸۹ء) سے ایک سال بڑے تھے۔

☆ مختلف چیزوں میں یہ ربط وتلازم تین طریقوں سے قائم ہو سکتا ہے۔

۱۔ بذریعہ اتصال: دو یا زائد چیزوں میں باہم جتنا قرب، مقارنت یا اتصال ہوگا اتنا ہی وہ ایک دوسرے سے مربوط ہوں گی اور ایک دوسرے کو یاد دلانے کا ذریعہ بنیں گی۔ مثلاً دو دوستوں کو اگر کئی بار ایک ساتھ دیکھا جائے تو ایک کو دیکھتے ہی دوسرا یاد آجائے گا۔ اذان کی آواز سنتے ہی نماز یاد آجانا ناگزیر ہے کیونکہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اسی طرح اگر دو

چیزوں میں ربط قائم کر دیا جائے تو تحفظ اور تذکر دونوں میں آسانی ہوتی ہے۔

۲۔ بذریعہ مماثلت یا موازنہ: نئی چیز کا اگر کسی جانی پہچانی چیز سے موازنہ کر کے دونوں کے مابین مماثلت ومشابہت بخوبی ذہن نشین کرادی جائے تو ایک کے یاد آتے ہی دوسری خود بخود یاد آ جائے گی۔ مثلاً زیبرے کا گدھے سے اور زرافے کا اونٹ سے موازنہ، لیکن واضح رہے مشابہت اگر بہت زیادہ ہوتی ہے تو شناخت میں کبھی کبھی دھوکا بھی ہو جاتا ہے۔ دو ہم شکل بھائیوں کے ضمن میں لوگوں کو اکثر دھوکا ہوتا ہے۔ اس لیے مشابہت ومماثلت بتانے کے ساتھ موازنہ کرتے وقت جزئی فرق بھی واضح کر دیا جائے تاکہ اس طرح کا دھوکا نہ ہو۔ زیبرے کے جسم پر کالی سفید دھاریاں ہوتی ہیں اور زرافے کے پورے جسم پر چتیاں ہوتی ہیں وغیرہ۔ قرآن مجید کی ان آیات کے ضمن میں حفاظ کو اکثر دھوکہ ہو جاتا ہے جن کے الفاظ یا مضامین ملتے جلتے یا بالکل یکساں ہوتے ہیں۔ سیاق وسباق سے اس طرح کی آیات کا بخوبی ربط ملا کر جزئی فرق بخوبی ذہن نشین کرادینا چاہیے تاکہ اس کا اندیشہ نہ رہے۔

۳۔ مقابلہ کر کے: کسی جانی پہچانی چیز سے نئی کا مقابلہ کر کے اگر دونوں کے مابین تضاد نمایاں کر دیا جائے تو بھی ایک کی مدد سے دوسرے کو یاد کرنے اور ایک کی وجہ سے دوسری یاد آجانے میں آسانی ہوتی ہے۔ چیزیں اپنی ضد سے بآسانی پہچان لی جاتی ہیں۔ ایثار کے کسی واقعہ کے ساتھ خودغرضی کا کوئی واقعہ، مذہبی پالیسی کے معاملے میں اورنگ زیب اور اکبر کا مقابلہ۔

غرض مختلف طریقوں سے سابقہ معلومات سے نئی معلومات کا ربط ملا دینے سے خواہ وہ مقارنت کے ذریعے ہو یا مقابلے وموازنے کے ذریعے، بات بھی بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے اور اس کے تحفظ وتذکر میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس لیے بچوں کو سبق پڑھاتے وقت اس کا پورا لحاظ رکھا جائے۔ ہر بات کا سابقہ سے ربط ملایا جائے اور موازنہ ومقابلہ وغیرہ کر کے بخوبی ذہن نشین کرایا جائے۔

☆ کوئی تقریر یا کسی سبق کا مضمون یاد رکھنا ہو تو مناسب صورت یہ ہوگی کہ پہلے اس کا ایک

عنوان مقرر کرلیا جائے اور ذیلی عنوانات اور سرخیوں کے تحت نوٹ کی شکل میں اس کا ایک مختصر خاکہ تیار کرلیا جائے۔ عنوان کی وجہ سے وہ تقریر یا مضمون یاد آ جائے گا اور ذیلی سرخیوں کی مدد سے تسلسل کے ساتھ پورے مضمون یا تقریر کا مواد یاد آتا جائے گا۔

☆ یاد کرتے وقت پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ یاد کیا جائے۔ شک وشبہ کی گنجائش نہ چھوڑی جائے تو یاد آنے میں چوک کم ہوتی ہے۔ ورنہ بھولنے کا قوی اندیشہ رہتا ہے۔

☆ کسی جگہ، چیز یا وقت وغیرہ کے ساتھ مربوط ہو جانے پر بھی باتیں بآسانی یاد آ جاتی ہیں۔

☆ بچوں کا دائرہ شعوری بہت تنگ ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت صرف دو تین باتیں محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ اس لیے ان کی کتابوں میں جملے مختصر اور الفاظ چھوٹے ہونے چاہئیں۔ عبارتی سوالات میں بھی کم سے کم پیچیدگی ہونی چاہیے۔ ایک ساتھ کئی باتوں کا حکم نہیں دینا چاہیے۔ ورنہ بعض باتیں بھول جائیں گی۔ بازار سے سودا منگوانا ہو تو ایک ساتھ آٹھ دس چیزوں کی فرمائش نہ کی جائے۔ اگر ایسا کرنا ناگزیر ہو تو لکھ کر دیا جائے ورنہ یاد نہ رہے گا۔

۳۔ شناخت اور تشخص:

یعنی سامنے آتے یا ذہن میں لاتے ہی سابقہ باتوں یا چیزوں کا یاد آ جانا اور انہیں سابقہ کی حیثیت سے بخوبی پہچان لینا۔ یہ بھی حافظے کا نہایت اہم رکن ہے۔ اگر ہم یاد کی ہوئی چیزوں کو سابقہ کی حیثیت سے شناخت ہی نہ کرسکیں تو بڑی دشواری پیش آئے۔ ہم ان کے ساتھ وہ رویہ اختیار ہی نہ کرسکیں گے جو ہونا چاہیے۔ ایسے مواقع پر انتہائی شرمندگی ہوتی ہے، جب ایک پرانے ملاقاتی سے بہت دنوں کے بعد ملاقات ہونے پر ہم کو اتنا تو یاد رہتا ہے کہ انہیں کہیں دیکھا ہے لیکن نام اور مقام ہم بھول جاتے ہیں اور بخوبی شناخت نہیں کر پاتے۔ وہ تو ہمارے ساتھ سابقہ بے تکلفی برتنا چاہتے ہیں اور بعض چیزوں کا حوالہ دیتے ہیں اور ہم اندھیرے میں رہتے ہیں اور شایان شان خیر مقدم نہیں کر پاتے۔ اس لیے افراد اور اشیاء کی شکلوں کے ساتھ نام اور حیثیت اور باتوں یا

واقعات کے ساتھ ان کا پس منظر بھی یاد ہونا چاہیے تاکہ شناخت میں آسانی ہو۔

بچوں کا سبق رٹ کر سنا دینا لیکن حروف یا الفاظ کو پہچان نہ سکنا جتنا مضر ہوتا ہے، ہم سب جانتے ہیں۔ تحفظ اور تذکر کے ساتھ شناخت کی بھی بخوبی مشق کرانی چاہیے۔

درجے کے طلبہ کا نام یاد رکھنا اور نام لے کر انہیں خطاب کرنا ان سے غیر معمولی لگاؤ اور یگانگت کا ثبوت ہے۔ اس سے طلبہ کو اپنی اہمیت اور تشخص کا احساس ہوتا ہے۔ مدرس کو چاہیے کہ وہ درجے کے ہر بچے کی صرف شکل پہچاننے پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان کا نام بھی یاد رکھے، نام لے کر حکم دینے یا کسی بات سے روکنے کا انگلیوں سے صرف اشارہ کر کے کچھ کہنے کے مقابلے میں زیادہ اثر ہوتا ہے۔ اس طرح کنٹرول میں بھی آسانی ہوتی ہے۔

یاد کرانے کے طریقے اور تدبیریں

یاد کرانے کے مندرجہ ذیل طریقے اور تدبیریں تجربے سے بہت مفید ثابت ہوئی ہیں۔ ان کو اپنانے سے جلد یاد ہو جاتا ہے۔ دیر تک یاد رہتا ہے اور بوقت ضرورت یاد آ جاتا ہے۔

۱۔ ہشاش بشاش اور تازہ دم ہونے پر یاد کرانا چاہیے:

تکان، بیزاری، علالت یا صدمے کی حالت میں کچھ حفظ کرانا صحت کے لیے مضر بھی ہوتا ہے اور کافی وقت اور محنت صرف کرنے کے باوجود خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی، اس لیے ہمیشہ ایسے وقت یاد کرایا جائے جب دماغ تر و تازہ ہو۔

۲۔ اجزاء کے بجائے کل کو یاد کرانا چاہیے:

یعنی پوری چیز کو اجزا میں تقسیم کر کے یاد کرانے کے بجائے پوری ایک ساتھ یاد کرانے کی کوشش کی جائے۔ اگر کوئی چھوٹی سورت چھوٹا رکوع، مختصر دعا، چند اشعار کی نظم یا مختصر عبارت یاد کرنی ہو تو بہتر یہ ہوگا کہ مکمل ایک ساتھ یاد کرائی جائے۔ پوری سورت، رکوع یا نظم کو بار بار پڑھایا جائے۔ جو حصے یاد ہوتے جائیں ان کو بغیر دیکھے ہوئے باقی دیکھ دیکھ کر دہرایا جائے تھوڑی دیر میں

مکمل یاد ہو جائے گی۔ ایک ایک فقرہ یا مصرعہ الگ الگ یاد کرا کے جوڑنے میں روانی بھی نہیں آتی اور وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔

۳۔ کل کو مناسب اجزاء میں تقسیم کر کے یاد کرانا چاہیے:

اگر سورت، نظم، تقریر یا عبارت لمبی ہو تو ایک، دو بار پوری پڑھوا کر مفہوم بخوبی سمجھنے دیا جائے پھر اسے مناسب اجزاء میں تقسیم کر کے اوپر کے طریقے سے یاد کرایا جائے۔ اجزاء ایسے ہوں کہ ہر جز میں ایک پوری بات آجاتی ہو، مثلاً پانچ بند کی کوئی نظم یاد کرانی ہو تو ہر بند کو ایک جز مانا جائے۔ البتہ ہر جز کے آخری لفظ کا، اس کے بعد کے جز کے پہلے لفظ سے ربط قائم کرا دیا جائے تاکہ تسلسل اور روانی برقرار رہے۔

۴۔ وقفوں سے یاد کرانا چاہیے:

ایک ہی نشست میں کل یاد کرانے کے بجائے اگر وقفہ دے کر کئی نشستوں میں یاد کرایا جائے تو بہت مستحکم یاد ہوتا ہے اور مدتوں نہیں بھولتا۔ اس میں وقت بھی کم لگتا ہے کیونکہ ہر نشست میں دماغ تر و تازہ ہوتا ہے اور چستی و مستعدی سے حفظ کرتا ہے نیز وقفہ دینے سے یاد کی ہوئی باتوں کو ذہن میں جڑ پکڑنے کا موقع ملتا ہے اور کچھ وقت گزرنے کے بعد اعادہ کرنے سے تذکر میں بھی آسانی ہوتی ہے۔

۵۔ حفظ کے بعد کچھ دیر خالی رکھنا چاہیے:

ذہن کو مسلسل کام پر لگائے رکھنے سے کئے دھرے پر پانی پھر جاتا ہے۔ اس لیے کچھ یاد کرا لینے کے بعد ذہن کو یاد کی ہوئی چیز کو جمانے کا کچھ موقع دینا چاہیے۔

۶۔ مختلف چیزوں کو باہم مربوط کر کے یاد کرانا چاہیے:

پہلے سے جو چیزیں یاد ہوں ان کے ساتھ جدید کا ربط ملا کر یاد کرانے سے جلد یاد بھی ہو جاتا ہے اور ان کے سہارے حسب ضرورت بآسانی یاد آجاتا ہے۔ غیر مرتب اور بے ربط باتوں کو یاد

کرنا اور یاد رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے، جب کہ مرتب اور مربوط حصے بآسانی یاد ہو جاتے اور بخوبی یاد رہتے ہیں۔ الفاظ کے حروف، اشعار اور جملوں کے الفاظ اور عبارتوں کے جملوں، تاریخ کے واقعات اور سنین وغیرہ میں باہم خاص ربط اور ایک ترتیب ہوتی ہے۔ اس کا لحاظ رکھا جائے تو یاد کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔

۷۔ یاد کیے ہوئے مواد کا اعادہ ہوتے رہنا چاہیے:

یاد ہونے کے بعد کچھ تو ایک ہی دن میں اور بہت سا تین چار دن میں بھول جاتا ہے۔ اس لیے حفظ کرا لینے کے بعد مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے بلکہ تین چار دن تک مسلسل اعادہ کراتے رہنا چاہیے تاکہ اچھی طرح یاد ہو جائے اور بھولنے کا اندیشہ نہ رہے۔

۸۔ یاد کرانے سے پہلے ذہن کو اس کے لیے بخوبی آمادہ کر لینا چاہیے:

جو کچھ یاد کرانا ہو اس کی افادیت واہمیت ذہن نشین کرانے اور دلچسپی پیدا کر دینے کے بعد یاد کرانا چاہیے۔ طبیعت جتنی زیادہ آمادہ ہوگی یاد کرنے میں اتنی ہی زیادہ آسانی ہوگی۔

حافظہ کی قسمیں

حافظہ کی متعدد قسمیں ہوتی ہیں:

☆ فوری حافظہ: یعنی وہ یادداشت جو وقتی طور پر کام دیتی ہے اور کام ختم ہونے کے بعد یاد کی ہوئی باتوں کو ذہن سے محو کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً مکالمہ میں اپنا پارٹ۔ کوئی تقریر جو کسی خاص موقع کے لیے تیار کی گئی ہو۔

☆ دیرپا حافظہ: وہ یادداشت جو مستقل طور پر کام دیتی ہے۔ مثلاً الفاظ کے معنی، پہاڑے، گر، فارمولے، تاریخی واقعات و سنین وغیرہ۔

☆ رٹو حافظہ: جس میں لفظ بہ لفظ رٹ کر حسب ضرورت بعینہٖ دہرا دیا جاتا ہے۔ اس کی

یادداشت میں مفہوم پر توجہ دینا ضروری نہیں ہوتا۔ بچے اکثر بغیر سمجھے بوجھے رٹ لیا کرتے ہیں۔

☆ منطقی حافظہ: جس میں الفاظ کے بجائے مفہوم ذہن نشین کیا جاتا ہے اور حسب ضرورت اپنے الفاظ میں پوری بات دہرادی جاتی ہے۔

☆ تیز حافظہ: یعنی کم وقت میں یاد کر لینے کی صلاحیت۔

☆ سست حافظہ: کافی وقت صرف کرنے کے بعد یاد کرنے پر قادر ہونا۔

☆ مخصوص حافظے: بعض لوگ بصری شبیہات کو بآسانی یاد کر پاتے ہیں۔ بعض سمعی کو۔ جو لوگ بصری حافظے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ جب تک عبارت کو خود پڑھ نہ لیں زبانی سن کر یاد نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگ استحضار کے وقت کتاب کے صفحات اور سطروں کی یا تختہ سیاہ کی پوری تصویر اور اس پر لکھے ہوئے لفظ یا جملے کی شبیہہ ذہن میں لاتے ہیں۔ بعض حافظ، قرآن سناتے وقت ایسا محسوس کرتے ہیں کہ وہ قرآن دیکھ کر پڑھ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ورق الٹتا نظر آتا ہے۔ ایسا حافظہ رکھنے والوں کو شکلیں یاد رکھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ چنانچہ جس سے ایک بار مل لیتے ہیں انہیں، مدتوں بعد بھی بآسانی پہچان لیتے ہیں۔ اس کے برعکس سمعی حافظہ رکھنے والے سن کر بآسانی یاد کر لیتے ہیں۔ اور بعینہٖ دہرا دیتے ہیں۔ ایسے لوگ قرأت، اشعار، راگ، گیت کی نقل بآسانی اتار سکتے ہیں۔

☆ بے ربط حافظہ: چھوٹے بچوں کے حافظے میں کوئی ربط نہیں ہوتا۔ وہ متعدد بے ربط الفاظ اور جملے وغیرہ یاد کر لیتے ہیں۔ ابتداء میں وہ کئی سال تک اسی بے ربط حافظے سے کام چلاتے ہیں۔ اس کے بعد تجربے اور غور و فکر میں اضافے کے ساتھ ان بے ربط باتوں میں ربط و تعلق ملانا سیکھتے ہیں۔

قابل لحاظ امور:

☆ بچوں کو اسی وقت حفظ پر لگایا جائے جب وہ ہشاش بشاش اور تازہ دم ہوں۔

☆ جو کچھ یاد کرانا ہو اس میں دلچسپی پیدا کرائی جائے۔ اس کا مطلب ومفہوم اور اس کی اہمیت وافادیت بخوبی سمجھا کر حفظ کے لیے زوردار تحریک کی جائے۔ اس کے متعلق کسی شک وتذبذب کا شکار ہونے سے بچایا جائے۔

☆ بچوں میں خود اعتمادی پیدا کرائی جائے اور اس بات کا یقین پیدا کرایا جائے کہ وہ بآسانی یاد کر سکتے ہیں۔

☆ یاد کرنے کے لیے مواد کو بار بار پڑھنے کا موقع دیا جائے جتنی بار اعادہ ہوگا اتنا ہی زیادہ پختہ یاد ہوگا۔

☆ مناسب ہو اگر کچھ دیر یاد کرنے کے بعد بغیر دیکھے بچے ایک دوسرے کو سنانے کی کوشش کیا کریں اور اس طرح آپس میں سن سنا کر پورا یاد کریں۔

☆ یاد کیے ہوئے مواد کا وقتاً فوقتاً دور کرایا جاتا رہے تاکہ ذہن سے محو نہ ہونے پائے۔

☆ ایک ہی نشست میں پختہ یاد کرا دینے کے بجائے وقفے دے کر کئی نشستوں میں یاد کرایا جائے اس طرح یاد کیا ہوا زیادہ مستحکم ہوتا ہے۔

☆ جدید مواد مربوط اور مرتب شکل میں پیش کیا جائے اور سابقہ معلومات سے اس کا گہرا ربط واضح کیا جائے۔

☆ زیادہ سے زیادہ حواس سے کام لینے کا موقع دیا جائے، یعنی جو کچھ یاد کرانا ہو اسے اچھے انداز سے زبانی سنا دیا جائے۔ تختہ سیاہ پر لکھ کر یا کاپی کتاب کے صفحات سے دکھا دیا جائے اور اگر ممکن ہو تو طلبہ سے کاپیوں پر نقل بھی کرا دیا جائے۔ جتنے زیادہ حواس سے کام لینے کا موقع ملے گا اتنا ہی پختہ یاد ہوگا۔

☆ تھوڑی تھوڑی دیر یاد کرنے کے بعد بغیر دیکھے زبانی ادا کر کے اس بات کا اندازہ لگالیا کریں کہ کتنا حصہ یاد ہو گیا اور کتنی کسر ہے، جتنا ٹھیک یاد نہ ہو اس پر مزید توجہ صرف کریں۔

☆ بچپن میں قوت حافظہ سے خوب کام لیا جائے اور بہت سی ضروری چیزیں (کلام پاک، دعائیں، اذکار، اشعار، ضرب الامثال، اقوال وغیرہ) بخوبی یاد کرادی جائیں۔ اگر سات آٹھ سال کے بچے کو شفقت، محبت اور سلیقے سے حفظ کرایا جائے اور ساتھ ہی روزانہ تھوڑا سا وقت دے کر مادری زبان لکھنے پڑھنے اور معمولی حساب کرنے کی مشق بہم پہنچائی جائے تو وہ دس گیارہ برس کی عمر میں حافظ قرآن بھی ہو سکتا ہے اور ان بچوں کے ساتھ آئندہ بآسانی چل سکتا ہے۔ جو شروع سے تمام مضامین لے کر چل رہے تھے اور حفظ کی سعادت سے محروم رہ گئے ہیں۔

☆☆☆

باب ۲۵:

تدریس

(پڑھائی لکھائی)

تدریس کیا ہے؟

تدریس کے معنی درس دینا، بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا یا مختلف علوم وفنون میں مہارت پیدا کرانا۔تدریس کے ذریعے معلم ایک تدریج سے، بچوں کو طرح طرح کی معلومات فراہم کرتا ہے۔ انہیں مختلف باتیں جاننے، سیکھنے یا کرنے کا موقع دیتا ہے اور مستقبل کی زندگی کے لیے انہیں تیار کرتا ہے۔

تدریس کا کام اس وقت انجام پاتا ہے جب

۱۔ کوئی سیکھنے والا ہو (بچہ)

۲۔ کوئی سکھانے والا ہو (معلم)

۳۔ کوئی چیز ہو جو سکھائی جائے (مضامین کا مواد)

تدریس کے ذریعے معلم، بچے اور مضامین کے مواد میں ربط قائم رہتا ہے۔کار تدریس اور دوسرے پیشوں میں بڑا فرق ہے۔ سنار، بڑھئی، لوہار وغیرہ کو اپنے پیشے کے سلسلے میں ایسی چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے جو بے جان ہوتی ہیں۔ جن کا اپنا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ یہ خام اشیاء پورے طور پر ان کے تصرف میں ہوتی ہیں۔ وہ اپنی فنی مہارت کا جس طرح چاہیں مظاہرہ کریں، یہ اشیاء کوئی مزاحمت نہیں کرسکتیں۔ چنانچہ وہ کھٹ کھٹ کئے جائیں تو کچھ نہ کچھ بن ہی جاتا ہے لیکن معلم کو ایک ایسی زندہ جاوید ہستی (بچے) سے سابقہ پیش آتا ہے جو صاحب ارادہ ہوتی ہے، جس کی اپنی

خواہشات اور دلچسپیاں ہوتی ہیں۔ اگر اس کی آمادگی اور دل چسپی یا اس کا ارادہ توجہ اور خواہش شامل حال نہ ہو یا اس کی عمر فہم اور سابقہ معلومات کا لحاظ نہ کیا جائے تو معلم کی لاکھ کوششوں کا نتیجہ لا حاصل ہوگا وہ گھنٹوں سر مارتا رہے کوئی کامیابی نہ ہوگی۔

بنا بریں، ایک اچھے معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ بچے، مضامین کے مواد اور طریق تدریس تینوں سے بخوبی واقف ہو اور ان صفات کا حامل ہو جو بچوں سے بحسن وخوبی نمٹنے، اور ان کو فیض پہنچانے کے لیے درکار ہیں۔

☆ بچے کے بارے میں وہ جانتا ہو کہ اس کی فطرت کیا ہے۔ نشو ونما کے مختلف مراحل کیا ہیں۔ ہر مرحلے کی نفسی خصوصیات کیا ہوتی ہیں۔ اس کی خواہشات، میلانات اور دلچسپیاں کیا ہیں۔ وہ کس طرح متوجہ ہوتا، دلچسپی لیتا، حفظ کرتا یا کسی چیز کا عادی بنتا ہے۔ وہ کس تدریس سے آگے بڑھتا اور کس طرح نئی باتیں سیکھتا ہے۔ اس کے کام کرنے کا انداز کیا ہوتا ہے۔ کس قسم کی حرکات میں اسے مزہ آتا ہے۔ بڑوں سے کن باتوں میں وہ مختلف ہوتا ہے وغیرہ۔

☆ اسے اپنے مضمون سے لگاؤ اور مواد مضمون سے بخوبی واقف ہونا چاہیے۔ اپنی معلومات میں برابر اضافے کی کوشش کرنی چاہیے۔

☆ اسے جاننا چاہیے کہ بچوں کو کیا کچھ پڑھایا جائے، کس ترتیب سے مواد پیش کیا جائے اور سکھانے پڑھانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔

ان باتوں سے واقف ہوئے بغیر تدریس نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی۔

کامیاب تدریس کی خصوصیات:

وہی تدریس کامیاب کہلاتی ہے۔

☆ جو طلبہ میں علم وفن کے اکتساب کی پیاس اور طلب پیدا کرے۔

- ☆ جس کے لیے پہلے ہی سے بخوبی تیاری کر لی جاتی ہو اور درس مرتب اور پیشگی تیار خاکے کے مطابق دیا جاتا ہو۔
- ☆ جس کے دوران درجے میں شفقت اور ہمدردی کی فضا طاری رہتی ہو اور ڈانٹ پھٹکار یا مار پیٹ کی نوبت کم آتی ہو۔
- ☆ جو اساتذہ اور طلبہ میں تعاون کی اسپرٹ پیدا کرے اور طلبہ کی دلچسپی اور توجہ کو مرکوز رکھ سکے۔
- ☆ جس میں نئی باتیں، سابقہ معلومات اور روزمرہ کی زندگی سے مربوط کر کے یا اس سے موازنہ ومقابلہ کر کے بتائی جاتی ہوں۔
- ☆ جس میں اجتماعی وانفرادی مشکلات کو رفع کرنے کی طرف پوری توجہ دی جاتی ہو۔
- ☆ جو طلبہ میں اپج، آزادی فکر ورائے، خود اعتمادی اور اپنے علم پر یقین اور بھروسہ پیدا کرے۔
- ☆ جو علم کو عمل میں لانے اور سیکھے ہوئے کو برتنے کا سلیقہ سکھائے اور تجربے کے لیے اس کے مواقع فراہم کرے۔

............☆☆☆...........

باب ۲۶:

طریقہ تعلیم

(قرآن حکیم کی روشنی میں)

فن تعلیم وتربیت پر اسوۂ حسنہ کی روشنی میں اختصار سے ہم پہلے ہی غور کر چکے ہیں۔ اب ہمیں سرسری طور پر یہ دیکھ لینا چاہیے کہ قرآن حکیم سے طریقہ تعلیم پر کیا روشنی پڑتی ہے۔

ا۔ طلبہ کی طلب اور آمادگی:

قرآن حکیم کھولتے ہی جو بات نمایاں طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ تعلیم وتلقین سے استفادے کے لیے طالب میں طلب صادق ضروری ہے۔ جب تک وہ خود خواہش مند نہ ہو اور اس کا دل ودماغ پورے طور پر اور یکسوئی کے ساتھ آمادہ نہ ہو، تعلیم وتلقین ہرگز نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی خواہ جو کچھ بتایا اور سکھایا جا رہا ہو وہ خود اس کے حق میں کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو اور خواہ اس کا سکھانے اور بتانے والا کتنی ہی بڑی اور موثر شخصیت کا مالک ہی کیوں نہ ہو۔ سورۂ فاتحہ میں طالب کی طرف سے:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (فاتحہ:۵)

''ہمیں سیدھا راستہ دکھا......''

کی پرخلوص دعا کا تقاضہ اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔ معلم کو چاہیے کہ سب سے پہلے طلبہ میں علم کی پیاس اور طلب صادق پیدا کرے۔ ان کو علم حاصل کرنے پر آمادہ کرے۔ اس کے بغیر اس کی ساری کوششیں غیر موثر ہوں گی اس غرض سے معلم کو چاہیے کہ وہ پوری دل سوزی سے طلبہ کو عالم وجاہل کا فرق، اہل علم پر اللہ تعالی کے خصوصی فضل اور علم کی ضرورت واہمیت، دل کش انداز میں

دلائل کے ساتھ اور واقعات کا حوالہ دے کر برابر سمجھاتا رہے تاکہ علم کی طرف ان کی رغبت ہو نیز حصولِ علم کے لیے انہیں مختلف طریقوں سے آمادہ کرتا رہے۔

خود قرآن حکیم نے مندرجہ ذیل آیات کے ذریعے علم کے حصول کی ترغیب دی ہے۔

☆ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ. (الزمر:۹)

''کہیں عالم و جاہل برابر ہوتے ہیں۔''

☆ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِىَ خَيْرًا كَثِيْرًا. (البقرہ:۲۶۹)

''جسے حکمت عطا کی گئی اسے دراصل خیر کثیر (بہت بڑی دولت) عطا کی گئی۔''

☆ يَرْفَعُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ. (المجادلہ:۱۱)

''اللہ تم میں ایمان والوں کے اور ان لوگوں کے جن کو علم عطا ہوا ہے درجے بلند کرے گا۔''

☆ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا. (فاطر:۲۸)

☆ اللہ سے وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔''

۲۔ معلم کے علم پر بھروسہ:

استفادہ کے لیے دوسری ناگزیر شرط معلم کے علم پر غیر معمولی اعتماد ہے۔ معلم کا کام ہی یہ ہے کہ طلبہ کو وہ چیزیں بتائے جو وہ نہیں جانتے۔ اب اگر معلم کی نااہلی یا اپنی کسی کوتاہی کے سبب طلبہ کا اعتماد متزلزل ہو جائے اور انہیں یقین ہی نہ ہو کہ معلم جو کچھ بتا رہا ہے وہ ٹھیک ہے اور اسی میں ان کی فلاح ہے تو وہ اس کی تعلیم و تلقین سے کیونکر مستفید ہو سکتے ہیں۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ. (البقرہ:۲،۳)

''ہدایت ہے ان پرہیزگار لوگوں کے لیے، جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔''

(یعنی محض قرآن حکیم کے بتانے سے ان حقیقتوں پر یقین کر لیتے اور ایمان لے آتے ہیں جو انسان کے حواس سے پوشیدہ ہیں اور کبھی براہِ راست عام انسانوں کے تجربہ و مشاہدہ میں نہیں آتیں۔ مثلاً خدا کی ذات و صفات، ملائکہ، وحی، جنت دوزخ وغیرہ)

اس آیت سے مندرجہ بالا شرط مستنبط ہوتی ہے۔اس لیے معلم کو چاہیے کہ وہ طلبہ کا اعتماد بحال رکھے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ علمی اعتبار سے ضروری صفات کا حامل ہو۔خوب پڑھا لکھا اور قابل ہو۔

۳۔ اللہ ہی کو علم کا منبع ومصدر سمجھنا:

کسی فرد کا علم خود اس کے یا سماج اور انسانیت کے حق میں اسی وقت نفع بخش ثابت ہوسکتا ہے جب اللہ کے نام سے شروع کیا جائے اس کی ذات وصفات کو مستحضر رکھ کر اور اس کی پناہ میں آ کر حاصل کیا جائے۔اسی کو علم کا سرچشمہ مانا جائے۔اور یہ یقین کیا جائے کہ علم صرف اسی کے پاس ہے اور علم کا جو حصہ بھی کسی کو ملتا ہے،وہ اسی کا فیض ہوتا ہے۔اسی صورت میں وہ فرد علمی پندار میں مبتلا ہونے،علم کو غلط راستوں سے حاصل اور غلط مقاصد پر استعمال کرنے اور علم کی راہ میں شیطان کے حائل ہونے سے محفوظ رہ سکے گا اور علم میں اضافے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے گا۔ان حقائق پر مندرجہ ذیل آیات دلالت کرتی ہیں:

إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ. (الحجرات:۱۳)

''بے شک خدا سب کچھ جاننے والا خبر رکھنے والا ہے۔''

وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ. (النور:۱۸)

''اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔''

وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ. (النور:۳۰)

''اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔''

وَسِعَ رَبِّي كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا. (الانعام ۸۱)

''میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔''

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ. (العلق:۱)

''اپنے رب کا نام لے کر پڑھ جس نے (سب کو) پیدا کیا۔''

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. (النحل:۹۸)

''پھر جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے پناہ مانگ لیا کرو۔''

وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ. (الاعراف:۲۰۰،حم السجدۃ:۳۶)

''اگر کبھی شیطان تمہیں اکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو۔''

معلم کو چاہیے کہ طلبہ کے ذہن میں یہ بات بخوبی بٹھادے کہ علم کا منبع وسرچشمہ ذات باری تعالیٰ ہے،اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔علم کا جو حصہ بھی کسی کو ملتا ہے اللہ تعالیٰ ہی کا فیض ہوتا ہے۔

پڑھنا لکھنا شروع کرتے وقت معلم کو چاہیے کہ خود بھی

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

پڑھ لیا کرے اور طلبہ سے بھی کہلوالیا کرے۔خود بھی یہ دعا مانگتا رہے۔

رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا. (طٰہٰ:۱۱۴)

''اے میرے رب میرے علم میں اضافہ کر۔''

اور طلبہ کو بھی اس کی تلقین کرتا رہے۔اس صورت میں خود وہ اور اس کے طلبہ علمی پندار میں مبتلا ہونے،علم کو ناجائز طریقے سے حاصل کرنے اور ناجائز مقاصد پر استعمال کرنے نیز علم کی راہ میں شیطان کی دراندازی سے محفوظ رہ سکیں گے۔

۴۔ کچھ بتانے سے پہلے بخوبی متوجہ کر لینا:

بات اسی وقت دل لگا کر سنی جاتی اور اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جاتا ہے جب ذہن اس کی طرف بخوبی متوجہ اور اس کے لیے متجسس ہو۔قرآن حکیم تجسس کو بیدار کرنے اور فرد کو ہمہ تن متوجہ کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے۔چند یہ ہیں:

☆ حروف مقطعات سے کلام شروع کرتا ہے۔

الٓمٓ، الٓرٰ، كٓهٰيٰعٓصٓ، طٰهٰ، حٰمٓ وغیرہ۔

☆ کوئی سوال کرتا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ.
(الصف:۱۰)

''اے ایمان والو، کیا میں تم کو ایسی تجارت بتا دوں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دے دے۔''

هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا. (الکہف:۱۰۳)

''کیا ہم تمہیں ان کی خبر دیں جو اعمال کے لحاظ سے بڑے گھاٹے میں ہیں۔''

☆ کوئی منظر پیش کرتا ہے:

إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا. وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا. وَقَالَ الْإِنْسَانُ مَالَهَا.
(زلزال:۱تا۳)

''جب زمین بھونچال سے ہلا دی جائے گی اور زمین اپنے اندر کا بوجھ نکال پھینکے گی اور انسان حیرت سے کہے گا اس کو کیا ہو گیا ہے۔''

إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ o وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ o وَإِذَا الْقُبُورُ بُعْثِرَتْ. (انفطار:۱تا۴)

''جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب تارے جھڑ پڑیں گے اور جب دریا بہہ کر ایک دوسرے میں مل جائیں گے اور جب قبریں اکھیڑ دی جائیں گی۔''

أُولَئِكَ الْمُقَرَّبُونَ o فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ ...... لِأَصْحَابِ الْيَمِينِ. (۵۶:۱۱تا۳۸)

''اور سورۃ رحمٰن میں بڑی وضاحت سے منظر کشی کی گئی ہے۔''

☆ دوسروں کے سوالات یا اعتراضات کو سامنے رکھ کر ان کے جوابات کی طرف ذہنوں کو متوجہ کرتا ہے۔

سَأَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ. (معارج:۱)

''ایک طلب کرنے والے نے عذاب طلب کیا جو نازل ہو کر رہے گا۔''

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ...... (وہ تم سے پوچھتے ہیں) سے پندرہ مقامات پر خطاب شروع ہوتا ہے۔

وَقَالُوْٓا ءَ اِذَا کُنَّا عِظَاماً وَّرُفَاتاً ءَ اِنَّ لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقاً جَدِیْداً (بنی اسرائیل:۹۸)

''اور کہا'' کیا جب ہم ہڈیاں اور خاک ہو کر رہ جائیں گے تو نئے سرے سے ہم کو پیدا کر کے اٹھا کھڑا کیا جائے گا۔''

قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلاً. (بنی اسرائیل:۹۴)

''وہ کہنے لگے۔'' کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا؟''

☆ وہ اچانک کسی واقعے کی خبر دے کر یا پیشین گوئی کر کے لوگوں کو بات سننے پر آمادہ کرتا ہے:

الٓمّٓ ○ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ○ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ○ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ○ (الروم:۱تا۴)

''ا۔ل۔م اہل روم مغلوب ہو گئے: نزدیک کے ملک میں اور وہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب آ جائیں گے چند ہی سال میں۔''

ان آیات میں رومیوں کے غلبے کی اس وقت پیشین گوئی کی گئی جب ایرانی انہیں مغلوب کر چکے تھے اور ان کا غلبہ بظاہر محال نظر آ رہا تھا۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحاً مُّبِیْناً. (الفتح:۱)

''ہم نے تم کو فتح دی، فتح بھی صریح وصاف۔''

اس آیت میں فتح مکہ کی اس وقت پیشین گوئی کی گئی تھی جب حدیبیہ کے مقام پر بظاہر دب کر مسلمانوں نے کفار سے صلح کی تھی۔

☆ بہت زیادہ چوکنا کرنے یا چونکا دینے کے لیے خطاب کرنا ہوتا ہے تو بسا اوقات مندرجہ بالا طریقوں میں سے بیک وقت کئی ایک کو استعمال کرتا ہے، مثلاً:

اَلْقَارِعَةُ ○ مَا الْقَارِعَةُ ○ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْقَارِعَةُ ○ یَوْمَ یَکُوْنُ النَّاسُ کَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ ○ وَتَکُوْنُ الْجِبَالُ کَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ ○ (القارعۃ:۱۔۵)

"کھڑکھڑانے والی، کھڑکھڑانے والی کیا ہے، اور تم کیا جانو کہ کھڑکھڑانے والی کیا ہے۔ وہ قیامت ہے جس دن لوگ ایسے ہوں گے جیسے بکھرے ہوئے پتنگے، اور پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے دھنکی ہوئی رنگ برنگ کی اون۔"

ان آیات میں خبر سوال، منظر سب ایک ساتھ پیش کر کے ذہنوں کو متوجہ کیا گیا ہے۔

معلم کو بھی موقع محل کی مناسبت سے مختلف طریقوں کو اختیار کر کے درس سے پہلے طلبہ کو ہمہ تن متوجہ کر لینا چاہیے۔ پھر انہیں کوئی بات بتانی چاہیے۔

۵۔ پیش کش:

طلب صادق پیدا کر دینے اور اپنی طرف ہمہ تن متوجہ کر لینے کے بعد قرآن حکیم اپنی بات پیش کرتا ہے۔ پیش کش کے لیے وہ خطابت کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور بلاشبہ ہے بھی یہی سب سے زیادہ موثر طریقہ، پورا کلام پاک مختلف چھوٹے بڑے خطبوں کی شکل میں نازل ہوتا رہا اور حضور ﷺ خطبات ہی کی شکل میں انہیں دوسروں کے سامنے پیش فرماتے رہے۔ قرآن حکیم کی خطابت میں زور بیان کی اتنی شدت اور انداز کلام اتنا شاہانہ ہے کہ سننے والا مسحور ہو جاتا ہے۔ کوئی بد بخت ہی ہوگا جس کے کانوں تک یہ آواز پہنچے اور وہ متاثر نہ ہو۔ جیسا کٹر دشمن اسلام اس کی چند آیات سنتے ہی ہتھیار ڈال دیتا اور چوکڑی بھول جاتا ہے۔ اس کا ایک ٹکڑا حضرت عمرؓ جیسے زبردست مخالف کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیتا ہے، کہاں تک گنایا جائے۔ قرآن حکیم اپنی پاکیزہ ہدایات، فصیح و بلیغ زبان، شاہانہ طرز تخاطب، غیر معمولی اثر آفرینی، موثر لہجہ و آہنگ اور زور بیان کے ذریعے بہر حال ہر ایک سے اپنا لوہا منوا ہی لیتا ہے۔ قرآن حکیم تو خیر کلام الٰہی ہے، اس کی تاثیر کا کیا کہنا۔ جو لوگ اپنے طرز تخاطب یا انداز بیان میں اس کی ہلکی سی جھلک پیدا کر لیتے ہیں وہ بھی کتنوں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیتے ہیں۔ مولانا روم اپنی مثنوی، علامہ اقبال اپنی چند نظموں، اخوان الصفا اپنے بعض رسالوں، مولانا آزاد اور مولانا مودودی وغیرہ اپنے بعض خطبات

ومقالات میں قرآن حکیم کی مدد سے اس کے زور بیان کی خفیف سی جھلک پیدا کر سکے ہیں۔ اس پہ حال یہ ہے کہ پڑھنے والا بہر حال جھوم جاتا اور ایک عجیب وغریب عالم میں پہنچ جاتا ہے۔

استاد کو بھی اپنے بیان میں زور پیدا کرنا چاہیے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کو اپنے علم پر یقین واعتماد ہو۔ اس کے پاس پیش کرنے کے لیے واقعی کوئی پیغام ہو۔ اور بات دل کی گہرائیوں سے نکلے۔

۶۔ توضیح وتشریح:

قرآن حکیم صرف زور بیان پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اپنی بات بخوبی واضح اور ذہن نشین کرنے کے لیے:

- ☆ آفاق والنفس سے شواہد پیش کرتا ہے۔
- ☆ گردو پیش کے حوالے دیتا ہے۔
- ☆ روزمرہ کے تجربات ومشاہدات کو بطور دلیل سامنے لاتا ہے۔
- ☆ طرح طرح کی مثالیں دیتا اور تمثیلات سے کام لیتا ہے۔
- ☆ معروف تاریخی واقعات اور اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات سے ثبوت بہم پہنچاتا ہے۔
- ☆ متعدد واقعات بیان کر کے مطلوبہ نتائج اخذ کراتا ہے۔
- ☆ انبیاء اور اقوام وملل کے قصے کہانیوں سے مدد لیتا ہے۔
- ☆ ایک ہی حقیقت کو طرح طرح سے بیان کرتا ہے تاکہ ہر استعداد وصلاحیت کے لوگ بآسانی سمجھ سکیں۔
- ☆ الفاظ میں اتنی واضح منظر کشی کرتا ہے گویا سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔
- ☆ لوگوں کی الجھنوں اور شکوک وشبہات کو دلائل سے رفع کرتا ہے۔

معلم کو بھی توضیح وتشریح کے ضمن میں حسب ضرورت وموقع ان تدابیر سے کام لینے کی کوشش

کرنی چاہیے۔

۷۔ سوالات:

☆ توجہ کو مرکوز رکھنے اور غور وفکر کی دعوت دینے کے لیے بیچ بیچ میں سوالات کرتا جاتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِعَادٍ (الفجر:۶)

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے عاد کے ساتھ کیا کیا۔''

اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ o وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ۔

(الغاشیہ:۱۷تا۱۸)

''کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے عجیب پیدا کیے گئے ہیں اور آسمان کی طرف کہ کیسا بلند کیا گیا ہے؟''

وَمَا تِلْکَ بِیَمِیْنِکَ یٰمُوْسٰی o (طٰہٰ:۱۷)

''اور اے موسیٰ! یہ تمہارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے۔''

☆ سوالات کے جواب سنتا اور اگر واضح ہوتے ہیں تو ان کی طرف سے خود ہی جواب دے کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

قَالَ هِیَ عَصَایَ اَتَوَکَّؤُا عَلَیْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰی غَنَمِیْ وَلِیَ فِیْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی (طٰہٰ:۱۸)

''اس نے جواب دیا، یہ میری لاٹھی ہے، اس پر میں سہارا لیتا ہوں۔ اس سے میں اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے لیے اور بھی کئی فائدے ہیں۔''

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَیَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔ (الزمر:۲۵، لقمان:۳۸)

''اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے، تو وہ بول اٹھیں گے کہ خدا نے۔''

معلم کو بھی چاہیے کہ دوران سبق طلبہ سے سوالات کرے اور ان کو بھی سوالات کرنے کا

موقع دے۔ طلبہ کی طرف سے جو سوالات، اعتراضات یا شکوک و شبہات ابھریں ان کا تشفی بخش جواب دے۔ طلبہ کے جوابات اطمینان سے سنے اور انہیں دل کی بات کہنے کا موقع دے تا کہ کھل کر ان کا ذہن سامنے آ سکے۔

۸۔ خلاصہ:

قرآن حکیم تھوڑی دیر کے بعد چند الفاظ میں خلاصہ بیان پیش کر دیا کرتا ہے۔ ابتدائی خطبات، سورتوں، رکوعوں میں جو باتیں خوب پھیلا کر وضاحت سے بیان کی ہیں، آخری سورتوں میں وہی باتیں نہایت اختصار سے چند الفاظ میں بیان کر دی ہیں یا صرف اشاروں، کنایوں میں پوری بات کہہ دی ہے تا کہ بآسانی یاد ہو جائے اور ہمیشہ یاد رہے۔

پارہ عم کی ذرا آخری سورتوں پر غور کیجئے۔ کوزوں میں سمندر بند ہیں۔ مثلاً:

وَالْعَصْرِ o اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ o اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ o (العصر)

''عصر کی قسم (زمانہ گواہ ہے) بے شک انسان خسارے میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق (بات) کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔''

اس مختصر سورۃ میں تو قرآن حکیم نے اپنا پورا خلاصہ سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ معلم کو بھی چاہیے کہ سبق کا ایک ایک جز پیش کر کے اس کا خلاصہ بھی بیان کرتا جائے اور آخر میں اپنے پورے بیان کا نہایت اختصار سے خلاصہ پیش کر دیا کرے۔ اس طرح طلبہ کو پوری بات یاد کرنے اور یاد رکھنے میں سہولت ہوتی ہے۔

۹۔ اعادہ و تکرار:

قرآن حکیم نے اعادہ و تکرار کا بڑا التزام کیا ہے۔ ایک ہی بات کو بار بار مختلف انداز سے سامنے لاتا ہے تا کہ بخوبی ذہن نشین ہو جائے۔ شاید ہی کوئی ایسا صفحہ ہو جس پر اس نے اپنی بنیادی

دعوت یا اس کے کسی جز کا اعادہ نہ کیا ہو لیکن تکرار میں بھی انداز ایسا اختیار کیا ہے کہ وہی بات ہر بار نیا لطف دے جاتی ہے۔

معلم کو بھی اعادے اور تکرار کی طرف پوری توجہ دینی چاہیے، لیکن انداز ایسا اختیار کرنا چاہیے کہ بیزاری اور اکتاہٹ نہ پیدا ہونے پائے۔

۱۰۔ تفویض:

اپنی بات کو وضاحت سے سمجھا دینے، دلائل سے مطمئن کر دینے اور زور بیان سے منوا لینے ہی پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ کچھ سوالات دے کر اپنے طور پر غور وفکر کر کے مطمئن ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ نیز اطمینان قلب حاصل کرنے کے لیے تجربے ومشاہدے کے لیے کام تفویض کرتا ہے۔ نیز جاننے والوں سے بھی پوچھ کر اطمینان کر لینے کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ...... (ذرا زمین میں چل پھر کر دیکھو) قرآن حکیم میں چھ مقامات پر کہہ کر اور اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ...... اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ (کیا انہوں نے زمین کی سیر نہیں کی) سات مقامات پر کہہ کر خود مشاہدہ کر کے اطمینان حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

اسی طرح سل، فسئل، وسئل، فسئلوا (پوچھ لو) نو مقامات پر کہہ کر جاننے والوں سے تصدیق کر کے اطمینان حاصل کرنے کی طرف قرآن حکیم نے توجہ دلائی ہے۔

معلم کو بھی چاہیے کہ جو کچھ طلبہ کو بتائے اس سے متعلق کوئی کام تفویض کر کے تجربہ ومشاہدہ کا مزید موقع دے تاکہ انہیں پورا اطمینان بھی ہو جائے اور وہ اپنے علم کو عمل میں لانا اور برتنا سیکھیں۔

یہ ہے قرآن حکیم کے حکیمانہ طریقہ تعلیم کا سرسری خاکہ۔ اس طرح اس نے اپنی تعلیمات کو لوگوں کے لیے بے حد آسان بنا دیا ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ (القمر: ۱۷، ۲۲، ۳۲)

''اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے، تو کوئی ہے کہ سوچے سمجھے۔''

باب ۲۷:

تدریس کے عام اصول

ذیل میں تدریس کے کچھ عام اصول دیئے جا رہے ہیں۔ یہ طویل تدریسی تجربات اور بچوں کی نفسیات کی روشنی میں مرتب کیے گئے ہیں۔ سارے مضامین اور ہر طرح کے اسباق میں انہیں حتی الامکان ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ تدریس مفید اور موثر ہو سکے۔

ا۔ آمادگی کا اصول:

یعنی طلبہ کو بخوبی آمادہ کر کے سبق شروع کیا جائے۔ کیونکہ جس کام کے لیے طبیعت پورے طور پر آمادہ ہوتی ہے وہ مستعدی اور انہماک سے کیا جاتا ہے، اور جو کام کسی طرح کے دباؤ یا جبر کے تحت انجام پاتا ہے، وہ بے گار سمجھ کر ٹال دیا جاتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ بچے توجہ اور انہماک سے گھبراتے ہیں۔ کسی طرح کا جبر اور دباؤ پسند نہیں کرتے۔ لکھنے پڑھنے جیسے خشک کام سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ چنانچہ انہیں لکھنے پڑھنے پر آمادہ کرنے کے لیے اساتذہ عموماً ڈراتے، دھمکاتے اور جبر و تشدد سے کام لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر بچے اس خشک کام سے اور زیادہ گھبرانے اور تعلیم سے بھاگنے لگتے ہیں اور جو مارے بندھے رہ جاتے ہیں وہ کام میں پوری دلچسپی نہیں لیتے۔ اس لیے پڑھانے سے پہلے بچوں کو اس کے لیے بخوبی آمادہ کر لینا نہایت ضروری ہے، اس کے لیے حسب موقع مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں۔

☆ موزوں سوالات، مختصر گفتگو، خوش رنگ تصاویر، جاذب توجہ ماڈلوں وغیرہ کے ذریعے نئی معلومات کے لیے بچوں کا تجسس بیدار کر دیا جائے۔

☆ پھر سبق کی غرض وغایت اور جو کچھ پڑھنے جا رہے ہیں اس کی ضرورت وافادیت بخوبی

ذہن نشین کرا دی جائے۔

☆ کام میں کھیل یا مسابقت کی اسپرٹ پیدا کر دی جائے یا تدریسی مواد کو کہانی کی شکل میں پیش کیا جائے۔

☆ بچوں کو کچھ بنانے یا عملی کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

☆ سبق کو آگے بڑھانے میں ان کی امداد اور مشوروں کو اہمیت دی جائے۔

آمادگی کے بعد توجہ اور دلچسپی کا مسئلہ بھی بہت کچھ حل ہو جائے گا کیونکہ جس کام کو کرنے کے لیے بچے بخوشی آمادہ ہو جائیں گے اس پر پوری توجہ بھی صرف کریں گے اور بعد میں خواہ دشواریاں بھی پیش آئیں پورے انہماک اور دلچسپی سے کام کریں گے۔

۲۔ انتخاب کا اصول:

یعنی بچوں کو صرف وہی کچھ پڑھایا اور سکھایا جائے جو ان کے لیے نہایت ضروری، مفید، مناسب اور ان کی فطرت وصلاحیت اور مقصد کے عین مطابق ہو اور جسے معلم اپنے محدود وسائل و ذرائع سے بخوبی انجام دے سکتا ہو۔

ہم سب جانتے ہیں کہ علم ایک بے پایاں بحر ذخار ہے جب کہ مدت تعلیم انتہائی قلیل اور مہلت زندگی نہایت محدود۔ زندگی بھر غوطے لگائیے۔ پایاب ساحل سے آگے بڑھ نہیں سکتے اور چند سنگ ریزوں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آ سکتا اور بہت سی باتیں تو بچوں کے لیے یوں بھی قبل از وقت ہوتی ہیں۔ اس لیے معلم کو چاہیے کہ نہایت احتیاط سے انتخاب کرے اور اسی کے حصول پر بچوں کا وقت صرف کرائے جو واقعی ضروری اور نفع بخش ہو۔ فضول اور لایعنی میں وقت ضائع نہ ہونے دے۔ الا یہ کہ سبق کو دلچسپ اور موثر بنانے کے لیے ایسا کرنا ناگزیر ہو۔

۳۔ زندگی سے مربوط کرنے کا اصول:

یعنی جدید معلومات حتی الامکان بچوں کی روزمرہ کی زندگی کے واقعات، ان کی سابقہ

معلومات، ان کے تجربات ومشاہدات اور سماجی وفطری ماحول سے مربوط کر کے فراہم کی جائیں۔ اس طرح بات بآسانی سمجھ میں آجائے گی اور بخوبی ذہن نشین ہو جائے گی۔ ساتھ ہی بچوں پر جدید معلومات کی ضرورت وافادیت واضح کرنے اور روزمرہ کی زندگی میں اس کے استعمال کا سلیقہ سکھانے میں بھی مدد ملے گی۔ جس چیز کا زندگی سے کوئی ربط محسوس نہ ہو یا اس کی ضرورت وافادیت نظر نہ آئے اسے سیکھنے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی اور نہ زیادہ دیر تک وہ ذہن میں محفوظ رہتی ہے مثلاً طہارت وغیرہ کے وہ مسائل جن کی ضرورت بلوغ کے بعد ہوتی ہے، اول تو قبل از وقت ہونے کی وجہ سے چھوٹے بچوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ دوسرے ضرورت پیش نہ آنے کی وجہ سے زیادہ دنوں تک یاد بھی نہیں رہ سکتے۔

۴۔ خود کر کے سیکھنے کا اصول:

یعنی ساری باتیں خود بتا دینے کے بجائے، بچوں کو خود کر کے سیکھنے کے بیش از بیش مواقع دیئے جائیں، جن اسباق میں کر کے سیکھنے کے امکانات نہ ہوں، ان کو بھی کم از کم کسی عملی کام پر ختم کیا جائے۔ مثلاً زبانی بتا چکنے پر اس سے متعلق تحریری کام لینا، معلوماتی اسباق سے متعلق ایسے کام سپرد کرنا جس میں بچوں کو خود کچھ کرنا پڑے مثلاً ٹکٹ یا تصاویر جمع کرنا، کوئی ماڈل یا منظر بنانا، پھول پتیاں وغیرہ جمع کرنا۔

بچے چونکہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے اور بناتے بگاڑتے رہتے ہیں، اسی میں انہیں لطف بھی آتا ہے اور اسی طرح وہ بہت کچھ سیکھتے اور تجربات حاصل کرتے ہیں اس لیے اگر تدریس میں اس کا اہتمام کیا جائے تو تعلیم زیادہ آسان، موثر اور دلچسپ ہو جاتی ہے اور بچے جو کچھ سیکھتے ہیں وہ زیادہ پختہ اور دیرپا ہوتا ہے۔ مثلاً وضو، نماز کا طریقہ زبانی بتانے کے بجائے عملاً کراتے ہوئے بتایا جائے اور حسب ضرورت اصلاح کر دی جائے تو بچے پوری دلچسپی سے سیکھیں گے اور انہیں بآسانی یاد ہو جائے گا۔

۵۔ تقسیم کا اصول:

یعنی جو کچھ پڑھانا ہو اسے مناسب اجزاء میں تقسیم کر کے پڑھایا جائے۔ یہ تقسیم اس انداز کی ہو کہ ہر جزا اپنے پہلے اور بعد کے اجزا سے فطری طور پر مربوط بھی رہے اور بیچ کی منزل اور کڑی بھی ہو۔ اس طرح قدم بہ قدم آگے بڑھنے اور مناسب اجزاء میں تقسیم کر کے معلومات بہم پہنچانے سے سمجھنا بھی آسان ہوتا ہے اور پوائنٹ وار ترتیب سے یاد بھی ہو جاتا ہے۔ اس کا لحاظ کیے بغیر تعلیم دینے سے معلومات الجھی ہوئی اور گنجلک رہتی ہیں اور بوقت ضرورت ٹھیک طرح سے استعمال نہیں ہو پاتیں۔

۶۔ اعادے کا اصول:

یعنی جو کچھ بچوں کو پڑھایا جائے اس کا اعادہ اور مشق کرا کے خوب یاد کرا دیا جائے۔ بہت زیادہ معلومات بہم پہنچانے کی فکر میں اکثر اساتذہ اعادے کی طرف سے غفلت برتتے ہیں جس کا انہیں بہرحال خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے کیونکہ بچوں کو پچھلا بھی بھول جاتا ہے اور اگلا ان کی سمجھ میں آتا نہیں۔ اس لیے اعادے اور مشق کی طرف غیر معمولی توجہ دینی چاہیے۔ سبق کے ہر جز کے بعد اس جز کا اور سبق کے اختتام پر پورے سبق کا اعادہ کرایا جائے۔ جو قاعدہ بھی سکھایا جائے، اس کی خوب مشق کرائی جائے۔ ہر سبق کے آخر میں پابندی سے کچھ وقت اور ہفتے میں کم از کم ایک دن اعادہ اور مشق کے لیے مخصوص کر دیا جائے تاکہ ہفتے بھر کا کام بخوبی ذہن نشین ہو جائے۔ بغیر اعادے کے آگے نہ بڑھا جائے۔ سوچنے کی بات ہے جس علم پر بچوں کو قدرت حاصل نہ ہو سکے وہ آخر ان کے کس کام کا ہوگا۔

..........☆☆☆..........

باب ۲۸:

تدریس کے گر

تدریس کے عام اصول بتا دینے کے بعد اب ذیل میں پڑھانے کے چند ایسے گر بتائے جا رہے ہیں جو ابتدائی درجات کے طلبہ کی تدریس میں تجربے سے بہت موثر اور مفید ثابت ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان کو فن تدریس میں مسلمہ ضابطوں کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ یہ گر نفسیات کی کسوٹی پر بھی پورے اترتے ہیں اور عقل بھی ان کی صداقت وافادیت کی گواہی دیتی ہے۔ اس لیے حتی الامکان ان پر عمل کرنا چاہیے۔ البتہ معلم کو چاہیے کہ حسب ضرورت ان میں تصرف کر لیا کرے، خصوصا جب وقت محدود ہو یا جب زیادہ عمر کے طلبہ یا بالغوں کو پڑھانا ہو۔

۱۔ معلوم سے نامعلوم کی طرف چلیں:

یعنی بچے جو کچھ پہلے سے جانتے ہوں۔ اسی کے سہارے انہیں نئی باتیں بتائی یا سمجھائی جائیں۔ تدریس کا یہ فطری طریقہ ہے اسی طرح بات ٹھیک ٹھیک سمجھ میں آتی ہے کیونکہ اول تو بچوں کا ذہن انہی چیزوں میں توجہ و دلچسپی کا اظہار کرتا ہے جن میں ندرت اور نئے پن کے ساتھ کسی حد تک انسیت بھی ہو۔ بالکل نئی چیز جس کا سابقہ تجربات ومشاہدات سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہ ہو، بچوں کے نزدیک کبھی قابل اعتنا نہیں ہوتی۔ دوسرے نئی چیز کی تشریح وتوضیح بہر حال سابقہ معلومات ہی کی روشنی میں کی جا سکتی ہے۔

اس گر کا تقاضا ہے کہ تدریس میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا جائے۔

☆ ہر نئے سبق سے متعلق سب سے پہلے بچوں کی لیاقت سابقہ کا ٹھیک ٹھیک تعین کر لیا جائے تا کہ اسی کی بنیاد پر نئی باتیں بتائی یا سکھائی جا سکیں۔

☆ سبق کی تمہید میں ایسے سوالات کیے جائیں جن سے بچوں کی اس ضمن کی سابقہ معلومات کا بخوبی اندازہ ہو سکے، سوالات موضوع سے متعلق ہونے کے ساتھ اتنے آسان ہونے چاہئیں کہ بچوں کو جواب میں دشواری نہ ہو اور ایسے انداز سے پوچھے جانے چاہئیں کہ وہ اپنا مافی الضمیر اگل دیں۔

☆ ایک مضمون کے مختلف اسباق اس انداز سے ترتیب دیئے جائیں کہ ہر اگلے سبق کا پچھلے اسباق سے تعلق قائم ہوتا جائے۔

☆ ہر نیا سبق بچوں کی روزانہ زندگی یا ان کے تجربات ومشاہدات سے مربوط کر کے پڑھایا جائے۔

☆ جدید معلومات کا بچوں کی سابقہ معلومات سے موازنہ ومقابلہ کر کے مشابہت یا فرق اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا جائے۔

☆ بچوں کے تجربات ناقص اور تصورات مبہم ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی سابقہ لیاقت سے سبق میں فائدہ اٹھاتے وقت ان کے سابقہ تصورات کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے۔

۲۔ آسان سے مشکل کی طرف چلیں:

یعنی ہر سبق کی ابتدا آسان سے ہو اور بتدریج مشکلات کی طرف چلیں۔ تدریس کا یہ بہت ہی معقول گر ہے۔ اس طرح بچے غیر محسوس طور پر رفتہ رفتہ مشکلات پر قابو پاتے جاتے ہیں۔ ان کا دل بڑھتا ہے۔ ان کی دلچسپی برقرار رہتی ہے اور وہ مشکلات کو ناقابل عبور نہیں سمجھتے بلکہ ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر شروع ہی میں انہیں کسی مشکل میں پھنسا دیا جائے تو وہ گھبرا کر ہمت ہار بیٹھتے ہیں اور مایوس ہو کر کوشش ہی چھوڑ دیتے ہیں۔

☆ آسان اور مشکل اضافی الفاظ: ایک ہی بات کسی کے لیے آسان ہوتی ہے، کسی کے لیے مشکل۔ اسی طرح سیکھنے سے پہلے جو بات مشکل نظر آتی ہے، سیکھنے کے بعد وہی آسان

ہو جاتی ہے۔اس لیے آسان اور مشکل کا فیصلہ متعلقہ بچوں کے معیار سے کیا جائے نہ کہ اپنے یا کسی اور کے معیار سے۔اساتذہ سے اس ضمن میں اکثر چوک ہو جاتی ہے، وہ ایک چیز کو آسان سمجھ کر طلبہ پر زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔حالانکہ وہ چیز بچوں کے لیے بہت مشکل اور ناقابل فہم ہوتی ہے۔چنانچہ جب بچے سمجھ نہیں پاتے یا کچھ کی سمجھ میں آ جاتا ہے اور کچھ کو دشواری ہوتی ہے تو استاد ان پر بگڑتے اور بسا اوقات سختی پر اتر آتے ہیں حالانکہ بچے بیچارے معذور اور بے قصور ہیں۔

☆ میقات کی ابتدا ہی میں ہر مضمون کے اسباق کو آسان اور مشکل کے لحاظ سے ترتیب دے لیا جائے اور پڑھاتے وقت اس کا پورا لحاظ رکھا جائے کہ پہلے آسان اور پھر بتدریج مشکل اسباق آئیں۔

☆ سبق کے بہت مشکل ہونے کی صورت میں جہاں مایوسی اور بددلی پیدا ہوتی ہے، وہیں بہت آسان ہونے کی صورت میں اکتاہٹ اور عدم توجہی کا اندیشہ ہوتا ہے اور اس پر وقت صرف کرنے سے کچھ حاصل بھی نہیں ہوتا......اس لیے سبق کے شروع میں آسانی کا اہتمام کیا جائے تو آخر تک بتدریج مشکلات پیدا کی جائیں تاکہ بچوں کو مسائل و مشکلات سے نمٹنے کا سلیقہ آئے۔

۳۔ سادہ سے پیچیدہ کی طرف چلیں:

یعنی ہر سبق میں سادہ تصورات پہلے لیں پھر بتدریج پیچیدہ باتیں سمجھائیں۔اسی طرح بچوں کی عمر، ان کی فہم، ان کے تجربات و مشاہدات کو سامنے رکھ کر ہر مضمون کا نصاب اس انداز سے ترتیب دیا جائے کہ سادہ اور آسانی سے سمجھ میں آنے والا مواد پہلے ہو اور پھر بتدریج مخلوط اور پیچیدہ مواد لیا جائے مثلاً ریاضی میں ایک قاعدہ سمجھانے کے بعد مشق کے لیے پہلے اس قاعدہ سے بآسانی نکلنے والے چند سادہ سوالات دیئے جائیں۔پھر بتدریج عبارت میں پیچیدگی لائی جائے اور آخر

میں ایسے سوالات دیئے جائیں جن کو حل کرنے میں اس قاعدے کے ساتھ پہلے سے پڑھے ہوئے بعض قاعدوں کو بھی استعمال کرنے کی ضرورت پڑے۔ قاعدے ضابطے سکھاتے وقت بھی اس اصول کو ملحوظ رکھا جائے یعنی شروع میں سادہ قاعدے بتائے جائیں۔ رفتہ رفتہ پیچیدہ لیکن سادگی اور پیچیدگی کا فیصلہ ہمیشہ بچوں کے معیار سے ہونا چاہیے۔ کیونکہ ایک چیز بڑوں کو بظاہر بہت ہی سادہ محسوس ہوتی ہے۔ لیکن ایک بچے کے لیے وہ اپنے اندر گوناگوں پیچیدگیاں رکھتی ہے اور بڑی مشکل سے سمجھ میں آتی ہے۔

۴۔ ٹھوس سے مجرد کی طرف چلیں:

یعنی مجرد تصورات قائم کرانے کے لیے ٹھوس اشیاء کی مدد لی جائے۔ مثلاً بچوں کو گنتی پہاڑے، جوڑنا، گھٹانا وغیرہ سکھانے کے لیے انگلیوں، بال، فریم، گولیوں اور املی کے بیجوں وغیرہ سے مدد لی جائے تو بڑی سہولت ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ وہ بغیر کسی چیز کی مدد کے جوڑنے گھٹانے لگتے ہیں۔ اسی طرح ماڈل، تصاویر، نقشہ جات وغیرہ کی مدد سے مجرد تصورات آسانی سے قائم کرائے جا سکتے ہیں۔ بالکل نئی یا نامانوس چیز کا تعارف کرانا ہو تو اس کا ماڈل یا تصویر دکھانے سے تصورات واضح بنتے ہیں۔

اس گر سے فائدہ اٹھانے کے لیے مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہیں:

☆ اسباق کی ابتداء ٹھوس چیزوں اور متعین ومقرون مثالوں سے ہو۔ لیکن اختتام حتی الامکان مجرد تصورات پر ہونا چاہیے۔

☆ ٹھوس اشیاء یا متعین ومقرون مثالوں سے اسی وقت تک امداد لی جائے جب تک ضروری ہو۔ رفتہ رفتہ مجرد تصورات قائم کرانے کی فکر کی جائے۔

☆ مجرد تصورات قائم ہو جانے کے بعد انہیں بغیر دہی نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ پھر ٹھوس اشیا یا متعین مثالوں پر استعمال کر کے مزید تفصیلات معلوم کی جائیں۔

۵۔ غیر معین اور غیر واضح تصورات کو معین اور واضح کریں:

بچوں کے تجربات محدود اور مشاہدات ناقص ہوتے ہیں۔ اس لیے مختلف چیزوں کے بارے میں ان کے تصورات غیر معین اور غیر واضح ہوتے ہیں۔ معلم کو چاہیے کہ وہ انہیں رفتہ رفتہ معین اور واضح کرے تاکہ بچوں کا علم پختہ اور قابل اعتماد ہو۔ یہ کام اسی طرح ہو سکتا ہے کہ بچوں کو تجربات و مشاہدات کے کافی مواقع دیئے جائیں اور ان کی قوت مشاہدہ کی بخوبی تربیت ہوتا کہ وہ مشاہدے میں آنے والی چیزوں سے سرسری نہ گزر جایا کریں۔ بچوں کے ناقص اور غلط تصورات کو ٹھیک اور واضح کرنے کے لیے تصاویر، نقشہ جات، توضیح وتشریح اور مثالوں سے مدد لی جائے۔ ہمارے یہاں عام طور پر بچوں کو اصطلاحی الفاظ کی تعریف اور مشکل الفاظ کے معنی رٹوا دیئے جاتے ہیں اور اسی پر اطمینان کر لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس طرح نہ تو تصورات واضح بنتے اور نہ مفہوم بخوبی سمجھ میں آتا ہے۔ مندرجہ بالا طریقوں سے اس کا ازالہ ہونا چاہیے۔

۶۔ خاص سے عام کی طرف چلیں:

یعنی خاص خاص واقعات پہلے بتائیے جائیں اور عمومی بحثیں بعد میں چھیڑی جائیں۔ کوئی عام اصول اخذ کرنے یا کسی عمومی نتیجے پر پہنچنے کے لیے بچوں کو جانچنے پرکھنے اور تجربہ و مشاہدہ کرنے کے کافی مواقع دیئے جائیں۔ اخلاقی اصول اور ضابطے سمجھانے کے لیے نظری بحثیں کرنے کے بجائے متعین واقعات بتائے جائیں۔ تاریخی شخصیتوں کے چیدہ واقعات پہلے سنائے جائیں اور باقاعدہ تاریخ اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان تسلسل کے ساتھ بعد میں بتائی جائے۔

آسانی کے لیے اساتذہ عموماً پہلے قاعدے، ضابطے رٹوا دیتے یا اصول اور کلیے یاد کرا دیتے ہیں اور طلبہ کو خود تجربات کر کے ان نتائج پر پہنچنے کا موقع نہیں دیتے۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس طرح ایک بات بچوں کو دوسرے کے اعتماد پہ یاد کرنی پڑتی ہے جسے وہ بخوبی سمجھ میں نہیں پاتے

اور جلد ہی بھول جاتے ہیں۔

البتہ تجربات ومشاہدات وغیرہ پر طلبہ کا صرف اتنا ہی وقت خرچ کرایا جائے جتنا ناگزیر ہو۔ جب کوئی عام اصول اخذ ہو جائے تو مزید جانچ پرکھ یا مشاہدات وتجربات اور مثالوں وغیرہ پر وقت صرف نہ کرایا جائے بلکہ اس اصول اور کلیے کو مزید مسائل کے حل کرنے پر استعمال کرایا جائے۔

۷۔ مکمل سے اجزاء کی طرف چلیں:

یعنی پہلے کل پر بحیثیت مجموعی ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ پھر ایک ایک جز کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی جائیں۔ اس طرح ابتدا میں ایک اجمالی خاکہ ذہن میں آ جائے گا اور پورا خاکہ ذہن میں محفوظ رہے گا اور رفتہ رفتہ وہ ایک ایک جز کی تفصیلات سے بھی بخوبی واقف ہو جائیں گے۔

ابتدا میں بچوں کی نظر اجزا اور ان کی تفصیلات پر نہیں جاتی بلکہ وہ پوری چیز پر مجموعی نظر ڈالتے اور ہر چیز کا ایک مجمل تصور ذہن میں رکھتے ہیں۔ معلم کو رفتہ رفتہ ایک ایک جز کی وضاحت کر کے پوری چیز کا زیادہ واضح اور متعین تصور قائم کرانا چاہیے۔

اجزاء پر بحث کرنے کے بعد کل سے ان کا ربط بھی ملانا چاہیے۔

۸۔ فطرت کی پیروی کریں:

یعنی بچے ذہنی وجسمانی حیثیت سے جس مرحلے سے گزر رہے ہوں اس مرحلے کی خصوصیات پیش نظر رہیں اور ان کی فطرت وطبیعت جن چیزوں کو قبول کر سکتی ہو، وہی کچھ پڑھائیں اور سکھائیں۔ فطری تقاضوں اور بنیادی خواہشات اور میلانات ودلچسپیوں کو ملحوظ رکھیں اور جائز حدود میں ان کو پوری رعایت دیں۔ بچوں کی فطرت سے جنگ نہ کریں اور نہ خلاف فطرت ان پر کچھ ٹھونسیں۔ اس سے فائدے کے بجائے الٹا نقصان ہوتا ہے۔ محنت تو رائیگاں جاتی ہی ہے۔ اکثر ردعمل بہت شدید ہوتا ہے۔ بعض لوگ بچوں کو قبل از وقت ذہنی طور پر بالغ بنا دینے کی

کوشش کرتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ بچے کو بچے کی حیثیت سے پروان چڑھنے دیا جائے اور تدریس میں خود اس کی عمر ذہنی وجسمانی حالت، اس کی فطرت، اس کے میلانات ورجحانات، اس کے جذبات واحساسات وغیرہ کا پورا لحاظ رکھا جائے۔ اسی صورت میں اسباق کامیاب اور موثر ہو سکتے ہیں۔

۹۔ منطقی کے بجائے نفسیاتی ترتیب سے چلیں:

یعنی مضامین کے مواد بچوں کے سامنے اس ترتیب سے پیش نہ کریں جس ترتیب سے عموماً علمی کتابوں میں پیش کیے جاتے ہیں بلکہ ترتیب وہ ہو جسے بچوں کا ذہن قبول کر سکے۔ مثال کے طور پر پڑھنا سکھانے میں منطقی ترتیب تو یہ ہے کہ پہلے حروف تہجی پر عبور کرایا جائے پھر اعراب بتائے جائیں جن میں حروف الگ الگ ہوں۔ پھر حروف کے جوڑ پیوند اور مخلوط الفاظ پھر جملے اور آخر میں عبارتیں پڑھائی جائیں۔ ظاہر ہے یہ ترتیب منطقی اعتبار سے تو درست ہے مگر تجربہ شاہد ہے کہ بچوں کے لیے یہ ترتیب اتنی خشک اور بے معنی ثابت ہوتی ہے کہ وہ قطعاً دلچسپی نہیں لیتے۔ اس کے برعکس اگر بچوں کو پہلے خوش رنگ مانوس اور بڑی تصاویر یا اصل اشیاء کی مدد سے چند مختصر جملے جن میں الفاظ کی زیادہ سے زیادہ تکرار ہو، سالم پڑھا دیں، پھر ان کا تجزیہ کر کے الفاظ اور الفاظ کا تجزیہ کر کے حروف اور ان کی آوازیں پہنچوادیں تو بچوں کے لیے ان میں معنویت بھی ہوتی ہے اور دلچسپی بھی۔ اس طرح ریاضی میں منطقی ترتیب تو یہ ہے کہ پہلے نقطہ، پھر خطوط، اس کے بعد زاویوں پھر مسطح شکلوں اور آخر میں ٹھوس اشیاء کی بحث آئے لیکن بچوں کے لیے مناسب یہ ہے کہ پہلے ٹھوس اور مسطح شکلیں پہنچوائی جائیں اور خطوط زاویہ اور نقطے کی بحث بعد میں آئے۔

لیکن واضح رہے مضامین کی منطقی ترتیب بھی بڑی اہمیت وافادیت کی حامل ہے۔ منظم اور مربوط علم اور علوم وفنون پر عبور اسی ترتیب کو ملحوظ رکھ کر حاصل ہو سکتا ہے اور بالآخر بچوں کو رفتہ رفتہ لانا اسی پر ہے۔ اس لیے تدریس کو موثر بنانے کے لیے ابتدائی درجات میں ترتیب الٹ دی جائے

وہ بھی ناگزیر حد تک، صرف سبق کو دلچسپ اور موثر بنانے کے لیے، جوں ہی منطقی ترتیب سے مواد پیش کرنے کی گنجائش نظر آئے اسی ترتیب کو ملحوظ رکھیں۔

۱۰۔ مستثنیات سے پہلے عام قاعدے سکھائے جائیں:

یعنی پہلے عام قاعدے وضابطے متعدد مشقوں کے ذریعے بخوبی ذہن نشین کرادیئے جائیں پھر استثنائی صورتیں بتائی جائیں، ورنہ ذہن انتشار و پراگندگی کا شکار ہو جائے گا اور جو قاعدہ بتایا جائے گا، اس میں بھی شک وتذبذب کی کیفیت پیدا ہوگی جس سے ذہن میں محفوظ رکھنے اور بروقت یاد آنے میں دشواری ہوگی مثلاً بیٹی، لڑکی، کاپی، کرسی، بکری، مرغی وغیرہ مثالوں سے یہ قاعدہ اخذ کراتے ہی کہ جن الفاظ کے آخر میں ی ہو وہ مونث ہی ہوتے ہیں، اسی سانس میں یہ بھی نہ بتادیا جائے کہ ہاتھی، پانی، گھی، دہی وغیرہ اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں بلکہ انہیں بعد کے لیے موخر کر دیا جائے۔

☆☆☆

باب ۲۹:

تدریس کے معاون سامان اور تدابیر

تدریس کے جہاں چند بنیادی اصول اور ضابطے ہیں جن کا لحاظ کامیاب تدریس کے لیے ضروری ہے وہیں کچھ تدابیر اور امدادی سامان ہیں جن کو حسب ضرورت استعمال کرنا چاہیے، مثلاً:

۱۔ سوال وجواب

۲۔ بیان

۳۔ تختہ سیاہ

۴۔ توضیح وتشریح

۵۔ نقشے، ماڈل، چارٹ، تصاویر وغیرہ

۶۔ ہوم ورک (گھر پر کرنے کے لیے کام)

۷۔ درسی کتب

۸۔ امدادی سامان (گراموفون، ریڈیو، میجک لینٹرن، فلمیں وغیرہ)

۹۔ دارالمطالعہ اور لائبریری

۱۰۔ امتحانات، جانچ اور جائزے

سوال وجواب

تدریس میں سوالات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، جو اساتذہ مسلسل بولتے جاتے ہیں، نہ خود سوال کرتے اور نہ طلبہ کو سوال کرنے کا موقع دیتے، ان کی تدریس سے طلبہ کو بہت کم فائدہ پہنچتا ہے۔ ایسے اسباق میں بچے بہت کم عملی دلچسپی لیتے ہیں۔

سوالات کی اہمیت وافادیت:

موزوں سوالات کی بڑی اہمیت وافادیت ہے، ان کے ذریعے:

☆ تجسس کو بیدار کر کے بچوں کو سبق پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔

☆ سبق میں ان کی توجہ اور دلچسپی برقرار رکھی جا سکتی ہے۔

☆ غیر متوجہ طلبہ کو متوجہ کرنے اور سست رفتار طلبہ کو ہشکانے اور ہمت بندھانے کا کام لیا جا سکتا ہے۔

☆ طلبہ کو غور وفکر اور مشاہدہ ومطالعہ پر اکسایا جا سکتا ہے۔

☆ ان کی صلاحیت کی جانچ کی جا سکتی ہے۔

☆ طلبہ کو ان کی غلطیاں محسوس کرائی جا سکتی ہیں۔

☆ اسباق کو آگے بڑھانے میں مدد لی جا سکتی ہے۔

☆ اسباق کا اعادہ کرایا جا سکتا ہے۔

اغراض:

پڑھاتے وقت معلم کو طرح طرح کے سوالات کرنے پڑتے ہیں، کچھ سبق کی ابتدا میں، کچھ درمیان میں اور کچھ اختتام پر۔

(الف) **تمہیدی سوالات:** یہ سبق کے شروع میں کیے جاتے ہیں۔ تعداد میں تھوڑے اور بہت ہی آسان ہوتے ہیں۔ نیز موضوع سے ان کا قریبی تعلق ہوتا ہے۔ ان کی غرض یہ ہوتی ہے:

☆ بچوں کی سابقہ لیاقت کا پتہ چل جائے تاکہ اسی بنیاد پر نئی معلومات فراہم کی جائیں۔

☆ بچوں کے ذہن کو سبق کے لیے تیار اور یکسو کیا جائے۔

☆ سبق کی غرض وغایت اور ضرورت وافادیت ان پر بخوبی واضح ہو جائے۔

(ب) درمیانی سوالات: سبق کے بیچ میں متعدد سوالات کیے جاتے ہیں جن کی غرض وغایت یہ ہوتی ہے کہ:

☆ معلم اندازہ کر سکے کہ بچے سبق کو بخوبی سمجھ رہے ہیں۔

☆ سبق میں بچوں کی دلچسپی اور توجہ برقرار ہے۔

☆ سبق کو آگے بڑھانے میں طلبہ عملی حصہ لیں۔

☆ سبق کے مشکل حصے واضح اور ذہن نشین ہوتے جائیں۔

☆ غور وفکر کا موقع ملے اور معلومات میں تسلسل رہے۔

☆ نئی معلومات کا سابقہ معلومات سے ربط قائم ہو۔

☆ بچوں کے روز مرہ کے واقعات، تجربات ومشاہدات وغیرہ سے جدید معلومات کا مقابلہ وموازنہ ہو سکے۔

☆ کچھ مشاہدہ کرانے یا کسی چیز پر توجہ مرکوز کرانے میں مدد ملے۔

☆ غیر متوجہ طلبہ کو متوجہ کیا جا سکے اور سست رفتار طلبہ کو ساتھ لیا جا سکے۔

(ج) اختتامی سوالات: سبق کے آخر میں کچھ سوالات اس غرض سے کیے جاتے ہیں کہ:

☆ پورے سبق کا اعادہ ہو جائے۔

☆ سبق کے ذریعے جو کچھ بتایا اور سکھایا گیا ہے بچوں کو اسے استعمال کرنے کا موقع مل جائے۔

☆ بچوں کو کسی ہوم ورک یا عملی کام پر آمادہ کیا جا سکے یا حل طلب مسئلہ کی شکل میں انہیں کوئی کام دیا جا سکے۔

سوالات کیسے ہوں؟

سوالات سے مذکورہ بالا اغراض ومقاصد اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب ان میں مندرجہ

ذیل خصوصیات پائی جائیں:

☆ سوالات کی زبان صاف، شگفتہ، عام فہم اور زوائد سے پاک، ہوتا کہ بچوں کی سمجھ میں بخوبی آ سکے کہ آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ زبان کی شگفتگی، ان کی توجہ کھینچنے اور جواب سوچنے پر آمادہ کر دے۔ بعض لوگ سوالات میں بلاوجہ غیر ضروری الفاظ کا اضافہ کر دیتے ہیں مثلاً پوچھنا ہے۔ ''آنحضرت ﷺ کس سن میں پیدا ہوئے؟'' تو پوچھیں گے۔ ''کیا تم بتا سکتے ہو یا تم میں کون جانتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کس سن میں پیدا ہوئے۔'' اس طرح کے زوائد سے سوالات کی زبان پاک ہونی چاہیے۔

☆ زبانی سوالات چھوٹے اور ان کی عبارت بہت مختصر ہو تا کہ پورا سوال بآسانی بچوں کے ذہن میں محفوظ رہ سکے مثلاً حضور ﷺ نے ہجرت کیوں فرمائی؟ ایک موزوں زبانی سوال ہے۔ اسی کو اگر ان الفاظ میں پوچھا جائے۔ ''حضور ﷺ نے مکہ چھوڑ کر جو آپ ﷺ کا وطن بھی تھا اور عرب کا مرکزی شہر بھی، مدینہ کیوں ہجرت فرمائی جب کہ وہ شہر آپؐ کے لیے اجنبی بھی تھا اور مکہ سے کافی دور بھی؟'' تو یہ سوال ناقص ہوگا۔

☆ طلبہ کی صلاحیت کا لحاظ رکھ کر بنائے گئے ہوں، نہ اتنے آسان ہوں کہ طلبہ ان پر توجہ دینے یا غور کرنے کی ضرورت ہی نہ سمجھیں اور نہ اتنے مشکل ہوں کہ بچے جواب دینے کی ہمت ہی نہ کر سکیں۔

☆ سبق کے دوران جتنے سوالات کیے جائیں، وہ آپس میں اتنے مربوط ہوں کہ وہ ایک دوسرے کا لازمی جز معلوم ہوں اور سب کا بحیثیت مجموعی اصل سبق سے قریبی تعلق ہو۔ اس طرح خیالات میں بھی تسلسل رہتا ہے اور غیر متعلق باتوں پر وقت ضائع نہیں ہوتا۔

☆ دو یا زائد سوالات ملا کر نہ پوچھے جائیں۔ مثلاً نماز کے اوقات، رکعتیں اور فائدے بتاؤ؟ محمود غزنوی نے کہاں کہاں اور کیوں حملہ کیا؟

☆ سوالات واضح معین اور غیر مبہم ہوں تا کہ بچوں کا ذہن اصل جواب کی طرف منتقل ہو، ایسے

سوالات ہرگز نہ کیے جائیں جن کے ایک سے زیادہ جواب ہو سکتے ہوں، مثلاً:

☆ سامنے کیا نظر آ رہا ہے؟ یا نقشے میں کیا دکھائی دے رہا ہے؟ دونوں صورتوں میں متعدد جوابات ممکن ہیں۔

☆ سوالات صرف یادداشت یا حافظہ سے متعلق نہ ہوں بلکہ فکر انگیز بھی ہوں تاکہ بچوں کو سوچنے اور غور وفکر کرنے پر آمادہ کر سکیں۔

☆ ابتدائی درجات میں سوالات عموماً سیدھے سادے اور ایسے ہوں جن میں بچوں کو خوب بولنا پڑے۔ البتہ اونچی جماعتوں میں قدرے پیچیدہ ہوں تاکہ بچوں کو غور وفکر اور استدلال سے کام لینا پڑے۔

☆ خبردار کیے بغیر دھوکے اور مغالطے میں ڈالنے والے سوالات نہ کیے جائیں مثلاً ایک لڑکا ایک گھنٹے میں تین میل جاتا ہے تو پانچ لڑکے ایک گھنٹے میں کتنے میل جائیں گے۔

☆ سوالات ایسے نہ ہوں جن کے جوابات صرف ''ہاں، نہیں'' یا ایک ہی لفظ میں پورے ہو جائیں۔ اگر اس طرح کے سوالات پوچھنے ہی پڑیں تو ساتھ ہی کیوں یا کیسے وغیرہ بھی ہونا چاہیے تاکہ جواب دینے میں کچھ جدوجہد کرنی پڑے اور معلم کو اطمینان ہو سکے کہ بچے نے سوچ سمجھ کر ''ہاں یا نہیں'' کہا ہے۔

☆ سوالات ایسے بھی نہ ہوں جن کے اندر ہی جواب موجود ہو یا جو اپنے جواب کی طرف خود اشارہ کر رہے ہوں۔ مثلاً کیا حضرت عیسیٰؑ نبی نہیں تھے؟ گینڈا گھاس چرنے والا جانور ہے یا پھاڑ کھانے والا؟ وغیرہ۔

☆ کچھ بتاتے ہی الٹ کر سوال نہ کر لیا گیا ہو مثلاً آنحضرتﷺ ۵۷۱ء میں پیدا ہوئے، حضور ﷺ کس سنہ میں پیدا ہوئے۔'' البتہ اگر کوئی بچہ غیر متوجہ ہو یا کھویا کھویا سا نظر آئے تو اس سے اچانک اس طرح کا سوال کیا جا سکتا ہے یا اس طرح کا سوال کہ فلاں بچے نے کیا جواب دیا؟ وغیرہ۔

سوالات کرنے کا طریقہ:

جس طرح موزوں سوالات بنانا ایک فن ہے، جس میں کافی احتیاط، سوجھ بوجھ اور مشق ومہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔اسی طرح سوالات کرنا بھی فنی مہارت چاہتا ہے۔سوالات پوچھتے وقت مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہنے چاہئیں۔

☆ پورے درجے کو مخاطب کر کے سوال کیا جائے۔کسی کی طرف اشارہ کر کے یا کسی کا نام لے کر سوال نہ کیا جائے۔البتہ جواب کسی ایک ہی بچے سے مانگا جائے۔

☆ سوال کرنے کے بعد جواب سوچنے کا کچھ موقع دیا جائے فوراً جواب نہ مانگا جائے۔

☆ چند مخصوص بچوں ہی سے سوالات نہ کیے جائیں بلکہ باری باری سب سے پوچھے جائیں البتہ اس باری میں کوئی خاص ترتیب نہ ہو ورنہ جن سے پوچھا جا چکا ہوگا یا جن کی باری نہ ہوگی وہ توجہ نہیں دیں گے۔

☆ سوال کرتے وقت صاف بولا جائے تاکہ پورا درجہ بخوبی سن سکے اور سوال کا اصل مدعا ظاہر کرنے والے تلفظ پر خاص طور سے زور دیا جائے۔

☆ سوالات ہرگز نہ دہرائیں الا یہ کہ کسی وجہ سے طلبہ سن یا سمجھ ہی نہ سکے ہوں۔ایسی صورت میں پھر سے سوال کیا جائے یا کوئی آسان سوال کر کے اصل سوال کی طرف رہنمائی کر دی جائے۔

موقع ہو اور ضرورت سمجھیں تو تختہ سیاہ پر سوال لکھ دیا کریں۔خصوصاً جانچ یا ہوم ورک کے لیے سوالات تختہ سیاہ پر لکھ دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

☆ غیر متوجہ طلبہ سے اچانک سوال کیا جائے۔

☆ سوالات کرنے کا لہجہ خوش گوار اور ہمدردانہ ہوتا کہ بچے خود اعتمادی کے ساتھ جواب دینے پر آمادہ ہو جائیں۔خوف وہراس یا جھجک محسوس نہ کریں۔

☆ جواب نکلوانے میں بہت زیادہ وقت صرف نہ کیا جائے۔

☆ اگر ایک بچہ ٹھیک جواب دے دے تو بھی بعض اور بچوں سے جواب مانگے جائیں۔

☆ کبھی کبھی بچوں کو بھی سوال کرنے کا موقع دیا جائے اور سوال کرنے پر انہیں اکسایا جائے۔ ساتھ ہی درجے کی فضا ایسی بنائی جائے کہ دوران تدریس جو بات سمجھ میں نہ آئے طلبہ بے جھجک پوچھ سکیں، اس سے بچوں کے سمجھنے بوجھنے، غور وفکر کرنے، سبق میں پوری دلچسپی لینے میں مدد ملتی ہے۔ البتہ غیر متعلق سوالات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ سوال اگر ضروری اور مفید ہو تو بعد میں علیحدہ سے اس کا جواب دے دیا جائے۔

☆ سوالات اطمینان سے کیے جائیں۔ جلد بازی کرنا یا سوالات کی بوچھاڑ کر دینا ٹھیک نہیں۔ اس سے بچے گھبرا اور بوکھلا جاتے ہیں۔

طلبہ کے جوابات:

سوالات سے پورا پورا فائدہ اسی وقت پہنچ سکتا ہے جب طلبہ کے جوابات کے سلسلے میں مناسب طرز عمل اختیار کیا جائے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا جائے۔

☆ بچوں کے جوابات خندہ پیشانی سے سنے جائیں۔ انہیں جواب دینے پر اکسایا جائے۔ صحیح جوابات پر شاباشی دی جائے۔ غلط یا احمقانہ جوابات پر طنز وتعریض سے گریز کیا جائے۔ لایعنی اور غیر متعلق جوابات نظر انداز کر دیے جائیں۔

☆ طلبہ کے بعض غلط لیکن ''دلچسپ'' جوابات سے درجے میں شگفتگی اور مسرت کی لہر دوڑانے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ البتہ ایسا کرتے وقت، جواب دینے والے بچے کے جذبات کا پورا لحاظ رکھنا چاہیے۔

☆ صرف ان جوابات کو بالکل ٹھیک شمار کیا جائے جو

(۱) زبان اور قواعد کی رو سے بالکل ٹھیک ہوں۔

(۲) سوال سے متعلق ہوں۔
(۳) جتنی بات پوچھی گئی ہے اس سے کم ہوں نہ زیادہ۔
(۴) پورے جملے میں دیئے گئے ہوں لیکن اس پر ہمیشہ اصرار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ کبھی کبھی فطری جوابات ادھورے جملوں ہی میں ہو جاتے ہیں۔
(۵) پوری آواز سے دیا گیا ہو تاکہ پورا درجہ بآسانی سن سکے۔
اگر ان پہلوؤں سے نقص ہو تو قبول کرنے سے پہلے اس کی اصلاح کرا دی جائے۔

☆ حتی الامکان بچوں ہی کے جوابات جزوی ردو بدل کے بعد قبول کر لیے جائیں۔ اگر پورا جواب صحیح نہ ہو تو جتنا جز ٹھیک ہو اتنا ہی قبول کر لیا جائے، باقی حصہ مزید سوالات کر کے یا وقت کم ہو تو خود بتا کر مکمل کرا لیا جائے اس سے بچوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔
☆ ٹھیک جوابات کو دوسرے طلبہ سے دہروا دیا جائے۔ کبھی کبھی طلبہ کے اچھے جوابات کو درجے کے سامنے بطور نمونہ پیش کیا جائے۔
☆ ٹھیک جواب فوراً قبول کر لینے کے بجائے بعض اور طلبہ سے پوچھ لینے کے بعد قبول کیا جائے تاکہ دوسرے بچوں کی معلومات کے بارے میں بھی اندازہ ہو سکے۔
☆ جواب سوچتے وقت بولا نہ جائے اور نہ جواب کے درمیان مداخلت کی جائے۔ اگر مدد کی ضرورت ہو تو کسی دوسرے بچے سے دلوا دی جائے۔
☆ بچہ اگر غلط جواب دے یا جواب ہی نہ دے سکے تو فوراً بتا نہ دیا جائے بلکہ یا تو مزید سوالات کر کے جواب کی طرف رہنمائی کی جائے یا دوسرے بچوں سے صحیح جواب حاصل ہونے کے بعد اس سے دہروا دیا جائے۔
☆ طلبہ کے سارے غلط جوابات قابل اعتنا نہیں ہوتے لیکن وہ جوابات جن سے اندازہ ہو کہ بچہ بات سمجھ نہیں سکا ہے اس کی ضرور اصلاح کی جائے ساتھ ہی یہ بھی واضح کیا جائے کہ اس کا جواب کیوں غلط ہے۔

☆ لاپرواہی یا گستاخی سے دیئے گئے جوابات پر کبھی کبھی ہمدردی و دلسوزی سے سرزنش مفید ہوتی ہے۔

☆ اجتماعی جوابات عام طور پر نہ مانگے جائیں اور نہ قبول کیے جائیں۔ البتہ اعادہ یا مشق کی صورت میں وقت بچانے کے لیے کبھی کبھی ایسا کیا جا سکتا ہے۔

☆ بچوں کو اس کا عادی بنایا جائے کہ جس سے سوال کیا جائے وہی جواب دے۔ دوسرے نہ بول پڑیں کیونکہ اکثر ذہین بچوں کے بول پڑنے کی وجہ سے دھوکا ہو جاتا ہے کہ سب کو آتا ہے اور بعد میں پتہ چلتا ہے کہ اکثریت سمجھی ہی نہیں۔

☆ اگر پورا درجہ یا زیادہ طلبہ بار بار غلط جواب دیں تو سبب کا پتہ لگا کر ازالہ کیا جائے اسباب عموماً یہ ہو سکتے ہیں۔

(۱) سوالات طلبہ کی لیاقت سے اونچے ہوں۔

(۲) تدریس کے طریقے میں خامی ہو اور سبق سمجھ میں نہ آرہا ہو۔

(۳) درجے کا نظم وضبط ٹھیک نہ ہو۔

(۴) بچے تھک گئے ہوں۔

(۵) سبق خشک بے جان اور غیر دلچسپ ہو۔

۲۔ بیان:

تدریس میں بیان کو بھی بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ نئی معلومات فراہم کرتے وقت معلم کو اکثر اس سے کام لینا پڑتا ہے۔ خصوصاً تاریخ، جغرافیہ، سیرت وسیر، اسباق الاشیاء اور کہانیاں سنانے کے ضمن میں۔ معلم کو کبھی کوئی واقعہ سنانا پڑتا ہے، کبھی کسی شخص، چیز یا جگہ کے بارے میں کچھ بتانا ہوتا ہے۔ اکثر کہانیاں سنانی پڑتی ہیں۔ اس لیے جب تک اسے بیان پر قدرت نہ ہو اور اس کا انداز بیان موثر نہ ہو وہ کامیاب معلم ہرگز نہیں بن سکتا۔

الف: کسی شخص جگہ یا چیز کے بارے میں بیان:

کسی شخص، جگہ، جانور، چیز یا واقعہ کے متعلق کچھ بیان کرنا ہو تو مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہنے چاہئیں۔

☆ معلم کے ذہن میں اس کا اتنا واضح تصور ہو گویا اس نے خود غور سے دیکھا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس نے اس کا گہرا مطالعہ یا مشاہدہ کیا ہو۔

☆ آسان الفاظ اور موزوں زبان میں واضح نقشہ کھینچا جائے تاکہ بچوں کے ذہن میں صحیح تصورات قائم ہوں۔

☆ حتی الامکان اختصار سے کام لیا جائے۔ بہت زیادہ تفصیلات سے بچوں کا ذہن الجھ جاتا ہے۔ البتہ جتنا کچھ بتایا جائے اس کی اتنی واضح منظر کشی کی جائے کہ پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔

☆ پہلے کل کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جائے۔ پھر ایک خاص ترتیب سے تفصیلات بتائی جائیں۔

☆ زبانی بیان کر دینے ہی پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ حسب موقع ماڈل، تصویر، چارٹ اور نقشے وغیرہ سے مدد لی جائے۔

☆ ان دیکھی اور نا معلوم چیزوں کے متعلق بتاتے وقت دیکھی ہوئی یا معلوم چیزوں سے مقابلہ وموازنہ کیا جائے تاکہ فرق ومماثلت بخوبی سمجھ میں آجائے۔

☆ جو کچھ بیان کرنا ہو، اس کا مختصر خاکہ پہلے سے مرتب کر لیا جائے اور بیان میں اس ترتیب کا لحاظ رکھا جائے تاکہ کڑی سے کڑی ملتی جائے۔

☆ جو کچھ بیان کرنا ہو، اسے مسلسل اور ایک ہی سر میں نہ بیان کیا جائے بلکہ دو یا تین مناسب اجزا میں تقسیم کر کے باری باری ایک ایک جز پیش کیا جائے۔ ہر جز کے اختتام پر سوالات

کر کے اعادہ کرادیا جائے اور پھر خلاصہ نوٹ کرادیا جائے۔

ب۔ کہانیاں کہنا:

کہانیاں شروع سے تعلیم وتربیت کا نہایت دلچسپ اور موثر ذریعہ رہی ہیں۔کون ہے جسے کہانیوں میں لطف نہیں آتا لیکن بچے تو ان کے بہت ہی دل دادہ ہوتے ہیں، دادی اماں کے جہاں اور بہت سے احسانات ہوتے ہیں جن سے بچے ان کی طرف کھنچتے ہیں، وہاں سب سے زیادہ کشش ان کی کہانیوں کی وجہ سے ہوتی ہے۔کہانیوں سے ان کے فطری ذوق کا اندازہ اس اصرار سے ہوسکتا ہے جو کہانیاں سننے کے لیے وہ کرتے رہتے ہیں۔وہ ہمہ تن متوجہ ہوکر سنتے ہیں یہاں تک کہ ان کی نینداڑ جاتی ہے۔اور دادی اماں کی جان اس وقت چھوٹتی ہے جب سنتے سنتے بالآخر وہ نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

اہمیت وافادیت:

۱۔ کہانیوں سے بچوں کی ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی تربیت میں بڑی مدد ملتی ہے۔وہ اپنے کو ہیرو کا قائم مقام بنا کر اپنے اوپر اسی جیسی تمام کیفیات طاری کر لیتے ہیں۔سنتے سنتے اچھل پڑتے ہیں اور چہرے بشرے نیز جسم کی حرکات وسکنات سے صاف محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کے دل ودماغ پر بھی وہی کچھ گزر رہی ہے جو کہانی میں ہیرو پر گزرتی ہے۔

۲۔ قوت متخیلہ کی نشوونما، نصب العین اور آدرش کی تشکیل، سیرت سازی اور اعلیٰ تخیلات کو پروان چڑھانے میں کہانیاں بہت زیادہ معاون ثابت ہوتی ہیں۔

۳۔ مشکل اور خشک مضامین کہانیوں کے سہارے آسان، دلچسپ اور قابل قبول بن جاتے ہیں۔

۴۔ مجرد تصورات اور اصولی باتیں کہانیوں کے ذریعے بآسانی سمجھ میں آجاتی ہیں۔

۵۔ زبان سکھانے، الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ کرنے، خیالات وجذبات کے اظہار پر قدرت حاصل کرنے میں بھی کہانیاں بڑی معاون ہوتی ہیں۔

٦۔ اسلامیات، تاریخ، جغرافیہ، سیرت وغیرہ سے متعلق معلومات ان کے ذریعے بآسانی فراہم کی جاسکتی ہیں جو انہی کے سہارے اچھی طرح یاد بھی ہو جاتی ہیں۔

قابل لحاظ امور:

ابتدا میں کہانیاں سادہ اور مختصر ہونی چاہئیں۔ رفتہ رفتہ طویل اور پیچیدہ۔

☆ الفاظ آسان، جملے چھوٹے اور زبان شگفتہ ہونی چاہیے۔

☆ واقعات باہم مربوط اور بچوں ہی کی زندگی سے متعلق نیز ان کے ذوق، فہم، مشاہدے اور تجربے سے قریب ہونے چاہئیں۔

☆ قصے کا ہیرو حتی الامکان بچہ ہو اور اس کی حرکات وسکنات یا کارنامے واضح پس منظر میں بیان کی جائیں۔

☆ قصے کا مواد بچوں کی عمر، لیاقت، نفسی خصوصیات اور دلچسپیوں کو پیش نظر رکھ کر منتخب کرنا چاہیے۔

☆ کہانیوں کے افراد، مقامات اور اشیاء کو تعین کے ساتھ بتانا چاہیے۔

☆ کہانیاں حرکت اور جوش سے بھرپور ہونی چاہئیں۔ ان میں بھاگ دوڑ، اچھل کود، مقابلہ ومسابقت، ہمت وشجاعت اور سیر وسیاحت اور مہمات واکتشافات وغیرہ۔ کے واقعات ہونے چاہئیں۔

☆ مکالمات کی فراوانی ہونی چاہیے۔

☆ کہانی مسلسل پھیلتی جائے تاکہ توجہ مرکوز اور دلچسپی برقرار رہے۔

☆ اگر ایک شگفتہ جملہ یا فقرہ تھوڑے تھوڑے وقفے پر دہرایا جاسکے تو چھوٹے بچوں کو بہت لطف آتا ہے۔

☆ کہانی خواہ کسی مضمون سے متعلق ہو، اس میں قصہ پن غالب ہونا چاہیے البتہ وہ مقصد ہمہ وقت پیش نظر رہنا چاہیے جس کے لیے وہ کہانی سنائی جارہی ہے۔

☆ مشہور و معروف کہانیوں کو من وعن پیش کرنے کے بجائے حسب ضرورت بچوں کی لیاقت وصلاحیت کے مطابق ڈھال کر پیش کرنا چاہیے لیکن تاریخی کہانیوں میں اس کا لحاظ رہے کہ تاریخی حقائق یا واقعات مجروح نہ ہونے پائیں۔

☆ بعض کہانیاں جگ بیتی کے بجائے آپ بیتی کے طور پر پیش کی جائیں تو زیادہ لطف دیتی ہیں۔ ایسی کہانیاں بچوں کو جلد یاد ہو جاتی ہیں اور وہ انہیں بآسانی بیان کر سکتے ہیں۔ اس لیے کبھی کبھی ہیرو کی زبان سے کہانی کہلوانی چاہیے۔

☆ بچپن میں بھوت پریت اور جن وپری کے قصوں سے توہم پرستی پیدا ہوتی ہے اور عنفوان شباب میں جاسوسی یا عشقیہ کہانیوں سے بے حیائی اور جرائم پیشگی، اس لیے اس طرح کی کہانیوں سے محفوظ رہنا چاہیے۔

☆ کہانی معلم کو خوب یاد ہونی چاہیے تاکہ سناتے وقت روانی رہے۔ بیچ بیچ میں رکنا یا کتاب کھول کر دیکھنا نہ پڑے ورنہ سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔

☆ کہانیوں کے جو حصے مکالے کی شکل میں پیش کیے جا سکتے ہوں انہیں کبھی درجے یا مجمع کے سامنے بطور مکالمہ پیش کرنے کا موقع دینا چاہیے۔ البتہ ایسی کہانیاں مکالے کے لیے منتخب نہ کرنی چاہئیں جن سے کسی بچے کو کوئی گھناؤنا پارٹ ادا کرنا پڑے۔ ورنہ اس بچے پر وہی کیفیات طاری ہوں گی اور اس کا اندیشہ رہے گا کہ وہ ہی کہیں جڑ نہ پکڑ جائیں۔

کہانیاں سنانے کا طریقہ:

☆ کہانیاں ہمیشہ زبانی سنانی چاہئیں۔ پڑھ کر سنانے میں نہ تو لطف ہی آتا ہے اور نہ وہ کیفیت ہی طاری ہوتی ہے جس کے لیے کہانی سنائی جاتی ہے۔ اگر کبھی پڑھ کر سنانا ہی پڑے تو انداز بیان زبانی سنانے کا سا ہونا چاہیے۔

☆ انداز خوشگوار اور لب ولہجہ فطری ہونا چاہیے۔ حسب ضرورت آواز میں اتار چڑھاؤ اور

حرکات وسکنات سے جوش وجذبے کا اظہار بھی ضروری ہے۔

☆ معلم جب خود مزے لے کر کہانی سناتے اور واقعات سے تاثر کا اظہار کرتے ہیں تو بچے بھی لطف لیتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں۔اس لیے زبان، بیان، انداز ہر چیز سے مطلوبہ کیفیت اور فضا پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

☆ کہانی مسلسل سنانے کی بجائے دو تین موزوں اجزا میں تقسیم کر کے سنانا چاہیے۔ایک جز سنانے کے بعد موزوں سوالات کے ذریعے اہم واقعات کا اعادہ کرا کے اگلا جز پیش کرنا چاہیے۔آخر میں سوالات کر کے پوری کہانی کا خلاصہ سن لینا چاہیے۔

☆ الفاظ میں واضح نقشہ کھینچنے اور ہر واقعہ کا پس منظر بیان کرنے کے بعد بھی حتی الامکان توضیحی تصاویر دکھانی چاہئیں اور تختہ سیاہ کی مدد سے مزید وضاحت کرنی چاہیے۔

☆ معلوماتی کہانیوں میں سے مناسب سوالات کے ذریعے وہ باتیں اخذ کرا لینی چاہئیں جن کے لیے کہانی کی مدد لی گئی تھی۔

☆ کہانی سنانے کے دوران میں وہ مقصد ہمہ وقت ذہن میں رہنا چاہیے جس کے لیے وہ کہانی سنائی جا رہی ہے۔

☆ کہانی کے وہ حصے جنھیں بچوں سے مکالے کے طور پر بعد میں پیش کرانا ہو، سناتے وقت معلم انہیں مکالے ہی کی شکل میں پیش کرے۔

☆ کبھی کبھی بچوں کو بھی کہانیاں سنانے کا موقع دینا چاہیے اور اس ضمن میں انتخاب، پیش کش وغیرہ کے سلسلے میں مناسب رہنمائی ہونی چاہیے۔

۳۔ تختہ سیاہ (بلیک بورڈ)

تدریس کو آسان، موثر اور دلچسپ بنانے میں تختہ سیاہ کو بھی بہت زیادہ دخل ہے۔سبق کو واضح کرنے میں اس سے بہت مدد ملتی ہے۔مگر نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سے بہت کم اساتذہ کما حقہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اہمیت وافادیت:

☆ سبق کے مشکل حصوں کی توضیح وتشریح کے لیے تختہ سیاہ بہت ہی سستی اور موزوں سطح ہے۔ حسب ضرورت اس پر نہایت واضح اور خوش رنگ تصاویر، چارٹس اور نقشے وغیرہ بنائے جا سکتے ہیں جن میں وقت اور پیسے کی بھی بچت ہوتی ہے اور بنانے کا سلیقہ ہو تو پہلے سے بنی یا چھپی ہوئی چیزوں کے مقابلے میں یہ زیادہ موثر ہوتی ہیں۔

☆ بچوں کے سامنے اس پر جو لکھا اور بنایا جاتا ہے اسے بچے زیادہ غور اور توجہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں بخوبی آتا ہے اور ضرورت ہو تو وہ بآسانی اس کی نقل بھی اتار سکتے ہیں۔

☆ زبانی پڑھاتے رہنے تو بچوں کو صرف کانوں سے کام لینے کا موقع ملتا ہے اور مسلسل سنتے رہنے سے وہ اکتا بھی جاتے ہیں۔ تختہ سیاہ کی وجہ سے انہیں آنکھوں سے بھی کام لینے کا موقع ملتا ہے۔ اور بولنا بند کر کے جب معلم تختہ سیاہ استعمال کرنے لگتا ہے تو کام کی نوعیت میں تبدیلی واقع ہو جانے کی وجہ سے اکتاہٹ بھی دور ہو جاتی ہے نیز توجہ اور دلچسپی پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے، ایک سے زائد حواس سے کام لینے کی وجہ سے سمجھنے اور یاد رکھنے میں بھی سہولت ہوتی ہے۔

☆ طلبہ کو زبانی کوئی ہدایت دی جائے یا حل کرنے کے لیے کوئی مسئلہ یا ہوم ورک، تو کبھی بھی وہ غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں، کہا کچھ جاتا ہے اور بچے کرتے کچھ اور ہیں تختہ سیاہ پر نوٹ کر دینے سے کام متعین ہو جاتا ہے اور طلبہ بھٹکنے یا شبہ میں پڑنے سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

☆ تختہ سیاہ کی بدولت سبق کا خلاصہ اور مختصر نوٹ مربوط و مرتب شکل میں طلبہ کو مل جاتا ہے جسے وہ بآسانی یاد بھی کر سکتے ہیں اور اپنی کاپیوں پر صحت کے ساتھ نوٹ بھی۔ سبق کے خاص خاص پوائنٹ پر توجہ مرکوز کرانے میں بھی تختہ سیاہ سے بڑی مدد ملتی ہے۔

استعمال:

☆ تختہ سیاہ معلم کی بائیں جانب اس انداز سے لگایا جائے کہ سطح چمکے نہیں اور پورا درجہ بآسانی

دیکھ سکے۔ نیز معلم کو وہاں تک پہنچنے اور لکھنے میں آسانی ہو۔

☆ استعمال سے پہلے تختہ سیاہ خوب صاف کرلیا جائے۔ جھاڑن اگر قدرے نم استعمال کیا جائے تو بہتر ہے مگر بہت گیلا نہ ہو۔ کام ختم ہونے کے بعد جلد از جلد صاف کردیا جائے۔

☆ تختہ سیاہ پر جو کچھ لکھا یا بنایا جائے وہ نہایت صاف، واضح، صحیح، سیدھی سطر نیز موٹے اور یکساں خط میں ہو۔

☆ کھریا سرے کے قریب پکڑی جائے، ۴۵ درجے کا زاویہ بناتے ہوئے تختہ سیاہ پر لکھا جائے، موٹا لکھنا ہو تو چاک کا سرا گھس لیا جائے۔ لمبی لکیر کھینچنی ہو تو دونوں سرے کے نقطے متعین کر کے ملا دیئے جائیں اور رنگ بھرنا ہو تو تختہ سیاہ کو پٹ کردیا جائے۔

☆ لکھتے وقت چاک سے کھر کھراہٹ کی آواز نہ نکلے ورنہ توجہ بھٹکے گی۔ بسا اوقات سرے پر کنکری آجانے سے آواز نکلتی ہے۔ ایسی صورت میں سرا توڑ کر کنکری نکال دی جائے۔

☆ پورے درجے کا خیال رکھ کر لکھا جائے اور کبھی کبھی پیچھے جا کر اطمینان کرلیا جائے کہ سب کو بخوبی دکھائی دے رہا ہے۔

☆ درجے کی طرف پیٹھ کر کے نہیں بلکہ ایک پہلو یا جانب سے لکھا جائے لکھتے وقت درجے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتے یا کچھ بولتے یا پوچھتے جانا چاہیے۔ تا کہ درجے کا نظم وضبط برقرار رہے۔

☆ لکھا ہوا یا تو خود بلند آواز سے پڑھ دیا جائے، یا بچوں سے پڑھوالیا جائے تا کہ کچھ چھوٹ گیا ہو یا پڑھنے میں دشواری ہو تو اصلاح کردی جائے۔

☆ صاف وخوش خط لکھنے یا اسکیچ کرنے کی خوب مشق کر لی جائے۔ لائن ڈرائنگ آسان بھی ہوتی ہے اور موثر بھی، نیز معمولی مشق سے آجاتی ہے۔ واضح رہے غلط یا بد خط اور گندہ لکھنے سے نہ لکھنا بہتر ہے۔ اس سے بچوں پر خراب اثر پڑتا ہے۔ اس لیے صحت وصفائی کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔

☆ ابتدائی درجات میں حتی الامکان رنگین چاک استعمال کیا جائے۔ اس سے بچوں کی توجہ اور دلچسپی حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ البتہ اونچی جماعتوں میں عموماً سفید چاک استعمال کیا جائے۔ اہم پوائنٹ، سرخیوں اور عنوانات کو رنگین چاک سے لکھنا چاہیے۔

☆ سبق کا خلاصہ نہایت اختصار سے لکھا جائے۔ سبق کے ساتھ ساتھ خلاصہ نوٹ کرتے جانا چاہیے۔ اس طرح سبق ختم ہوتے ہوتے خلاصہ بھی تیار ہو جاتا ہے۔

☆ کبھی کبھی طلبہ کو بھی تختہ سیاہ استعمال کرنے کا موقع دیا جائے۔

۴۔ توضیحات وتشریحات

پڑھاتے وقت متعدد ایسے مواقع آتے ہیں جب معلم کو کسی مشکل، نامانوس، غیر واضح یا مبہم بات کی توضیح وتشریح کرنی پڑتی ہے تاکہ

☆ اشکال دور ہو جائے۔

☆ تصورات واضح بنیں۔

☆ بات بخوبی ذہن نشین ہو جائے۔

یہ توضیحات وتشریحات دو طرح کی ہوتی ہیں۔

(۱) زبانی

(۲) مرئی یعنی نظر آنے والی مثلاً تصاویر، نقشہ جات، گلوب چارٹ وغیرہ۔

زبانی توضیحات:

زبانی تشریح کرتے وقت حسب ضرورت وموقع مختلف تدابیر اختیار کی جاتی ہیں مثلاً:

☆ مشکل الفاظ کا مفہوم سمجھانے کے لیے یا تو آسان مترادفات دے دیئے جاتے ہیں یا ان کی ضد بتا دی جاتی ہے یا انہیں جملوں میں استعمال کر کے مفہوم واضح کر دیا جاتا اور محل استعمال بتا دیا جاتا ہے۔ تلمیح طلب الفاظ ہوں تو اختصار سے واقعہ سنا دیا جاتا ہے۔ اصطلاحی

الفاظ ہوں تو ان کی تعریف بیان کر کے مثالوں سے وضاحت کر دی جاتی ہے۔

☆ نامانوس چیز کا واضح تصور دلانے کے لیے کسی مانوس چیز سے تشبیہ دی جاتی ہے یا اس سے موازنہ و مقابلہ کر کے مماثلت اور فرق واضح کر دیا جاتا ہے۔

☆ حکایت، روایت، چٹکلے ضرب المثل وغیرہ کی مدد سے کسی مجرد تصور کی توضیح کر دی جاتی ہے۔

☆ مشکل عبارت کا مفہوم اپنے آسان الفاظ اور سادہ انداز میں بیان کر دیا جاتا ہے۔

قابل لحاظ امور:

☆ توضیح وتشریح سے پہلے اس کی ضرورت محسوس کرائی جائے تا کہ بچے غور سے سنیں۔ تشریح سے پہلے اگر بچوں ہی کو اشکالات حل کرنے کی دعوت دی جائے تو وہ تشریح کی ضرورت بآسانی محسوس کر لیں گے۔

بچوں ہی کی زبان اور انداز بیان میں تشریح کی جائے تا کہ بات بھی بخوبی سمجھ میں آ جائے اور بچے حسب ضرورت خود بھی تشریح کر سکیں۔

☆ وضاحت کرتے وقت سبق کی اصل غرض و غایت پیش نظر رہے اور حتی الامکان اختصار سے کام لیا جائے تا کہ غیر متعلق یا لایعنی تفصیلات میں وقت ضائع نہ ہو۔

☆ تشریح کے ضروری پوائنٹ اگر تختہ سیاہ پر نوٹ کر دیے جائیں تو افادیت بڑھ جاتی ہے۔

☆ زبانی بتا دینے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ ممکن ہو تو تختہ سیاہ پر شکلیں اور گراف وغیرہ کھینچ کر مزید وضاحت کی جائے۔

☆ تشریح وتوضیح کے دوران طلبہ کو زیادہ سے زیادہ پوچھنے کا موقع دیا جائے۔

۵۔ تصاویر، ماڈل، چارٹ وغیرہ

ابتدائی درجات میں موثر تدریس کے لیے مختلف چیزیں، ان کے ماڈل، تصاویر اور چارٹ وغیرہ کا استعمال نہایت مفید اور ضروری ہے کیونکہ ان کی مدد سے:

☆ نئی معلومات بآسانی بہم پہنچائی اور ذہن نشین کی جاسکتی ہیں۔

☆ بچوں کے تصورات صحیح اور واضح بنتے ہیں۔

☆ سبق میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور بچے توجہ دیتے ہیں۔

☆ بیان کی بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے۔

☆ زبانی تشریح کے مقابلے میں ان کی بدولت ذہن پر زیادہ گہرے نقوش بنتے ہیں چنانچہ بات زیادہ دنوں تک یاد رہتی ہے۔

☆ مشاہدہ کی تربیت ہوتی ہے اور قابل توجہ پہلوؤں پر بچوں کی نظریں جمنے لگتی ہیں۔

قسمیں:

مرئی توضیحات مندرجہ ذیل اقسام کی ہوتی ہیں۔

☆ اصل اشیاء۔

☆ ماڈل، سٹینڈ پر مناظر، گلوب وغیرہ۔

☆ تصاویر، فوٹو، سیریاں، پوسٹرس وغیرہ۔

☆ نقشے، خاکے، گراف، چارٹ وغیرہ۔

☆ عمل یا تجربہ کر کے دکھانا یا مشاہدے کے لیے لے جانا۔

ا۔ اصل اشیاء:

پڑھاتے وقت اگر اصل اشیاء بچوں کے سامنے پیش کی جاسکیں اور بچوں کو انہیں دیکھنے چھونے اور کھانے پینے کی چیزیں ہوں تو سونگھنے اور چکھنے کا بھی موقع مل سکے تو معلومات نہایت واضح ہوں گی اور تصورات صحیح قائم ہوں گے اس لیے جو چیزیں بآسانی حاصل ہوسکتی ہوں اور درجے میں لائی بھی جاسکیں۔ یا ان تک بآسانی پہنچا جاسکے۔ ان کے بارے میں تو معلومات اسی انداز سے بہم پہنچائی جائیں۔ چھوٹے بچوں کے ضمن میں تو ایسا کرنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ ان

کے تجربات ومشاہدات، ناقص اور محدود ہوتے ہیں اور تصاویر نقشہ جات اور چارٹوں وغیرہ کی مدد سے وہ بخوبی سمجھ نہیں پاتے۔ اصل اشیاء کو حتی الامکان ان کے پس منظر ہی میں دکھانا چاہیے۔ مشاہدے کے وقت اہم پہلوؤں کی طرف بچوں کو متوجہ کرنا چاہیے ورنہ بہت سی اہم باتیں وہ اپنے طور پر دیکھ نہیں پاتے اور نہ قوت مشاہدہ کی تربیت ہو پاتی ہے۔

۲۔ ماڈل:

جغرافیہ، تاریخ اور عام سائنس میں متعدد ایسے مناظر اور اشیاء کے بارے میں معلومات بہم پہنچانی ہوتی ہیں جن تک رسائی مشکل ہے یا جو بہت بڑی ہوتی ہیں یا کسی اور وجہ سے درجے میں لائی نہیں جاسکتیں مجبوراً ان کے ماڈلوں سے کام چلانا پڑتا ہے۔ ماڈل سستے مگر صاف اور صحیح بنانے یا حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ماڈل اشیاء کے بھی ہوتے ہیں اور مناظر ونقشہ جات کے بھی، جو ٹھوس ہونے کی وجہ سے بچوں کے لیے قابل فہم بھی ہوتے ہیں اور جاذب نظر بھی لیکن چونکہ اصل کے مقابلے میں عموماً نہایت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو دیکھ کر غلط تصورات قائم ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ ماڈل کے ساتھ اس کی اصل تصویر بھی دکھائی جائے تاکہ سائز اور پس منظر وغیرہ کے متعلق صحیح تصورات قائم ہوں۔

۳۔ تصاویر، پوسٹر وغیرہ:

بچے کہانیوں کی طرح تصاویر کے بھی بڑے دلدادہ ہوتے ہیں۔ کوئی تصویر سامنے آئے تو اس کو غور سے دیکھنے اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ چنانچہ خوش رنگ پوسٹرز اور تصاویر کی وجہ سے سبق بہت دلچسپ بھی ہو جاتا ہے اور قابل فہم بھی، واضح تصورات قائم کرانے میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے۔ ان کے ضمن میں مندرجہ ذیل امور پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

☆ شکلیں بہت بڑی خوش رنگ اور جاذب نظر ہوں اور ان میں صرف وہی تفصیلات نمایاں طور

پر دکھائی گئی ہوں جن کے لیے وہ بچوں کے سامنے پیش کرنی ہیں۔

☆ خود بنائی یا ساتھی اساتذہ کی مدد سے تیار کی جاسکیں تو بہتر ہے۔

☆ ہر معلم کو ایک ایسا البم تیار کرنا چاہیے جس میں اپنے مضامین سے متعلق شکلیں برابر اکٹھا کی جاتی رہیں تاکہ بروقت دکھائی جاسکیں۔ پرانے انگریزی رسائل سے خاصا ذخیرہ اکٹھا ہو سکتا ہے۔

☆ پوسٹرز وغیرہ تیار کرنے میں بڑے بچوں سے بھی مدد لی جائے۔

☆ ہر معلم کو جدید طرز کی سادہ شکلیں بنانے کی مشق کر لینی چاہیے۔ یہ نہایت آسانی سے اور بہت کم وقت میں تیار ہو جاتی ہیں۔ اس کے باوجود بڑی موثر ہوتی ہیں۔ بچے انہیں زیادہ پسند کرتے ہیں۔

۴۔ نقشے، چارٹ، گراف وغیرہ:

نو دس سال کے بچے اصل اشیاء یا ان کے ماڈلوں اور تصویروں کی جگہ نقشوں اور خاکوں کی مدد سے بھی بخوبی سمجھ سکتے ہیں اس لیے رفتہ رفتہ ان سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ تاریخ میں نقشہ جات اور ٹائم چارٹ سے جغرافیہ اور عام سائنس میں مختلف طرح کے خاکوں، نقشہ جات، گلوب، گراف اور چارٹوں وغیرہ سے مدد لینی چاہیے۔

۵۔ عمل، تجربہ، مشاہدہ:

زبانی سمجھانے کے مقابلے میں اگر بچوں کے سامنے کر کے دکھا دیا جائے۔ مثلاً نماز پڑھنے کا پورا طریقہ، تو بات بآسانی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ایسے تمام مواقع پر زبانی سے زیادہ عملی مظاہرہ مناسب ہوتا ہے۔ اسی طرح عام سائنس اور جغرافیہ وغیرہ کے ضمن میں تجربہ کر کے دکھانا یا بچوں کو تجربہ اور مشاہدہ کا موقع فراہم کرنا بھی معلومات کو واضح کرنے میں بہت معاون ہوتا ہے ان سے بھی پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

قابل لحاظ امور:

☆ توضیحات کے انتخاب میں بچوں کی عمر، ذہنی استعداد اور دلچسپیوں کو ملحوظ رکھا جائے تا کہ بچوں کے لیے جاذب توجہ بھی ہوں اور قابل فہم بھی۔ ان سے بات بھی بخوبی سمجھ میں آ جائے گی اور یادداشت میں بآسانی محفوظ ہو جائے گی۔

☆ جس چیز کی وضاحت کے لیے استعمال کی جا رہی ہے اس سے براہِ راست متعلق ہو اور حتی الامکان صرف ان تفصیلات پر مشتمل ہو جن کی واقعی ضرورت ہے غیر متعلق یا غیر ضروری تفصیلات سے بات واضح ہونے کے بجائے اور گنجلک ہو جاتی ہے۔

☆ درجے کے سامنے سلیقے سے پیش کی جائیں تا کہ ہر بچہ بخوبی دیکھ سکے۔ قابل توجہ پہلوؤں کی طرف مناسب سوالات یا ہدایات کے ذریعہ متوجہ کیا جائے تا کہ ضروری امور مشاہدے سے نہ رہ جائیں۔

☆ توضیحات کے ضمن میں بچوں کو جتنے زیادہ سے زیادہ حواس سے کام لینے کا موقع دیا جا سکے اتنا ہی مفید ہوتا ہے۔ مثلاً دیکھنے، چھونے، سونگھنے، چکھنے، آواز نکلتی ہو تو سننے کے مواقع۔ اس طرح زیادہ صحیح اور واضح تصور بن سکے گا۔

☆ ابتدائی درجات میں اصل اشیاء یا ان کے ماڈل دکھلائے جائیں پھر بتدریج، تصاویر، نقشہ جات اور گراف وغیرہ سے کام چلایا جائے۔

☆ تمام توضیحی سامان ایک ساتھ بچوں کے سامنے نہیں لانا چاہیے بلکہ آڑ میں رکھنا چاہیے اور حسب موقع و ضرورت ایک ایک کو درجے کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ ورنہ بچوں کی توجہ بھٹکتی ہے اور تجسس ختم ہو جانے کے بعد وہ کشش بھی باقی نہیں رہتی جو دکھلاتے وقت مطلوب ہے۔

☆ بچوں کے سامنے پیش کر کے فوراً ہٹا نہ لیا جائے بلکہ اتنی دیر سامنے رکھا جائے کہ انہیں تسکین

ہو جائے اور ضروری امور کا وہ بخوبی مشاہدہ کرلیں۔

☆ ہر مدرسے کو نقشہ جات، گلوب، ماڈل، البم مختلف قسم کے پوسٹرز، تصاویر، چارٹ وغیرہ زیادہ سے زیادہ اکٹھا اور تیار کرنا چاہیے تاکہ تدریس کو موثر اور دلچسپ بنانے میں اساتذہ ان سے مدد لے سکیں۔ آج کل اس طرح کی متعدد فرمیں کام کر رہی ہیں جن کے یہاں سے طرح طرح کے تعلیمی سامان بکفایت حاصل ہو سکتے ہیں۔

۶۔ تعلیمی سیر وسیاحت اور پکنک:

سماجی اور فطری ماحول سے متعلق متعدد ایسے عنوانات شامل نصاب ہوتے ہیں جن کے بارے میں واضح تصورات نہ تو کتابوں کے ذریعے ممکن ہیں اور نہ درجے میں بٹھا کر روایتی تدریس سے، بلکہ بچوں کو خود موقع پر لے جا کر غائر مشاہدہ کرانے ہی سے صحیح معلومات بہم پہنچائی جا سکتی ہیں۔ مثلاً کارخانوں، منڈیوں، ندی، نالوں، فصلوں اور فطری مناظر وغیرہ کے متعلق۔ اسی طرح متعدد ایسے اجتماعی، انفرادی ومعاشرتی اوصاف ہیں جن کی تربیت کے فطری مواقع درجے میں ہاتھ نہیں آتے بلکہ ان کے لیے باہر نکلنا ضروری ہوتا ہے۔

روایتی تدریس سے جہاں بچے عموماً گھبراتے اور چھٹیوں کا بے چینی سے انتظار کرتے رہتے ہیں سیر وتفریح میں انہیں بڑا مزہ آتا ہے وہ پوری دلچسپی اور گہرے انہماک سے ان میں شریک ہوتے ہیں اور اس ضمن کی متعدد مشکلات اور پریشانیوں کو بخوشی جھیل لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تعلیم وتربیت کے ایسے مفید وموثر ذرائع سے فائدہ اٹھانے کی امکانی کوشش ضرور کرنی چاہیے۔

تعلیمی سیاحتوں میں تعلیمی مقصد مقدم ہونا چاہیے اور پکنک میں تربیتی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ درجے کی فضا یہاں بھی طاری رہے بلکہ جائز حدود میں بچوں کو آزادی دلچسپی اور تفریح کی پوری گنجائش دی جائے۔

تعلیمی اغراض کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کا مشاہدہ کرانا مقصود ہے، بچے اس کا بخوبی

مشاہدہ کر سکیں۔ ان کی قوت مشاہدہ کی تربیت ہو، ان کے تصورات واضح ہوں، معلومات میں اضافہ ہو، سبق کا مقصد بحسن وخوبی پورا ہو، فطری وسماجی ماحول اور ان کی اشیاء کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے کا ذوق ابھر آئے۔

تربیتی اغراض سے مراد یہ ہے کہ بچے چلنے پھرنے، کھانے پینے، ملنے جلنے کے آداب سیکھیں۔ سفر اور اس کے انتظامات کا تجربہ حاصل کریں۔ مل بانٹ کر کھائیں پئیں، ایک دوسرے کی مدد کریں، گھر کے باہر کی محنت ومشقت کی زندگی کا تجربہ ہو اور سفر میں کھانے پینے، نماز اور آرام وغیرہ سے متعلق ضروری انتظامات کے لیے راہ پیدا کرنے کا انہیں سلیقہ آئے۔

ابتدائی درجات میں یہ پروگرام بہت لمبے نہ ہونے چاہئیں۔ چھوٹے بچوں کے لیے عام طور پر گھنٹے دو گھنٹے کے اور مدرسے یا آبادی کے قریب ہی، بڑے بچوں کے لیے عموماً تین چار گھنٹے اور قدرے فاصلے پر اس طرح کے مختصر پروگرام وقفے سے متصل گھنٹوں یا آخری گھنٹوں میں ہو سکتے ہیں۔ البتہ کبھی کبھی دن بھر کا پروگرام ہونا چاہیے تاکہ تعلیمی وتربیتی دونوں اغراض حاصل ہو سکیں۔ اس طرح کا پروگرام ہونا چاہیے تاکہ تعلیمی وتربیتی دونوں اغراض حاصل ہو سکیں۔ اس طرح کے پروگرام ہفتے کے آخری دن یا چھٹیوں میں مناسب ہوتے ہیں تاکہ واپسی پر آرام کا کچھ موقع مل سکے۔

قابل لحاظ امور:

ان سیاحتوں سے پورا فائدہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا جائے۔

☆ طلبہ کی تعداد اتنی ہو کہ سنبھالنے میں زیادہ دشواری نہ ہو۔

☆ روانگی سے قبل سیاحت کی غرض بچوں پر اچھی طرح واضح کر دی جائے۔

☆ سفر کا پورا خاکہ ان کے مشورے سے مرتب کیا جائے۔ ضروری سامان کی فہرست تیار کر لی جائے اور ان کی فراہمی نیز نگرانی کا کام طلبہ کی ٹولیوں سے انجام دلایا جائے۔

☆ جس جگہ لے جانا ہو مدرس ایک بار وہاں جا کر تفصیلی معلومات خود حاصل کر آئے۔

☆ کم سے کم وقت اور کم سے کم پیسہ خرچ کیا جائے تا کہ یہ سیاحتیں تعلیم میں حارج یا جیب پر بار نہ ہوں۔

☆ سارے کام حتی الامکان بچوں ہی سے انجام دلائے جائیں۔

☆ جائز حدود میں بچوں کو پوری آزادی دی جائے۔

۶۔ دیگر امدادی سامان

مندرجہ بالا اشیاء کے علاوہ اگر استطاعت ہو تو مندرجہ ذیل اشیاء سے بھی تدریس کو موثر اور دلچسپ بنانے میں بڑی مدد مل سکتی ہے اور طلبہ کو متعدد نئی معلومات ان کی مدد سے بآسانی بہم پہنچائی جاسکتی ہیں۔

☆ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ وہ پروگرام جو بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے نشر ہوتے ہیں۔

☆ گراموفون کے وہ ریکارڈ جو تلفظ وغیرہ سکھانے کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔

☆ ٹیپ ریکارڈنگ مشین کی مدد سے فراہم کیا جانے والا مواد۔

☆ میجک لینٹروں کے ذریعے دکھائی جانے والی تصاویر اور مناظر۔

☆ بچگانی فلمیں جو تعلیم وتربیت کے لیے تیار کی جاتی ہیں۔

☆ ویو باسٹر کی مدد سے پیش کی جانے والی تصاویر اور مناظر۔

☆ رسائل واخبارات جو بچوں ہی کے لیے نکلتے ہیں۔

۷۔ ہوم ورک

لکھنے پڑھنے یا عملی واخلاقی تربیت سے متعلق وہ کام جو طلبہ کو گھر پر کرنے کے لیے دیا جاتا ہے، ہوم ورک کہلاتا ہے۔

بچوں میں اپنے قد کے لحاظ سے کافی توانائی ہوتی ہے وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی مصروفیت

جاتے ہیں۔ چونکہ مدرسے میں وہ صرف چند گھنٹے گزارتے ہیں۔ گھریلو ذمہ داریاں بھی ان پر برائے نام ہی ڈالی جاتی ہیں۔ اس لیے ان کے پاس فاضل توانائی بھی ہوتی ہے اور فرصت کے لمحات بھی۔ لیکن مناسب رہنمائی اور مفید مصروفیات نہ ہونے کی صورت میں اکثر ان کی قوتیں غلط رخ پر پڑ جاتی اور بیش قیمت لمحات فضول اور مضر کاموں میں ضائع ہونے لگتے ہیں۔ بچوں کی فاضل توانائی اور فرصت کے اوقات کو کارآمد بنانے اور مفید کاموں میں لگانے کے لیے ہوم ورک نہایت ضروری ہے۔

ہوم ورک دینے کا عام طور پر جو رواج چلا آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ لکھنے پڑھنے، الفاظ معنی یاد کرنے، انشاء وترجمہ اور قواعد کی مشقیں یا ریاضی کے سوالات حل کرنے کا جو خشک کام دن بھر مدرسے میں ہوتا ہے اس کا باقی ماندہ حصہ گھر سے پورا کر کے لانے کے لیے دے دیا جاتا ہے۔ اسے مکمل کرانے کی ذمہ داری سرپرست کی سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ طلبہ بڑے سعادت مند کہلاتے ہیں جو بروقت کام کرلاتے ہیں اور وہ سرپرست بہت اچھے سمجھے جاتے ہیں جو اس ضمن میں پورا تعاون کرتے ہیں خواہ اس کے لیے انہیں ٹیوٹر ہی کیوں نہ رکھنا پڑے۔ اس کے برعکس ان طلبہ کو سزا کا مستحق سمجھا جاتا ہے جو ہوم ورک پورا نہیں کرتے اور ان سرپرستوں کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے جو کام پورا کرنے کا معقول بندوبست نہیں کرتے۔ ہوم ورک کے اس روایتی انداز میں متعدد خرابیاں ہیں۔ اس لیے اس پر سخت تنقید کی جاتی ہے۔ مثلاً:

☆ بچوں پر کام کا بہت زیادہ بار پڑ جاتا ہے۔ جس سے ان کی صحت متاثر ہوتی ہے۔

☆ جو کام بچے دن بھر اسکولوں میں کرتے ہیں اور جن سے وہ اکتا چکے ہوتے ہیں، وہی کام جب ان پر لاد دیا جاتا ہے تو وہ اسے بیگار سمجھتے ہیں اور اسے خوشی سے کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ ہوم ورک پورا کرنے کے لیے انہیں اکثر سزا دینی پڑتی ہے جس کے نتیجے میں بچے تعلیم ہی سے بھاگنے لگتے ہیں۔

☆ آزادی کے ساتھ اپنی دلچسپی کے مشاغل ومصروفیات میں حصہ لینے کا بچوں کو وقت ہی نہیں

ملتا۔

☆ بچوں کی گھریلو زندگی تباہ ہو جاتی ہے وہ بہن بھائیوں کے ساتھ کھیلنے کودنے اور پیار و محبت سے رہنے سہنے، گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے، والدین کی خدمت کرنے اور معاشرتی روابط قائم کرنے کے لیے وقت ہی نہیں پاتے حالانکہ یہ تمام چیزیں بھی ان کی تعلیم وتربیت کے لیے نہایت ضروری ہیں۔

☆ کتنے بچے ایسے ہوتے ہیں جن کے گھریلو حالات اس طرح کے کاموں کی اجازت نہیں دیتے یا وہ اپنے طور پر کر ہی نہیں سکتے۔ وہ سزا کے ڈر سے دوسروں کی نقل کرنے اور معلم کو دھوکا دینے کی عادت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

☆ معلم اپنی ذمہ داری سے بچتے، کتراتے اور اسے زبردستی سرپرستوں پر ڈالتے ہیں اور اس ضمن میں طلبہ کو پریشان کرتے ہیں۔

اہمیت وافادیت:

لیکن یہ اعتراضات دراصل ہوم ورک کی نوعیت، مقدار اور اس ضمن میں معلم کے رویے پر ہیں۔ اگر ان کا ازالہ ہو جائے تو ہوم ورک کی اہمیت وافادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ہوم ورک اگر سلیقے سے دیا جائے اور ہمدردی سے جانچا جائے تو یہ تعلیم کا بہت ہی موثر ذریعہ ہے اور اس سے مندرجہ ذیل فوائد متوقع ہیں۔

☆ بچے فرصت کے اوقات کو آوارہ گردی یا شرارت میں ضائع کرنے کے بجائے گھر ہی پر مفید کاموں میں صرف کرتے ہیں۔

☆ کسی کی مدد یا مداخلت کے بغیر خود خاکہ بنا کر کام انجام دینے کا انہیں سلیقہ آتا ہے اور آزاد مطالعہ کی عادت پڑتی ہے۔

☆ درجے میں کیے ہوئے کاموں میں مشق و مہارت حاصل کرنے اور پڑھے ہوئے مواد کو

برتنے یا اس کا اعادہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔

☆ غیر نصابی مصروفیات ومشاغل جو اب نصاب ہی کا اہم جز شمار ہوتے ہیں ان کی تکمیل میں مدد ملتی ہے۔ نیز جس مضمون یا مشغلے سے انہیں زیادہ لگاؤ ہوتا ہے، اس پر مزید توجہ صرف کرنے کا موقع ہاتھ آتا ہے۔

☆ بعض ایسے کام جو بچے اپنے طور پر کر سکتے ہیں، ان میں معلم کا وقت ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے۔ چنانچہ وہ اس بچے ہوئے وقت کو تدریس کے دوسرے ضروری کاموں پر صرف کر سکتا ہے۔

☆ نصاب تعلیم جو معاشرے کی پیچیدگی اور وسعت میں اضافہ کے ساتھ دن بدن پھیلتا جا رہا ہے اس کی تکمیل ہوم ورک کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

☆ سرپرستوں کو اپنے بچوں کی رفتار ترقی کا اندازہ ہو سکے گا اور وہ معلم کے تعاون اور مشورے سے مناسب اقدام کر سکیں گے۔ اس طرح ہوم ورک سرپرستوں سے روابط کے قیام اور گھر اور مدرسے میں تعاون کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

☆ بچوں میں خود اعتمادی پیدا ہوگی اور وہ اپنی معلومات نیز مشق ومہارت میں اضافے کے لیے پابندی سے محنت ومشقت کرنے کے عادی بنیں گے۔

☆ ہوم ورک کے ذریعے طلبہ میں بعض ایسے مستقل ذوق پروان چڑھائے جا سکتے ہیں جن سے ان کے لمحات فرصت زندگی بھر مفید کاموں میں صرف ہو سکیں۔

قابل لحاظ امور:

ہوم ورک دینے میں بچوں کی عمر، ان کی ذہنی وجسمانی حالت ان کے گھریلو حالات، ان کی صلاحیت واستعداد اور ان کی دلچسپیاں پیش نظر رہنی چاہئیں۔ بچوں کے کھانے کھیلنے کے دن ہوتے ہیں انہیں اس کے پورے مواقع ملنے چاہئیں۔ چھ سات سال کی عمر تک تو انہیں کوئی ہوم ورک نہ دینا چاہیے۔ دس سال کی عمر تک بھی جو کچھ درجے میں ہو جائے اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

البتہ مدرسے کے عجائب گھر کے لیے پھول پتیاں، چڑیوں کے پر، پھلوں کے بیج، گھونگھے، شیشے اور چینی کے خوبصورت ٹکڑے، ٹکٹ، تصویریں وغیرہ جمع کرنے، مشاہدات ومعلومات میں اضافہ کے لیے منظم پروگرام کے تحت سیر پر جانے، پھول بوٹے لگانے، کبوتر، بکری، خرگوش وغیرہ پالنے، کوئی ماڈل یا کسی چیز کی ڈرائنگ بنانے، گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے، والدین کی خدمت، غریبوں معذوروں کی امداد، چھوٹے بھائی بہنوں کو بہلانے، مسجد کی صفائی وغیرہ کے کام دیئے جاسکتے ہیں یا پڑھنے کے لیے آسان زبان میں لکھی ہوئی دلچسپ مصور کہانیاں، مشاہیر کے کارنامے، مہمات وسفرنامے اور آسان نظموں کے مجموعے وغیرہ دیئے جائیں۔ بعد کے درجات میں بھی طلبہ کی انفرادی دلچسپی، استعداد، گھریلو حالات اور گھر میں بچے کی ذمہ داریوں، والدین کی مصروفیات، علالت معاشی حالت وغیرہ کا پورا لحاظ رکھنا چاہیے اور اتنا ہی کام دینا چاہیے جتنا دوسروں کی مدد کے بغیر محدود وقت میں خود بآسانی انجام دے سکتے ہوں۔

☆ مختلف مضامین کے اساتذہ کو مل کر ہوم ورک کا ایسا نظام الاوقات مرتب کرنا چاہیے جس سے ان کے دیئے ہوئے کاموں میں ہم آہنگی رہے، بچوں پر کام کا بار بھی نہ ہونے پائے اور ہر معلم اپنی باری پر ضروری ہوم ورک دے سکے۔ صدر مدرس کو اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے ورنہ ہر معلم اپنے ہی مضمون کا زیادہ سے زیادہ کام لینا چاہتا ہے اور بچے بلاوجہ پستے ہیں۔ نظام الاوقات کے ذریعہ پابند کردیا جائے کہ کوئی معلم محدود اور متعین وقت سے زیادہ کام نہ لے۔

☆ تعطیلات اس لیے ملتی ہیں کہ بچے مدرسے کے فکروں سے آزاد کچھ دوسری نوعیت کی سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں، لیکن اساتذہ عموماً تعطیلات میں بھی علمی انداز ہی کا بہت سا ہوم ورک دے دیتے ہیں جو بچوں کی طبیعت پر بار بھی ہوتا ہے اور دیگر دلچسپ اور ضروری مصروفیات کے باعث وہ کر بھی نہیں پاتے اور بلاوجہ سزا کے مستحق ہوتے ہیں۔ تعطیلات بچوں کی صحت وصفائی، جسمانی، اخلاقی، مذہبی ومعاشرتی تربیت کے لیے بہت مناسب

مواقع فراہم کرتی ہیں۔اس لیے ہوم ورک ان سرگرمیوں سے مناسبت رکھنے والا اور ایسا ہونا چاہیے جس میں گھر کے دوسرے افراد بھی دلچسپی لے سکیں۔

☆ خفگی کے موڈ میں یا سزا کے طور پر ہوم ورک ہرگز نہ دیا جائے اور نہ اس انداز سے کہ بچے اسے بہت ہی مشکل اور نا قابل حل شمار کرنے لگیں بلکہ انہیں آمادہ کرلیا جائے اور دیتے وقت یہ یقین دلایا جائے کہ تھوڑی سی جدوجہد سے وہ اسے حل کر لے جائیں گے اور کام ہونا بھی اس معیار کا چاہیے کہ بچے کوشش کر کے خود پورا کر سکیں۔اس طرح مزید کام کے لیے ہمت بندھتی ہے۔اگر کام اتنا مشکل ہو کہ باوجود کوشش وہ حل ہی نہ کر سکیں تو مایوسی طاری ہوگی اور مزید کام کے لیے ان کی طبیعت آمادہ نہ ہوگی۔

☆ جو کام بھی دیا جائے اس کے بارے میں یہ یقین کرلیا جائے کہ اس سے بچوں کے فرصت کے اوقات کو ان کی تعلیم وتربیت کے لیے کارآمد بنانے میں مدد ملے گی اور اپنے طور پر مطالعہ یا کسی اور مفید مشغلہ میں لمحات فرصت صرف کرنے کے عادی بنیں گے۔

☆ اصول سمجھانے اور اس کا استعمال بتانے نیز ابتدائی مشق کرانے کا کام درجے میں کرا لیا جائے پھر مزید مشق ومہارت کے لیے ایسا کام دیا جا سکتا ہے جس کو بچے اپنے طور پر محنت کر کے حل کر سکتے ہوں۔

☆ ہوم ورک کی بروقت جانچ اور اصلاح ہونی چاہیے ورنہ بچوں کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا اور ان میں ڈھیل پیدا ہوگی۔

تحریری کام کی جانچ اور اصلاح:

بچوں سے درجے میں یا گھر پر جو تحریری کام بھی لیا جائے۔اس کی اصلاح اگرچہ مشکل کام ہے لیکن ہے نہایت ضروری کیونکہ اسی طرح بچے اپنی غلطیوں سے واقف ہو کر اپنی اصلاح کر سکیں گے۔اس ضمن میں مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہیں۔

☆ کام کی تکمیل کے بعد جلد از جلد اصلاح کر دی جائے۔ اصلاح اگر رہنمائی کر کے خود بچے کے ذریعے کرائی جا سکے تو بہت اچھا ہو ورنہ حتی الامکان اس کے سامنے ہونی چاہیے۔ اس طرح بچے کی سمجھ میں اپنی غلطی بخوبی آ جائے گی اور اس سے بآسانی چھٹکارا پا سکے گا۔

☆ تحریری کام سے قبل زبانی مشق کرا لی جائے تو غلطیاں کم ہوں گی اور اصلاح میں زیادہ دشواری نہ ہوگی۔

☆ مشترک غلطیوں کی اصلاح اجتماعی طور پر ہونی چاہیے تاکہ وہی بات ہر ایک کو علیحدہ نہ سمجھانی پڑے۔

☆ اچھے کام پر موزوں ریمارک اور ناقص پر ضروری ہدایات دی جائیں اس سے آگے کے کام میں مدد ملے گی۔

۸۔ درسی کتب

تدریس کے کام میں موزوں درسی کتب کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ان کی وجہ سے معلم کا کام بہت آسان ہو جاتا ہے کیونکہ اسے اسباق کے لیے بہت زیادہ نوٹ لینے اور مشقیں تیار کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ کم صلاحیت کے اساتذہ بھی ان کی مدد سے کام چلا لیتے ہیں۔ مشق و اعادہ کے لیے طلبہ کے پاس درسی کتب کی شکل میں پورا مواد ہر وقت موجود رہتا ہے۔

موزوں کتب کا انتخاب:

بازار میں درسی کتب تو طرح طرح کی ملتی ہیں لیکن مختلف حیثیتوں سے موزوں ان میں بہت کم ہی ہوتی ہیں۔ بچوں کے لیے وہی کتب منتخب کی جائیں جو:

☆ تعصب و تنگ نظری اور کفر و شرک سے پاک ہوں۔

☆ جن سے اعلیٰ نصب العین اور پاکیزہ نظریۂ حیات بنانے، سیرت کو سنوارنے اور خیالات کو بلند کرنے میں مدد ملے۔

☆ جن کی زبان سلیس و بامحاورہ، طرزِ بیان شگفتہ اور بچوں کے لیے دلچسپ اور قابلِ فہم ہو۔

☆ جو بچوں کی عمر، نفسی کیفیات، میلانات ورجحانات اور فطری دلچسپیوں کو ملحوظ رکھ کر لکھی گئی ہوں۔
☆ جن کا کاغذ مضبوط، ٹائٹل جاذب نظر، طباعت صاف اور صحیح، حروف واضح اور جلی، کم قیمت اور سائز وحجم اتنا ہو کہ بچوں کو مدرسہ لانے لے جانے میں زحمت نہ ہو اور جو آسانی سے دستیاب ہو سکیں۔
☆ جو نصاب میں منظور شدہ عنوانات پر حتی الامکان حاوی ہوں تاکہ باہر سے مدد لینے کی کم ہی ضرورت پڑے۔
☆ جو خوش رنگ مناظر اور ضروری شکلوں اور خاکوں وغیرہ سے مزین ہوں۔
☆ جو موزوں مشقوں اور طریق تعلیم وغیرہ سے متعلق ضروری ہدایات سے بھرپور ہوں۔
☆ جن کی تیاری میں حالات وضروریات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہو اور جن کا مواد بچوں کے تجربات ومشاہدات اور روزمرہ زندگی سے متعلق اور مربوط کر کے پیش کیا گیا ہو۔
☆ جن کے اسباق بچوں کا تجسس ابھارنے، انہیں پڑھنے پر آمادہ کرنے، ان کی توجہ کو کھینچنے اور ان کی دلچسپی کو برقرار رکھنے میں معاون ہوں۔

درسی کتب کا استعمال:

☆ صرف درسی کتب پڑھا دینے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ضروری معلومات اپنی طرف سے بھی فراہم کی جائیں۔
☆ ہر کتاب کے تمام اسباق یکساں ضروری اور مفید نہیں ہوتے اس لیے پوری کتاب سبقاً سبقاً پڑھانے اور رٹوانے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ بعض خود سمجھ میں آنے والے، غیر ضروری یا کم مفید اسباق حذف کر کے ان کی جگہ علیحدہ سے ضروری مواد فراہم کیا جائے اور بعض آسان اسباق کا کچھ جز پڑھا کر باقی طلبہ پر چھوڑ دیا جائے۔

☆ مشقیں اور طریق تعلیم سے متعلق ہدایات عموماً درسی کتب کی جان ہوتی ہیں۔ لیکن بہت کم اساتذہ ان سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور بعض تو انہیں بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ ان سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے اور انہیں زبانی یا تحریری طور پر حل کرانے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

☆ پڑھاتے وقت اپنی طرف سے بھی سوالات اور مشقیں دے کر بچوں کو طبع آزمائی کا موقع دینا چاہیے۔

☆ کوشش کی جائے کہ کم سے کم درسی کتب سے کام چل جائے۔

☆ جغرافیہ، عام سائنس اور دیگر معلوماتی مضامین کی تدریس میں درسی کتب کے ساتھ مشاہدہ اور تجربہ پر پوری توجہ دی جائے۔

۹۔ لائبریری اور دار المطالعہ

درسی کتب خواہ کتنی ہی معیاری اور مفید ہوں، بچوں کی معلومات میں وسعت، ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ، مطالعہ کی سکت، کتب بینی کا ذوق، خیالات کی بلندی، آدرش کی لگن، اظہار خیال پر قدرت، دوسروں کے خیالات ونظریات سمجھنے کی صلاحیت اور فرصت کے اوقات کے مناسب استعمال کے لیے مزید موزوں کتب اخبارات ورسائل وغیرہ کا مطالعہ ضروری ہے۔

خود اساتذہ کو بھی اپنی تدریسی صلاحیت بڑھانے، اپنی معلومات کو اپ ٹو ڈیٹ رکھنے، توضیح وتشریح میں مدد لینے نیز حوالہ جات کے لیے کتب ورسائل کی ضرورت پڑتی ہے۔ ظاہر ہے طلبہ اور اساتذہ کی ان ضروریات کی تکمیل کے لیے ہر مدرسے کی اپنی لائبریری ہونی چاہیے۔ لائبریری میں اساتذہ اور ہر عمر، ذوق اور صلاحیت کے بچوں کے لیے مفید اور ضروری کتب کا ذخیرہ ہو، جس میں سال بسال اپنی بساط کے مطابق نئی کتب کا اضافہ ہوتا رہے۔ لائبریری کے ساتھ ایک دار المطالعہ بھی ضروری ہے جس میں بچوں اور بڑوں کی دلچسپی کے اچھے اخبارات ورسائل رکھے

جائیں۔ اگر وسائل محدود ہوں تو کتب اور رسائل کی فراہمی میں پبلک سے تعاون بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جو صاحب ذوق اخبارات ورسائل منگاتے ہیں یا کتابیں خریدتے ہیں ان سے یہ چیزیں مدرسے کے لیے عاریتاً لی جاسکتی ہیں یا ان میں سے جو چیزیں پڑھنے کے بعد عموماً بے کار ہو جاتی ہیں اور وہ ادھر ادھر ڈال دیتے ہیں، انہیں مدرسہ مستقلاً حاصل کر سکتا ہے۔ بعض گھروں میں پرانی معیاری کتب کا ذخیرہ پڑا پڑا دیمکوں کی نذر ہو جاتا ہے یا بچوں کی پڑھی ہوئی کتابیں ماری ماری پھرتی ہیں اگر فکر کی جائے تو مفت یا کم داموں پر مدرسے کے لیے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اخبارات ورسائل اور کتابوں کے ناشرین یوں بھی اسکولوں اور لائبریریوں کے لیے خصوصی رعایت کرتے ہیں اس سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ بحالت مجبوری اگر فیس یا فنڈ کا انتظام کرنا پڑے تو بھی لائبریری کی ضرورت وافادیت کے پیش نظر اس سے گریز نہ کرنا چاہیے۔

انتخاب:

طباعت کی سہولت اور تعلیم کی توسیع کے باعث بری بھلی ہر طرح کی کتابیں چھپتی اور مفید ومضر ہر طرح کے اخبارات ورسائل شائع ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے انتخاب میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ مدرسے میں وہی چیزیں آنی چاہئیں جو پاکیزہ، معیاری اور مفید ہوں۔ ان کا انتخاب کسی ایک فرد پر نہیں ڈالنا چاہیے بلکہ مطالعہ کا ذوق اور انتخاب کی صلاحیت رکھنے والے مختلف اساتذہ کے مشورہ سے ہونا چاہیے، انتخاب میں مختلف عمر، ذوق اور صلاحیت کے طلبہ کی دلچسپیاں اور ضروریات نیز مختلف مضامین پیش نظر رہنے چاہئیں۔ بڑے بڑے مکتبوں یا پبلشروں کی طرف سے سال بہ سال کتابوں کی مفصل فہرست شائع ہوتی ہے، انتخاب میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے۔

لائبریری میں سبق آموز قصے کہانیوں اور پاکیزہ افسانوں اور نظموں کے مجموعے، تاریخی واصلاحی ناول اور ڈرامے، انبیاء وصلحائے امت کی سیرتیں، مشاہیر کے کارنامے، ایجادات واکتشافات کی داستانیں، سیاحوں کے سفرنامے، اسلامیات، ادب، جغرافیہ، تاریخ، عام سائنس،

معلومات عامہ،صنعت وحرفت وغیرہ چھوٹی بڑی مختلف معیار کی کتابیں ہونی چاہئیں۔اساتذہ کے لیے مختلف زبانوں کی لغات،حوالہ جاتی کتب،بچوں کی نفسیات اور تعلیم پر کتابیں،انسائیکلو پیڈیا (دائرۃ المعارف یا مخزن العلوم) وغیرہ فراہم کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔

سات آٹھ سال تک کی عمر کے بچے چونکہ روانی کے ساتھ پڑھ اور سمجھ نہیں سکتے اس لیے ان کے واسطے تصویروں کی کتابیں یا آسان زبان اور موٹے خط میں چھپی ہوئی دلچسپ مختصر کہانیوں اور چھوٹی بحر میں بیانیہ نظموں کی ایسی کتابیں موزوں رہتی ہیں جن میں کافی تصویریں ہوں۔تصویریں حتی الامکان بڑی اور خوش رنگ ہونی چاہئیں۔

آٹھ نو سال سے گیارہ بارہ سال تک کے بچوں کے لیے قصے کہانیوں، ایجادات واختراعات،سیر وشکار وغیرہ سے متعلق واقعات پر مشتمل آسان، دلچسپ اور مصور کتابیں اور سفرنامے وغیرہ مناسب ہوتے ہیں۔

بارہ تیرہ سال سے سترہ اٹھارہ سال کی عمر تک کے طلبہ مہماتی داستانوں، مشاہیر کے کارناموں،بلند کردار شخصیتوں کے سوانح،پاکیزہ افسانوں،تاریخی واصلاحی ناولوں،جوشیلی نظموں اور جذبات لطیف کی نشوونما کے لیے ادب کے پاکیزہ شہ پاروں سے پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کتب کے انتخابات میں ان سب کے ذوق کی رعایت رکھنی چاہیے۔

قابل لحاظ امور:

☆ لائبریری اور دارالمطالعے کے لیے ایک کمرہ مخصوص ہونا چاہیے جس میں کتابوں کی حفاظت،ترتیب اور سلیقے سے رکھنے کے لیے الماریاں ہونی چاہئیں اور جس کی دیواریں مقولوں اور خوش رنگ پوسٹروں سے آراستہ کی جانی چاہئیں۔

☆ کتابوں کے شوقین کسی ایسے استاد کو لائبریرین بنانا چاہیے جو اس ضمن میں کافی وقت دے سکے اور کتابوں کو حفاظت،ترتیب اور سلیقے سے رکھنا جانتا ہو۔

☆ لائبریرین کو چاہیے کہ وہ ہر کتاب کے بارے میں علم رکھے کہ وہ کہاں ہے؟ کس مضمون سے متعلق ہے اور کن کے لیے مفید ہے۔ کتب کے اجرا کے لیے ہر درجے کا دن اور وقت مقرر کردے۔ بچے جب کتاب لینے آئیں تو خوش اخلاقی سے پیش آئے اور ان کی عمر، لیاقت، پسند اور ضرورت کے مطابق موزوں کتب کی نشاندہی کرے۔

☆ بچوں کی تربیت کی جائے کہ وہ لائبریری کی کتابوں کو امانت سمجھیں، حفاظت سے رکھیں، گندہ ہونے، مڑنے اور پھٹنے سے بچائیں اور مقررہ وقت کے اندر واپس کر جائیں۔

☆ بچوں میں کتب بینی کا ذوق پیدا کرنا کلاس ٹیچر کی ذمہ داری ہے۔ مناسب یہ ہے کہ ہر درجے کے معیار کی کچھ کتابیں منتخب کر کے درجوں میں بھی رکھوائی جائیں تاکہ ان کی مدد سے کلاس ٹیچر حضرات طلبہ میں خارجی مطالعہ کا ذوق بھی پیدا کر سکیں اور حسب ضرورت وخواہش طلبہ کو ہر وقت کتابیں بھی مل سکیں۔ کلاس ٹیچر حضرات کو چاہیے کہ وہ درجے میں کبھی کبھی اچھی کتابوں کا تذکرہ کیا کریں، ان کے اقتباسات پڑھ کر سنائیں۔ ان کے مطالعے کی ضرورت واہمیت واضح کریں اور طلبہ کو اپنے ساتھ لائبریری لے جا کر کتابیں دیکھنے اور پسندیدہ کتابیں حاصل کرنے میں مدد اور رہنمائی کریں۔ جو کتابیں طلبہ کو زیادہ پسند ہوں ان کے کئی نسخے ہونے چاہئیں تاکہ بیک وقت کئی بچے فائدہ اٹھا سکیں۔ ہر بچے نے تعلیمی سال کے دوران میں کتنی کتابیں پڑھیں اس کا ریکارڈ رکھنا اور مسابقت ومقابلے کی اسپرٹ پیدا کرنا بھی مطالعہ کا اچھا محرک ہے۔

☆ لائبریری سے کتابیں حاصل کرنے میں ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جا ہیے۔ البتہ حوالہ جاتی کتب، لغات یا نایاب اور قیمتی کتابیں کسی کو گھر لے جانے کی اجازت نہ دینی چاہیے۔

☆ رسالوں کی فائل رکھنے کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ جب ضرورت ہو ان کے مفید مضامین سے استفادہ کیا جا سکے۔

۱۰۔ امتحانات، جائزے اور ترقیاں

مدرسے کے بنیادی فرائض میں سے ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ وقتاً فوقتاً طلبہ کی لیاقت وصلاحیت کی جانچ کی جائے اوران کی رفتارترقی کا جائزہ لیا جاتا رہے تاکہ:

- ☆ اساتذہ کواپنی کوششوں کے اثرات کا اندازہ ہو سکے اور وہ حسب ضرورت نظام الاوقات، رفتارکاراورطریق تعلیم میں مناسب تبدیلی کر سکیں۔
- ☆ طلبہ کواپنی محنت وتوجہ اور لیاقت وصلاحیت کے متعلق ٹھیک رائے قائم کرنے میں مدد ملے۔
- ☆ والدین کواپنے بچوں کی رفتارترقی کا اندازہ ہوتا رہے۔
- ☆ ذمہ داران ادارہ کواساتذہ کی کارکردگی اوران کی کوششوں کے نتائج کا علم ہو سکے۔
- ☆ طلبہ اور اساتذہ دونوں کومحنت کی ترغیب اور سابقہ کام کے اعادہ اور جانچ کا برابر موقع ملتا رہے۔
- ☆ جماعت بندی کرنے، ترقی دینے یا آئندہ تعلیم کے سلسلے میں مناسب رہنمائی ہو سکے۔
- ☆ طلبہ کا مقام اور حیثیت متعین کرنے نیز آئندہ انہیں کوئی ذمہ داری سپرد کرنے کے لیے سماج کوسندات کی شکل میں کوئی کسوٹی فراہم ہو سکے۔

امتحانات:

جانچ اور جائزے کے لیے مدتوں سے امتحانات کا طریقہ رائج ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، امتحانات میں طلبہ کودور دور بٹھا کرانہیں سوالات کا پرچہ دے دیا جاتا ہے۔ مقررہ وقت (عموماً تین گھنٹے) میں ان سے ان سوالات کا جواب لکھوایا جاتا ہے، اس دوران طلبہ کی اچھی طرح نگرانی کی جاتی ہے۔ وقت ختم ہونے پر کاپیاں لے کرممتحن کے حوالے کردی جاتی ہیں۔ وہ انہیں جانچ کرنمبر دیتا ہے۔ انہی نمبروں کی بنیاد پرکامیابی یاناکامی کا فیصلہ کردیا جاتا ہے۔ یہ امتحانات عموماً دوطرح کے ہوتے ہیں۔

۱۔ داخلی یا اندرونی۔

۲۔ خارجی یا بیرونی۔

۱۔ **داخلی یا اندرونی:** وہ امتحانات ہیں جن کا سارا انتظام ادارہ اپنے طور پر خود کرتا ہے۔ ان میں پرچہ بنانے، کاپیاں جانچنے اور کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کرنے کا سارا اختیار اساتذہ کو ہوتا ہے۔ یہ امتحانات عموماً ششماہی اور سالانہ ہوتے ہیں لیکن بعض اداروں میں ماہانہ اور سہ ماہی بھی لیے جاتے ہیں۔

۲۔ **بیرونی یا خارجی:** وہ مخصوص امتحانات جو کسی امتحانی بورڈ کے زیر اہتمام ہوتے ہیں۔ ان میں پرچہ جات بنانے کاپیاں جانچنے اور کامیابی و ناکامی کا فیصلہ کرنے کے سارے اختیارات بیرونی حضرات کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔

امتحانات کی خامیاں:

امتحانات کے مروجہ نظام میں بعض ایسی بنیادی خامیاں ہیں جن کے باعث تعلیم وتربیت کے پورے نظام کو سخت نقصان پہنچتا ہے اور وہ مقاصد بھی حاصل نہیں ہوتے جن کے لیے یہ امتحانات لیے جاتے ہیں۔ مثلاً:

☆ امتحانات ہی تعلیم کا مقصود بن گئے ہیں اور تعلیم وتربیت کا بنیادی مقصد نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ طلبہ اور ان کے سرپرستوں، اساتذہ اور ذمہ داران ادارہ سب کی یہی خواہش اور کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح امتحان کا نتیجہ اچھا رہے۔ چنانچہ ان تمام مصروفیات ومشاغل اور اوصاف وخصوصیات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جن کا امتحان سے براہ راست تعلق نہ ہو خواہ تعلیم وتربیت کے نقطہ نظر سے ان کی کتنی ہی اہمیت وافادیت کیوں نہ ہو۔ مضامین، مشاغل اور کتابوں کے انہی حصوں پر زور دیا جاتا ہے جو امتحان کے نقطہ نظر سے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ صرف منتخب حصوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ خلاصوں اور شرحوں سے کام

چلایا جاتا ہے۔ کامیابی کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔ امتحانی سوالات کا پتہ لگانے، دھوکہ دینے، پرچہ آؤٹ کرنے، نقل کرنے، پوزیشن لانے کے لیے مدمقابل کوزک پہنچانے، سفارشیں کرانے یہاں تک کہ بعض صورتوں میں رشوتیں دینے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔

مروجہ امتحانات انتہائی ناقابل اعتماد ہیں: ان سے طلبہ کی لیاقت وصلاحیت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ

☆ سوالات عموماً ایسے پوچھے جاتے ہیں جن کا تعلق حافظے اور یادداشت سے ہوتا ہے چنانچہ بے سمجھے بوجھے رٹ کر بھی اچھے نمبر مل سکتے ہیں۔ اس طرح دوسری ذہنی صلاحیتوں کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہو پاتا۔

☆ معلومات خواہ ناقص ہوں، اظہار خیال، انشاپردازی اور لفاظی پر اگر قدرت ہو تو کافی نمبر مل جاتے ہیں اور اچھی معلومات کے باوجود انشا پردازی یا اظہار خیال پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے اچھے نمبر نہیں ملتے۔

☆ نمبر دینے کا کوئی ہمہ گیر معیار نہیں ہوتا۔ سارا انحصار ممتحن کے مزاج، موڈ اور پسند پر ہے جب کہ ان کا حال یہ ہے کہ کوئی نمبر دینے میں بہت بخیل ہوتا ہے، کوئی نہایت سخی، کوئی سختی سے کاپیاں جانچتا ہے، کوئی نرمی سے۔ تجربہ شاہد ہے کہ ایک ہی کاپی پر مختلف ممتحنوں کے دیے ہوئے نمبروں میں کم وبیش پچاس فی صدی تک تفاوت رہا ہے۔ کاپیاں جانچتے وقت ممتحن خوش وخرم اور ہشاش بشاش رہا یا طالب علم کی کوئی بات پسند آ گئی تو اچھے نمبر مل گئے اور صورت حال اس کے برعکس ہوئی تو خیر نہیں۔ نمبروں پر اس کا اثر پڑ کر رہے گا۔

☆ جن سوالات کے جواب طالب علم نے تیار کیے تھے، خوش قسمتی سے وہی امتحان میں آ گئے تو چاندی ہے ورنہ سارا کیا دھرا اکارت۔

☆ پرچہ کرتے وقت بچے کی صحت ٹھیک رہی، امتحان کا ہونا سوار نہ ہوا، موڈ ٹھیک رہا۔ عین موقع

پر تمام باتیں ترتیب سے یاد آگئیں تو اچھے نمبر مل گئے، ورنہ ساری محنت پر پانی پھر گیا۔

☆ محدود وقت میں امتحان لیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اتنے قلیل وقت میں لیاقت وصلاحیت کی ٹھیک جانچ ممکن ہی نہیں ہے۔

☆ مروجہ امتحانات سے صرف علمی وفنی صلاحیت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے وہ بھی ناقص اور دھندلا سا۔ شخصیت کے دوسرے سارے پہلوؤں کے بارے میں ان سے کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔

☆ طلبہ صرف امتحان کے زمانے میں محنت کرنے، وہ بھی زیادہ تر رٹنے کے عادی بن جاتے ہیں۔ چنانچہ جو کچھ یاد کرتے ہیں امتحان کے بعد ہی بھول جاتے ہیں۔

☆ بعض طلبہ امتحان کی خاطر اتنی جان توڑ محنت کرتے ہیں کہ ہمیشہ کے لیے اپنی صحت برباد کر لیتے ہیں۔

☆ امتحانات کا چکر طلبہ کو خارجی مطالعہ کا موقع ہی نہیں دیتا۔ ان کی ساری توجہ درسی کتب تک محدود رہتی ہے۔

☆ بیرونی امتحانات میں ممتحن عموماً ایسے لوگ ہوتے ہیں جو خواہ اپنے فن میں ماہر ہوں لیکن بچوں کی تعلیم کا تجربہ نہیں رکھتے چنانچہ وہ ٹھیک اندازہ نہیں کر پاتے۔

غرض مروجہ امتحانات کا پورا نظام انتہائی ناقص ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ امتحانات کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔ بلکہ غرض یہ ہے کہ ان کو کارآمد بنانے کی پوری فکر کی جائے۔

امتحانات کو کارآمد بنانے کی صورتیں:

☆ امتحانات کو مقصود ہرگز نہ بننے دیا جائے بلکہ ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا جائے جن کے لیے یہ منعقد ہوتے ہیں۔

☆ شخصیت کے سارے پہلوؤں کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے۔

☆ درجے اور گھر کے کام کو بھی امتحانات کا جز بنایا جائے اور ان کے لیے بھی کچھ نمبر مخصوص کیے

جائیں تاکہ سال بھر کام کی طرف توجہ رہے۔

☆ امتحان کو ہوّا بنانے یا اس کے نام سے بچوں کو ڈرانے کے بجائے اسے مدرسے کے معمولات کا ایک جز بنایا جائے۔

☆ سوالات ایسے منتخب کیے جائیں جن سے صرف حافظے اور یادداشت ہی کی نہیں بلکہ سوجھ بوجھ، استدلال، نتائج اخذ کرنے اور معلومات کو کام میں لانے کی صلاحیت کا بھی اندازہ ہو سکے۔

☆ سوالات پورے مضمون پر پھیلے ہوں تاکہ منتخب مطالعہ کی عادت نہ پڑے۔

☆ کچھ نمبر زبانی امتحانات (Viva Voce) کے لیے بھی مخصوص کیے جائیں تاکہ طرز گفتگو تقریری صلاحیت اور زبانی اظہار خیال کا بھی اندازہ ہو سکے۔

☆ ایسے اقدامات کیے جائیں جن سے امتحان قسمت کا کھیل نہ رہے۔ متعلقہ اساتذہ کی رائیں، روزانہ کام کا ریکارڈ (ترقی چارٹ)، ہفتہ وار اور ماہانہ جانچ، میقاتی امتحانات کے نتائج، امتحان کے وقت جسمانی و ذہنی حالت کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔

☆ معلوماتی مضامین کے پرچے ایسے بنائے جائیں جن میں لسانی اور انشا پردازی کے کم سے کم مواقع ہوں مثلاً ایسے سوالات دیے جائیں جن میں خالی جگہیں پُر کر کے یا غلط ، صحیح کا نشان کر کے، متعدد جوابات میں سے صحیح کا انتخاب کر کے کام چل جائے اور بہت زیادہ لکھنا نہ پڑے۔

☆ ممتحن ایسے لوگوں کو بنایا جائے جن میں احساس ذمہ داری، انصاف پسندی اور طلبہ سے ہمدردی ہو اور جو تدریسی تجربہ رکھتے ہوں۔ خاص کر اس عمر اور صلاحیت کے طلبہ کی تدریس کا تجربہ جن کے وہ ممتحن بنائے جا رہے ہیں۔

☆ پرچے کے ہر سوال کے بارے میں اطمینان کر لیا جائے کہ سوال طلبہ کی سمجھ میں بخوبی آ جائے گا اور وہ ان کی عمر اور فہم و استعداد کے مطابق ہے۔ نیز تعلیم کے بنیادی مقصد سے بھی

ہم آہنگ ہے۔

☆ چھوٹے بچوں کا امتحان زیادہ تر زبانی ہو اور ایسا شخص امتحان لے جس سے بچے بخوبی مانوس ہوں یا جو انہیں بآسانی مانوس کر لے۔

☆ امتحان یہ جاننے کے لیے لینا چاہیے کہ طلبہ کو کیا کیا آتا ہے اور ان کی صلاحیت واستعداد کیا ہے، نہ کہ یہ دیکھنے کے لیے کہ انہیں کیا کیا نہیں آتا۔ ظاہر ہے یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہر رجحان اور صلاحیت کے طلبہ کا لحاظ کر کے پرچے بنائے جائیں اور انتخاب کی کافی آزادی دی جائے۔

☆ پرچوں میں سوالات صرف درسی کتب تک محدود نہ رہیں بلکہ ایسے غیر درسی سوالات بھی دیئے جائیں جن سے طلبہ کی عام معلومات اور اس مضمون میں ان کی عام استعداد کا اندازہ لگایا جا سکے۔

☆ امتحانات خوشگوار فضا میں لیے جائیں تاکہ بچے ہمت اور حوصلے کے ساتھ جواب دیں۔ امتحانات کا نام ہی بچوں کو ہراساں کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اگر طلبہ کسی وجہ سے ہمت ہار بیٹھیں تو جواب کیا دے سکیں گے۔

☆ فیل ہونے والے طلبہ کو مایوسی اور بددلی سے بچانے کی پوری کوشش کی جائے اور توجہ صرف کر کے آئندہ کامیابی کا یقین پیدا کرایا جائے۔

امتحانات کے متعلق دیگر ضروری باتیں:

طلبہ کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ اور ان کی رفتار ترقی کی جانچ نیز ترقی چارٹ پر نتائج کا بروقت اندراج۔ یہ سب کام تو برابر ہوتے رہنے چاہئیں البتہ باقاعدہ امتحانات سال میں دو بار کافی ہیں۔

ا۔ ششماہی امتحان تعلیمی سال کے وسط میں۔

۲۔ سالانہ امتحان تعلیمی سال کے اختتام پر۔

مضامین کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر ہر مضمون کے نمبر درجہ وار تجویز کیے جارہے ہیں ان میں سے کم از کم بیس فی صدی نمبر روزمرہ کے کام اور ماہانہ جانچ وغیرہ کے لیے مخصوص ہونے چاہئیں۔

درجہ اول دوم میں اردو نقل املا، خالی جگہوں میں موزوں حروف یا الفاظ پر کرنے اور تحریری حساب کے علاوہ باقی چیزوں کا امتحان زبانی یا عملی ہونا چاہیے۔ زبانی امتحانات میں طلبہ کے سامنے واضح الفاظ میں سوال رکھ دینے کے بعد تھوڑی دیر سوچنے کا موقع دے کر جواب حاصل کرنا چاہیے۔ چھوٹے بچے جھجک کی وجہ سے جانتے ہوئے بھی ٹھیک جواب نہیں دے پاتے ان کی جھجک دور کرکے اور ہمت بندھا کر جواب حاصل کرنا چاہیے۔ زبانی امتحانات کے سوالات چھوٹے، عبارت عام فہم اور مختصر ہونی چاہیے۔ سوم چہارم میں اردو انشاء، املا و نقل، فارسی املا و نقل اور حساب تحریری کے سوا تمام مضامین کا امتحان زبانی یا عملی ہونا چاہیے۔ معلومات کا پرچہ تحریری ہو سکتا ہے بشرطیکہ جوابات بہت مختصر لکھنے ہوں اور پرچہ حتی الامکان ایسا بنایا جائے جس میں مضمون نگاری اور انشاپردازی کی کم سے کم ضرورت پیش آئے۔

پانچویں اور اس کے بعد کی جماعتوں میں امتحانات تحریری ہونے چاہئیں۔ البتہ ناظرہ، قرأت، حفظ، زبانی حساب اور مختلف زبانوں میں پڑھنے اور بولنے کی صلاحیت کا اندازہ صرف زبانی امتحان ہی سے ہوسکتا ہے، آرٹ کرافٹ کا امتحان عملی ہوگا۔ اخلاق و معاشرت کوئی امتحانی مضمون نہیں ہے بلکہ اس کے نمبر روزمرہ کی عملی زندگی کے جائزے کے نتیجے میں ملیں گے۔ تفصیل آگے جائزے کے تحت دیکھیں۔

اول دوم کے مجوزہ نمبر

۱۔ اسلامیات ۱۰۰
(۱) اخلاق ومعاشرت ۲۵
(۲) قرآنی قاعدے ۲۵
(۳) وضو، نماز عملی اور سورتیں اور اذکار زبانی ۲۵
(۴) نبیوں کے حالات اور آنحضرت ﷺ کے متعلق قصے ۲۵

۲۔ اردو ۱۰۰
(۱) پڑھنا ۵۰
(۲) کہانیاں، نظمیں، زبانی ۲۰
(۳) نقل املا وغیرہ ۳۰

۳۔ ریاضی ۱۰۰
(۱) تحریری ۵۰ (۲) زبانی ۵۰

۴۔ معلومات ۵۰
(۱) جغرافیہ ۲۵ (۲) عام سائنس ۲۵

۵۔ آرٹ کرافٹ ۵۰

میزان: ۴۰۰

سوم چہارم کے مجوزہ نمبر

۱۔ اسلامیات ۱۵۰
(۱) اخلاق ومعاشرت ۵۰
(۲) قرآن حکیم ۴۰
(۳) فقہ وعقائد ۳۰
(۴) سیرت وسیر ۳۰

۲۔ اردو ۱۰۰ (۱) درسی ۵۰ (۲) انشاء ۵۰

۳۔ عربی ۵۰ (۱) درسی ۲۵ (۲) انشاء ۲۵

۴۔ ریاضی ۱۰۰ (۱) تحریری ۷۵ (۲) زبانی ۲۵

۵۔ معلومات ۵۰ (۱) جغرافیہ ۲۵ (۲) عام سائنس ۲۵

۶۔ آرٹ کرافٹ ۵۰

کل میزان: ۵۰۰

پنجم ششم کے مجوزہ نمبر

۱۔ اسلامیات ۲۰۰ (۱) قرآن مجید ۵۰ (۲) فقہ وعقائد ۵۰

(۳) سیرت وسیر ۵۰ (۴) اخلاق ومعاشرت ۵۰

۲۔ اردو ۱۰۰ (۱) درسی ۵۰ (۲) انشاء ۵۰

۳۔ عربی ۵۰ (۱) درسی ۲۵ (۲) انشاء ۲۵

۴۔ فارسی ۵۰ (۱) درسی ۲۵ (۲) انشاء ۲۵

۵۔ انگریزی ۵۰ (۱) درسی ۲۵ (۲) انشاء ۲۵

۶۔ ریاضی ۱۰۰ (۱) تحریری ۷۵ (۲) زبانی ۲۵

۷۔ معلومات ۱۰۰ (۱) تاریخ وتمدن ۴۰ (۲) جغرافیہ ۳۰

(۳) عام سائنس ۳۰

۸۔ آرٹ کرافٹ ۵۰

میزان کل: ۷۰۰

ہفتم اور اس کے بعد کے درجات

ان درجات میں اسلامیات اور عربی زبان بنیادی مضامین ہوں گے۔ان پر زیادہ وقت اور توجہ صرف کی جائے۔قرآن،حدیث کے اقتباسات عربی زبان کے تحت پڑھائے جائیں گے۔ باقی مضامین کو ثانوی حیثیت حاصل ہوگی۔

۱۔ اسلامیات ۲۵۰ (۱) فقہ وعقائد ۵۰ (۲) تاریخ اسلام ۵۰
(۳) سیرت وتعلیمات ۵۰
(۴) اخلاق ومعاشرت ۱۰۰

۲۔عربی ۱۰۰ (۱)درسی ۵۰ (۲) انشاء وترجمہ ۵۰

۳۔اردو ۱۰۰ (۱)نثر مع مضمون نگاری ۵۰
(۲)نظم مع ہندی ۵۰

۴۔انگریزی ۱۰۰ (۱)درسی ۵۰ (۲)انشاء وترجمہ ۵۰

۵۔ریاضی ۱۰۰ (۱)حساب ۵۰ (۲)الجبرا وجیومیٹری ۵۰

۶۔معلوماتی مضامین ۱۵۰ (۱)تاریخ وتمدن ۵۰ (۲)جغرافیہ ۵۰
(۳)عام سائنس ۵۰

۷۔پیشہ وارانہ تعلیم (عملی کاموں پر صرف) ڈویژن I, II, III

میزان کل ۸۰۰

نتائج:

۱۔ پرائمری درجات میں ۴۰ فیصدی مجموعی نمبر پانے والے طلبہ پاس شمار کیے جائیں بشرطیکہ کسی مضمون میں حاصل شدہ نمبر ۲۰ فی صدی سے کم نہ ہوں۔ بعد کے درجات میں پاس ہونے

کے لیے ہر مضمون میں ۳۰ فیصدی نمبر لانا ضروری ہے۔

۲۔ مجموعہ میں ۴۴ فیصدی تک نمبر پانے والے طلبہ III، ۴۵ تا ۵۹ فیصدی II اور ۶۰ فیصدی اور اسکے اوپر I ڈویژن میں پاس کیے جائیں۔

۳۔ پرائمری درجات کے جو طلبہ قرآن حکیم ناظرہ، اردو یا ریاضی میں کمزور ہوں انہیں ترقی نہ دی جائے اور بعد کے درجات کے جو طلبہ اسلامیات اور عربی میں کمزور ہوں انہیں آگے نہ بڑھایا جائے۔

۴۔ جو طلبہ علالت یا کسی معذوری کے باعث شریک امتحان نہ ہو سکے ہوں انہیں مکرر امتحان کا موقع دیا جائے۔

۵۔ ابتدائی درجات کے وہ بچے جن کا سال بھر کا ریکارڈ اچھا ہو اور وہ سالانہ امتحان میں کسی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکیں، ان کا سال ضائع نہ ہونے دیا جائے بلکہ سابقہ ریکارڈ کی بنیاد پر ترقی دے دی جائے۔ البتہ کمزور بچوں کو آگے بڑھانے میں بڑی احتیاط کرنی چاہیے۔

نتیجہ فارم:

نتیجہ دو طرح کے فارموں پر تیار کیا جاتا ہے۔ ایک پورے درجے کا مجموعی جو دفتر میں بطور ریکارڈ محفوظ رہتا ہے، دوسرا طلبہ کا الگ الگ جو ان کے سرپرستوں کو بھیج دیا جاتا ہے یا ان کے ترقی چارٹ پر درج کر دیا جاتا ہے نمونے الگ صفحات پر ملاحظہ ہوں۔

☆☆☆

باسمہ سبحانہ

نتیجہ امتحان ششماہی، سالانہ ماہ..................سنہ درجہ..................درس گاہ..................

نمبر شمار	داخلہ نمبر	نام طالب علم	اسلامیات					اردو			فارسی			عربی			انگریزی			ریاضی			معلومات										
			[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	کل نمبر	[illegible]	[illegible]	کل نمبر	[illegible]	[illegible]	کل نمبر	[illegible]	[illegible]	کل نمبر	[illegible]	[illegible]	کل نمبر	[illegible]	[illegible]	کل نمبر	[illegible]	[illegible]	[illegible]	کل نمبر	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
۱																																	
۲																																	
۳																																	
۴																																	
۵																																	
۶																																	
۷																																	
۸																																	
۹																																	
۱۰																																	

تعداد مندرج .... تعداد شرکاء .... پاس .... ترقی .... فیل .... I .... II .... III .... دستخط کلاس ٹیچر .... دستخط ناظم / صدر مدرس

(نوٹ: اس فارم کو بڑے کاغذ پر پوری شیٹ پر نقل کر لینا چاہیے۔)

باسمہ تعالیٰ

نتیجہ امتحان ششماہی، سالانہ، ماہ..........۲۰ء

رول نمبر..........نام طالب علم..........درجہ..........

نمبر شمار	مضامین	نمبر مجوزہ	نمبر حاصلہ	کیفیت
۱	اسلامیات: (قرآن وحدیث فقہ وعقائد، سیرت وتاریخ اسلام، اخلاق ومعاشرت)			
۲	اردو			
۳	عربی: زبان وادب			
۴	انگریزی			
۵	فارسی			
٦	ریاضی: (حساب زبانی وتحریری الجبرا جیومیٹری)			
۷	معلوماتی مضامین (تاریخ وتمدن جغرافیہ، عام سائنس وغیرہ)			حاضری:
۸	آرٹ کرافٹ			
	میزان			نمبر فیصدی

نتیجہ..........ڈویژن..........پوزیشن..........

نوٹ:۔ نشان زدہ مضامین پر غیر معمولی توجہ دیجئے۔

دستخط کلاس ٹیچر..........مورخہ..........دستخط صدر مدرس یا ناظم:..........

دستخط سرپرست معہ تاریخ:..........

جائزے، جانچ اور ترقی چارٹ:

متوازن تعلیم وتربیت کے لیے طلبہ کی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر برابر نظر رکھنی چاہیے اور وقتاً فوقتاً تفصیل سے جائزہ لے کر طلبہ کے ترقی چارٹ پر اندراج ہونا چاہیے تاکہ اساتذہ اور سرپرست سب بچے کی حالت اور رفتار ترقی سے باخبر رہیں اور حسب ضرورت اصلاح حال کی طرف توجہ دیں۔

ا۔ جسمانی حالت کا جائزہ:

داخلے کے وقت اور ہر تعلیمی سال کے شروع میں مندرجہ ذیل باتوں کا جائزہ لے کر ترقی چارٹ پر اندراج کر لینا چاہیے۔

ا۔ قد ۲۔ وزن ۳۔ بصارت

۴۔ سماعت ۵۔ کوئی عارضہ یا متعدی بیماری ۶۔ عام جسمانی حالت

۷۔ چیچک کا ٹیکہ ۸۔ ضروری ہدایات

صحت کی جانچ کے لیے اگر وقتاً فوقتاً کسی طبی ماہر کی خدمات حاصل ہو سکیں تو وہ زیادہ بہتر ہے۔

کم از کم تیسرے مہینے، عام جسمانی حالت، کھیل کی پابندی، ورزش یا جسمانی محنت کی عادت اور حفظان صحت کے اصولوں کی پابندی کا جائزہ لے کر ترقی چارٹ میں اندراج کر دینا چاہیے۔

۲۔ عملی، اخلاقی اور معاشرتی حالت کا جائزہ:

تعلیمی سال کے شروع میں مفصل اور ہر تیسرے ماہ اجمالی طور پر اپنے مشاہدے اور سرپرستوں کی رپورٹ سے مندرجہ ذیل باتوں کا اندراج کر لیا جائے۔

☆ پسندیدہ عادات واطوار: نماز کی پابندی، سچ بولنا، عام شائستگی وغیرہ۔

☆ ناپسندیدہ عادات: جھوٹ، چوری، بدتمیزی، سگریٹ نوشی وغیرہ۔

☆ صفائی وسلیقہ: جسم، لباس اور پڑھنے لکھنے کے سامان وغیرہ کے ضمن میں۔

☆ مختلف مواقع کے آداب کالحاظ: مسجد کے آداب، درجے کے آداب، اجتماعات کے آداب، کھانے پینے، چلنے پھرنے، ملنے جلنے اور بات چیت کرنے کے آداب۔

☆ اساتذہ، والدین، بہن بھائیوں، درجے اور مدرسے کے ساتھیوں، نیز ہم جولیوں کے ساتھ برتاؤ۔

☆ احساس ذمہ داری، محنت وانہماک خاص کر حاضری اور وقت کی پابندی، پڑھنے لکھنے اور ہوم ورک میں دلچسپی، درجے کی صفائی، آرائش اور گھر نیز مدرسے کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے اور غیر نصابی مصروفیات، نیز مدرسے کے مختلف پروگراموں میں شرکت کے ضمن میں۔

تعلیمی حالت کا جائزہ:

اوائل میقات میں مندرجہ ذیل باتوں کا جائزہ اور اندراج ہو۔

۱۔ عام ذہنی کیفیت۔

۲۔ مضامین جن میں اچھا چلتا ہے۔

۳۔ مضامین جن میں کمزور ہے۔

۴۔ کمزوریاں دور کرنے کے لیے مشورے۔

پھر روزمرہ کے تحریری وزبانی کام اور جانچ کے نتائج کی روشنی میں ماہانہ رپورٹ اور ششماہی وسالانہ امتحانات کے نتائج کا اندراج ہو۔

خارجی مطالعہ خصوصاً لائبریری اور دارالمطالعہ سے استفادہ کی بھی سہ ماہی رپورٹ تیار ہونی چاہیے۔ اس جائزہ کے نتائج سے سرپرستوں کو باخبر رکھنا چاہیے تاکہ وہ بھی تعاون کرسکیں۔

............☆☆☆............

باب ۳۰:

انفرادی و جماعتی تعلیم

ہمارے یہاں بعض مدارس ومکاتب اب بھی ایسے ہیں جن میں سرے سے جماعت بندی ہی نہیں ہوتی۔ ہر بچے کا سبق علیحدہ ہوتا ہے۔ معلم ایک بچے کو بلاتا ہے۔ اس کا پچھلا سبق سنتا ہے۔ اسے نیا سبق دے کر یاد کرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اس طرح باری باری تمام بچوں کو سبق دیتا ہے۔ کبھی کبھی سبق یاد کرانے یا نیا سبق دینے میں ان طلبہ سے بھی مدد لیتا ہے جو نسبتاً تیز ہوتے ہیں اور اپنا سبق جلد یاد کر لیتے ہیں یا صلاحیت واستعداد میں دوسرے بچوں سے آگے ہوتے ہیں۔ اس طریقے میں جہاں چند فائدے ہیں مثلاً:

☆ ہر بچے پر معلم انفرادی توجہ دیتا ہے۔
☆ ہر بچے کو اپنی فطری رفتار سے آگے بڑھانے کا موقع ملتا ہے۔
☆ بچے اپنے ساتھیوں کو سبق یاد کرانے میں امداد دیتے ہیں۔
☆ دوسروں کو سبق پڑھانے سے بچوں کو اپنا سبق بخوبی یاد ہو جاتا اور استعداد بڑھ جاتی ہے۔

وہیں متعدد نقصانات ہوتے ہیں۔ مثلاً:

☆ ایک وقت میں معلم ایک ہی بچے پر توجہ دے سکتا ہے اس لیے باقی بچوں کا بہت سا وقت ضائع ہوتا ہے۔
☆ دن بھر بمشکل ایک دو مضمون ہو پاتے ہیں۔
☆ خالی بیٹھنے کی وجہ سے بچے اکثر شرارت کرتے ہیں۔ انہیں کنٹرول میں رکھنے کے لیے معلم کو بہت زیادہ سختی کرنی پڑتی ہے۔
☆ بچوں کے ذریعے سبق دلانے سے تعلیم انتہائی ناقص ہوتی ہے۔
☆ پڑھائی کے ضمن میں جن بچوں سے اساتذہ امداد لیتے ہیں ان میں علمی پندار اور احساس

برتری پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ساتھیوں کو حقیر سمجھنے اور ان سے ناروا سلوک کرنے لگتے ہیں وغیرہ۔

غرض فرداً فرداً سبق دینے میں تعلیم وتربیت دونوں بہت زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔

اس کے برعکس درجہ بندی کر کے پوری پوری جماعت کو ایک ساتھ تعلیم دینے کا عام رواج ہے۔ اس سے متعدد فائدے ہوتے ہیں۔

جماعتی تعلیم کے فوائد:

☆ طلبہ اور اساتذہ دونوں کا وقت دیگر مفید کاموں کے لیے بچ جاتا ہے۔

☆ ایک ہی معلم متعدد بچوں کو تعلیم دے سکتا ہے۔ اس لیے کم مصارف میں زیادہ کام ہو جاتا ہے۔

☆ معلم پورے درجے پر ایک ساتھ نگاہ رکھ سکتا اور تمام بچوں کو مصروف رکھ سکتا ہے اس لیے نظم وضبط ٹھیک رہتا ہے اور طلبہ پر سختی کرنے کی ضرورت کم ہی پیش آتی ہے۔

☆ متعدد طلبہ کی ایک جیسی مشکلات ایک ساتھ حل ہو جاتی ہیں۔ ہر ایک کو علیحدہ سے وقت دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

☆ کوئی سبق پوری جماعت کو ذہن نشین کرانے کے لیے مختلف طریقوں سے وضاحت کرنی پڑتی ہے۔ اس سے طلبہ ایک ہی بات کو طرح طرح سے پیش کرنے کا سلیقہ سیکھتے ہیں۔

☆ طلبہ کو تقلید کے لیے متعدد اچھے نمونے ملتے ہیں۔

☆ ہم جولیوں کی صحبت میں بچوں کو غیر معمولی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

☆ تعاون، ہمدردی اور دیگر اجتماعی اوصاف پروان چڑھتے ہیں۔

☆ کتب اور تعلیمی سامان کی کمی محسوس نہیں ہونے پاتی دوسرے بچوں سے اس ضمن میں مدد مل جاتی ہے۔

☆ طلبہ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی تدریسی کاموں میں دلچسپی لیتے اور دوسروں کو معلم سے متاثر ہوتا دیکھ کر تاثر قبول کرتے ہیں اور پوری جماعت کا مجموعی تاثر معلم کو مزید دلچسپی سے کام کرنے کا محرک بنتا ہے۔ چنانچہ اساتذہ اور طلبہ دونوں کو اجتماعی تدریس میں زیادہ لطف آتا ہے۔

☆ مسابقت کے متعدد مواقع ملتے ہیں جو طلبہ کو غیر معمولی محنت اور توجہ و دلچسپی سے کام کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

نقائص:

جماعتی تعلیم کے جہاں متعدد فائدے ہیں وہیں اس میں بعض بنیادی نقائص بھی ہیں مثلاً:

☆ جماعتی تعلیم اس مفروضے پر دی جاتی ہے کہ درجے کے تمام بچے یکساں صلاحیت رکھتے ہیں۔ (حالانکہ جسم و ذہن مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے افراد کے مابین فرق و امتیاز فطری ہے) چنانچہ ان کے انفرادی فرق کو نظر انداز کر کے سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے۔

☆ جماعتی تعلیم سے ذہین اور کند ذہن دونوں طرح کے بچوں کا نقصان ہوتا ہے۔ تیز بچوں کو سست رفتاری پر مجبور کیا جاتا ہے اور غبی لڑکوں کو تیز رفتاری پر۔ چنانچہ دونوں طرح کے بچے اپنی فطری رفتار سے آگے بڑھنے کا موقع نہیں پاتے۔

☆ تدریس کا کام عام صلاحیت کے بچوں کا لحاظ کر کے کیا جاتا ہے۔ اس لیے رفتار عموماً بہت سست رہتی ہے اور اساتذہ طلبہ اور دونوں رفتار کار کی طرف سے مطمئن نہیں ہو پاتے۔

☆ غیر حاضری یا علالت کے باعث جو بچے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ان پر انفرادی توجہ نہیں ہو پاتی۔ چنانچہ کمی پوری نہ ہونے کی وجہ سے وہ اور زیادہ پھسڈی ہو جاتے ہیں۔ بسا اوقات یہی کمی اچھے خاصے ذہین بچوں میں بددلی اور تعلیم سے نفرت کا موجب بن جاتی ہے۔

☆ استاد کو طلبہ سے نجی ربط قائم کرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ چنانچہ ان کی تعلیم و تربیت اور

رفتارِ ترقی کا نہ تو بخوبی اندازہ ہو پاتا اور نہ ان کی طرف کماحقہ توجہ ہو پاتی ہے۔

☆ برے ساتھیوں کے خراب اثرات قبول کرنے کے بھی اندیشے ہوتے ہیں۔

☆ طلبہ کو اسباق میں عملی دلچسپی لینے اور خود کر کے سیکھنے کے بہت کم مواقع ملتے ہیں۔

☆ سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ بچہ کے بجائے تعلیم مرکز بن جاتی ہے اور ساری توجہ زیادہ سے زیادہ پڑھا دینے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ افراد کتنا استفادہ کر رہے ہیں اس پر کم ہی دھیان دیا جاتا ہے۔

نقصانات سے بچنے کی تدابیر:

جماعتی تعلیم میں بلاشبہ ہیں تو متعدد نقائص لیکن مختلف وجوہ سے یہی طریقہ ناگزیر اور ساری دنیا میں مقبول ہے۔ تعلیم تو بہر حال جماعتی انداز ہی سے دینی ہوگی البتہ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ان نقصانات سے بچے محفوظ رہیں جن کی اوپر نشاندہی کی گئی ہے۔ اس ضمن میں کچھ تدابیر نیچے لکھی جاتی ہیں۔

☆ داخلے اور جماعت بندی میں اس بات کی سختی سے پابندی کی جائے کہ ایک درجے میں حتی الامکان ایک ہی عمر اور یکساں ذہنی جسمانی اور علمی صلاحیت نیز ایک ہی معیار کے بچے لیے جائیں۔

☆ بچوں کے انفرادی فرق اور خصوصیات کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے اور ان پر انفرادی توجہ دینے کے لیے لازماً کچھ وقت نکالا جائے۔

☆ طلبہ سے نجی رابطہ قائم کرنے کے لیے ان سے انفرادی ملاقاتیں کی جائیں اور قابل توجہ امور کی طرف توجہ دلائی جائے۔

☆ درجے اور درس گاہ کی فضا نیز قریبی ماحول کو پاکیزہ رکھنے کی پوری کوشش کی جائے اور طلبہ کے سامنے اچھے نمونے پیش کیے جائیں تاکہ بچے اچھے اثرات قبول کریں اور بری صحبت

اور خراب اثرات سے محفوظ رہیں۔

☆ صلاحیت کے اعتبار سے درجے کے بچوں کو مختلف ٹولیوں اور گروپوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہر ٹولی کا ایک نگراں ہو، بچوں کو ٹولیوں میں مل جل کر کام کرنے کے زیادہ مواقع دیے جائیں اور حسب ضرورت ہر ٹولی کی امداد کی جائے۔

☆ زیادہ سے زیادہ سوالات، مشقیں اور تحریری وعملی کام دے کر انفرادی جدوجہد اور صلاحیتوں کا جائزہ لینے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

☆ انفرادی صلاحیتیں ورجحانات دیکھ کر ہوم ورک دیے جائیں۔

☆ کمزور یا پچھڑے ہوئے بچے انفرادی توجہ کے زیادہ مستحق ہیں۔ انہیں ساتھ لے چلنے کی پوری کوشش کی جائے۔ دوسرے بچوں کو تحریری یا عملی کام دے کر کمزوروں پر خصوصی توجہ کے لیے وقت نکالا جائے۔ ہر ایک کو بہرحال اس کی فطری رفتار سے آگے بڑھنے کا موقع ملنا چاہیے۔

☆☆☆

باب ۳۱:

مضامین کا باہمی ارتباط

مدارس میں مضامین کا بار دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ ہر مضمون چونکہ زندگی کے کسی نہ کسی شعبے سے متعلق ہوتا ہے۔ اس لیے کسی مضمون کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ عام مدارس کے مقابلے میں دینی مدارس میں مضامین کی تعداد اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ وہاں دیگر مضامین کے ساتھ اسلامیات اور اردو کی تعلیم بھی لازمی ہوتی ہے۔ چنانچہ پرائمری درجات کے بچوں کو مندرجہ ذیل مضامین پڑھنے پڑتے ہیں:

۱۔ اسلامیات

۲۔ اردو

۳۔ ریاضی

۴۔ سماجی علوم (جغرافیہ، تاریخی کہانیاں، شہریت کی تربیت)

۵۔ عام سائنس

۶۔ آرٹ کرافٹ

کہیں کہیں انگریزی، عربی اور فارسی کی شدبد بھی پرائمری درجات ہی میں کرا دی جاتی ہے۔ اب ذرا غور فرمائیے۔ ایک کمسن بچہ اور اتنے مضامین کا بار۔ اس پر مستزاد یہ کہ:

☆ ہر مضمون الگ الگ پڑھایا جاتا ہے۔

☆ ان مضامین کی مزید ذیلی تقسیم کر کے، ہر جز کے لیے نظام الاوقات میں الگ گھنٹے رکھے جاتے ہیں مثلاً اسلامیات، ناظرہ، فقہ و عقائد، سیرت و سیر وغیرہ اردو میں نثر و نظم، انشاء و قواعد، املا و نقل، خوشخطی وغیرہ اسی طرح دوسری زبانوں میں، سماجی علوم میں جغرافیہ، تاریخ،

سوکس، عام سائنس میں مطالعہ قدرت، حفظانِ صحت وغیرہ۔

☆ ان ذیلی مضامین کو بھی الگ الگ لیا جاتا ہے چنانچہ تعداد اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

☆ ہر مضمون کے اسباق بھی عموماً علیحدہ علیحدہ پڑھائے جاتے ہیں۔ ایک ہی مضمون کے مختلف اسباق میں بھی کوئی ربط نہیں ہوتا۔

☆ کہیں کہیں ابتدائی درجات میں بھی ایک ہی درجے کے مختلف مضامین مختلف اساتذہ کے سپرد ہوتے ہیں۔ اس لیے مضامین کی باہمی تفریق اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

غرض کچھ تو مجبوری اور کچھ ہماری بے تدبیری کے باعث مضامین کا بار بچوں کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ:

☆ ابتداء ہی سے مضامین کے بوجھ تلے دب کر ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے۔

☆ جسمانی نشوونما رک جاتی ہے اور ذہن کند ہو جاتا ہے۔

☆ علم کو ایک اکائی کی حیثیت سے پیش کرنے کے بجائے مختلف شعبہ جات میں تقسیم کر کے پیش کرنے سے طلبہ ذہنی انتشار میں مبتلا ہوتے ہیں۔

☆ مختلف مضامین ایک دوسرے سے اور ایک مضمون کے مختلف اسباق باہم گہرا ربط رکھتے ہیں اگر مربوط کر کے پڑھائے جائیں تو بخوبی وضاحت بھی ہو، بآسانی سمجھ میں آئیں اور طلبہ دلچسپی بھی لیں مگر علیحدہ علیحدہ لینے سے بچے ان سہولتوں سے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً درسی کتاب میں جو کچھ پڑھایا جائے انشاء قواعد اور دوسرا تحریری کام اسی سے متعلق ہو تو بہت آسانی ہو گی لیکن انہی کو اگر ایک دوسرے سے الگ کر کے لیا جائے تو بار بڑھ جاتا ہے۔

اس لیے مضامین کا بار کم کرنے اور تدریس کو موثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ مضامین کو حتی الامکان ایک دوسرے سے مربوط کر کے پڑھایا جائے اور ایک مضمون کے مختلف اسباق میں ربط قائم کر کے تعلیم دی جائے۔ ابتدائی درجات میں کلاس ٹیچر سسٹم رائج کیا جائے اور ایک درجے

کے بیشتر مضامین ایک ہی استاد کے حوالے کیے جائیں تا کہ وہ مضامین واسباق کے مابین بآسانی ارتباط قائم کر سکے۔

ارتباط کی قسمیں:

ارتباط کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ باہمی ارتباط

۲۔ ہم مرکزیت

☆ باہمی ارتباط: یعنی مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے اور ایک ہی مضمون کے مختلف اسباق کو باہم مربوط کر کے پڑھایا جائے۔

☆ ہم مرکزیت: یعنی کسی مضمون یا حرفے کو مرکزی حیثیت دے دی جائے اور سارے مضامین اس سے مربوط کر کے پڑھائے جائیں۔

ہم مرکزیت سے بلاشبہ تمام معلومات ایک ہی مرکز سے متعلق اور باہم مربوط شکل میں ذہن نشین ہوتی ہیں۔ چنانچہ ذہن انتشار فکری سے محفوظ رہتا ہے اور بہ وقت ضرورت اپنی ساری متعلقہ معلومات کو استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن اول تو یہ بڑا مشکل کام ہے کہ تمام مضامین کے اسباق کسی ایک مضمون یا حرفے سے مربوط کر دیئے جائیں۔ دوسرے مرکزی مضمون کو تو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے اور دوسرے مضامین میں معلومات سطحی اور ناقص رہ جاتی ہیں۔ دینی مدارس کے اساتذہ اسلامیات کو مرکزی حیثیت دے کر اگر تمام یا بیشتر مضامین ان سے مربوط کر کے پڑھائیں تو تعلیم کا مقصد بدرجہ اتم پورا ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے جتنی صلاحیت، تیاری اور جس طرح کی درسی کتب درکار ہیں ان کی عدم موجودگی میں اس کا مشورہ قبل از وقت معلوم ہوتا ہے۔

جہاں تک ارتباط باہمی کا تعلق ہے وہ آسان بھی ہے اور قابل عمل بھی۔ اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے تا کہ بچوں کا بار کچھ ہلکا ہو۔

ارتباط باہمی کی صورتیں:

☆ ہر مضمون کے اسباق کی ترتیب ایسی قائم کی جائے کہ وہ ایک دوسرے سے مربوط ہوں۔ ہر اگلا سبق پڑھاتے وقت پچھلے اسباق سے ان کا ربط بخوبی ملایا جائے۔

☆ مضامین کی ذیلی تقسیم ہرگز نہ کی جائے بلکہ ہر مضمون کے مختلف شعبوں کو باہم مربوط کر کے پڑھایا جائے۔ قواعد، انشاء، خطوط نویسی، مضمون نگاری، املا، نقل، خوشخطی وغیرہ سے متعلق مشقیں زبان کے اسی سبق سے متعلق ہوں جو درسی کتاب میں بچے پڑھ رہے ہوں۔ اسی طرح عام سائنس، معاشرتی علوم، آرٹ کرافٹ اور ریاضی وغیرہ کو بھی مزید ذیلی مضامین میں تقسیم نہ کریں بلکہ حتی الامکان ان میں کے ہر گروپ کو ایک ہی مضمون شمار کر کے پڑھائیں۔

☆ ہر سبق کا بچوں کی زندگی، ان کے فطری وسماجی ماحول اور ان کے سابقہ تجربات ومشاہدات سے ربط ضرور ملایا جائے۔

☆ دو مختلف مضامین کے جو اسباق بھی باہم مربوط ہو سکتے ہوں، انہیں مربوط کر کے پڑھائیں مثلاً کرافٹ میں جو کچھ بنوا رہے ہوں آرٹ میں اس کو آراستہ کرائیں۔ اسلامیات میں سبق دے رہے ہوں تو جغرافیہ میں عرب کا حال بتائیں اور اردو میں کوئی نعت پڑھوائیں۔

............☆☆☆............

باب ۳۲:

تدریسی طریقے

مبتدیوں کونئی معلومات بہم پہنچانے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔

☆ ایک یہ کہ ہم طلبہ کو کوئی قاعدہ، ضابطہ یا اصول وغیرہ خود بتا دیں اور طلبہ سے یہ توقع رکھیں کہ وہ ہمارے علم پر بھروسہ کر کے اسے تسلیم کرلیں گے البتہ مزید اطمینان کے لیے بطور دلیل ہم متعین مثالیں بھی فراہم کر دیں تا کہ ان پر منطبق کر کے وہ اس اصول یا ضابطے کی صداقت کو پرکھ سکیں۔

☆ دوسرا یہ کہ ہم طلبہ کو تجربات و مشاہدات، اور مطالعہ وغیرہ کے مواقع بہم پہنچائیں تا کہ وہ خود واقعات وحقائق سے دوچار ہوں اور پھر ان کا تجزیہ کر کے کسی خاص نتیجے پر پہنچیں۔

پہلی صورت میں حقائق تک طلبہ بالواسطہ پہنچتے ہیں۔ دوسری صورت میں براہ راست۔

دونوں طریقے بہر حال اپنا اپنا مقام رکھتے ہیں اور مدرس کو تدریس میں ان دونوں سے کام لینا پڑتا ہے لیکن چونکہ پہلی صورت میں طلبہ کو حقائق تک پہنچنے کے لیے کسی خاص جدوجہد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ مجہول سامع ہوتے اور ان کی حیثیت انفعالی ہوتی ہے۔ نیز ان کا علم دوسروں کا عطیہ ہوتا اور مفت ہاتھ آتا ہے۔ اس لیے عموماً ایک کان سے سنا اور دوسرے سے اڑا دیا جاتا ہے، اس کے برعکس دوسری صورت میں انہیں عملی دلچسپی لینی اور حقائق تک پہنچنے کے لیے کافی محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے ان کی حیثیت فاعلی ہوتی اور تدریس میں ان کے ارادوں اور کوششوں کو غیر معمولی دخل ہوتا ہے۔ اس طرح وہ جو قاعدہ کلیہ یا اصول اخذ کرتے ہیں وہ ان کے پسینے کی کمائی ہوتی ہے جسے وہ بہر حال اچھی طرح ذہن میں محفوظ رکھتے ہیں۔ تدریس کا یہ دوسرا طریقہ بچوں کے لیے زیادہ مفید ہوتا ہے۔

ا۔ استقرائی طریقہ تدریس

تدریس کا وہ طریقہ جس کی بدولت طلبہ متعدد واقعات، حقائق یا مثالوں کا تجزیہ کر کے براہ راست کسی نتیجے پر پہنچتے اور کوئی اصول ضابطہ یا کلیہ اخذ کرتے ہیں استقرائی طریقہ کہلاتا ہے۔ مثلاً دادی اماں مر گئیں، نانا میاں چل بسے، کل حامد مر گیا، آج محمود چل بسیں۔ لوگ مرتے رہتے ہیں، انسان فانی ہے۔

اس طریقے میں معلم ایک خاص ترتیب سے طلبہ کو مخصوص واقعات اور مثالوں کے تجربے، مشاہدے، مطالعے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ معلم کی رہنمائی میں طلبہ ان مثالوں کا تجزیہ اور باہم مقابلہ وموازنہ کر کے ان کے درمیان مماثلت یا فرق تلاش کرتے ہیں اور اس طرح کسی حقیقت تک پہنچتے یا کوئی عام اصول، کلیہ یا قاعدہ اخذ کرتے ہیں۔ مثلاً

طلبہ ۳ کو ۵ بار جوڑتے (۳+۳+۳+۳+۳ ۱۵) اور تین کا پانچ تک پہاڑہ (۳×۵: ۱۵) پڑھتے ہیں تو دونوں صورتوں میں پندرہ جواب آتا ہے۔ یہی عمل کئی اعداد پر کرتے ہیں۔ ۸ کو چار بار جوڑتے (۸+ ۸+ ۸+ ۸: ۳۲) یا ۸ کا ۴ تک پہاڑہ (۸×۴: ۳۲) تو دونوں حالتوں میں جواب ۳۲ آتا ہے وغیرہ اس طرح کی متعدد مثالوں سے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ''جوڑ کا آسان طریقہ ضرب ہے۔''

☆ یا کئی مثلثوں کے تینوں زاویے کاٹ کر ترتیب سے پاس پاس رکھتے ہیں۔

یا ان کو ناپ کر جوڑتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہر بار مجموعہ °۱۸۰ (دو قائمہ) ہوتا ہے اب وہ یہ کلیہ اخذ کرتے ہیں۔

''مثلث کے تینوں زاویوں کا مجموعہ دو قائمہ (°۱۸۰) کے برابر ہوتا ہے۔''

☆ اسی طرح دھات کا ایک گولہ لیتے ہیں جو ایک حلقے یا سوراخ سے بآسانی گزر جاتا ہے، اسے گرم کرتے ہیں، اب وہ نہیں گزرتا۔ یہی عمل مختلف دھاتوں کے گولوں پر کرتے ہیں،

ہر بار حاصل ایک ہی ہوتا ہے۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ "چیزیں گرمی پا کر پھیلتی ہیں۔"

لیکن جب وہ گولے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں تو پھر حلقے سے بآسانی گزر جاتے ہیں اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ

"چیزیں ٹھنڈ پا کر سکڑتی ہیں۔"

اس طریقے کی خوبیاں:

☆ علم کے حصول کا یہ معقول اور منطقی طریقہ ہے۔ مدرس مخصوص مثالیں یا واقعات خاص ترتیب سے فراہم کر دیتا ہے۔ طلبہ ان کا تجزیہ کر کے نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔

☆ طلبہ سبق میں عملی دلچسپی لیتے اور ہمہ تن متوجہ و مصروف رہتے ہیں۔

☆ طلبہ کو غور و فکر، استدلال اور فیصلہ کرنے کا پورا موقع ملتا ہے۔

☆ خود کر کے سیکھنے کے تمام فوائد حاصل ہوتے ہیں، علم کی پختگی، علم کو عمل میں لانے کا سلیقہ، کامیابی کی مسرت، مسائل سے خود نمٹنے کی صلاحیت، جبلی تقاضوں اور فطری خواہشات کی تسکین وغیرہ۔

☆ اپنی جدوجہد سے حقائق تک پہنچنے کا انہیں سلیقہ آتا ہے اور روزمرہ پیش آنے والے واقعات سے اصول اخذ کرنے کی طرف توجہ ہوتی اور رفتہ رفتہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

☆ طلبہ کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور وہ مدرس پر بہت زیادہ تکیہ کرنے کے عادی نہیں بنتے۔

☆ تحقیق و جستجو کی صلاحیت ابھرتی ہے۔

☆ بنی نوع انسان نے تمام معلومات اسی طرح حاصل کی ہیں، خود مشاہدہ و تجربہ کیا ہے، ہر بار کچھ کھویا کچھ پایا ہے۔ اس لیے معلومات کے حصول کا یہی فطری و نفسیاتی طریقہ ہے۔

خامیاں:

اس طریقے کو اختیار کرنے میں بعض نقصانات کے بھی اندیشے ہوتے ہیں طلبہ کو ان سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے مثلاً:

☆ بسا اوقات مارے خوشی کے جلد بازی میں طلبہ غلط نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں متعدد پہلو ان کے سامنے نہیں آپاتے۔

☆ چند مخصوص واقعات یا مثالوں سے کوئی کلیہ بنا لیتے ہیں حالانکہ دوسری بہت سی مثالوں پر اس کا ٹھیک انطباق نہیں ہوتا مثلاً

بچہ دیکھتا ہے کہ جو لوگ اچھے کپڑے پہن کر آتے ہیں یا کھاتے پیتے لوگ ہوتے ہیں ان کی زیادہ آؤ بھگت ہوتی ہے۔ اپنے ان محدود مشاہدات کی بناء پر بچہ یہ نتیجہ نکال لیتا ہے کہ دولت اور زرق برق لباس ہی عزت کا معیار ہیں۔ حالانکہ سود خور، رشوت خور اور حرام ذرائع سے دولت سمیٹنے والوں یا فیشن ایبل جیب کتروں کو کوئی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ اس لیے طلبہ کو جلد بازی سے روکنا چاہیے، نیز تلقین کے ساتھ موقع بھی فراہم کرنا چاہیے کہ وہ جو نتیجہ اخذ کریں یا کلیہ بنائیں اس کو دوسری مثالوں اور واقعات پر منطبق کر کے اس کی صحت کی اچھی طرح جانچ کر لیا کریں۔ جلد بازی میں صرف بعض مثالوں پر اعتماد کر کے کلیات نہ بنایا کریں۔

۲۔ استخراجی طریقہ تدریس

یہ طریقہ استقرائی کی ضد ہے۔ اس میں معلم خود ہی طلبہ کو کوئی عام اصول، ضابطہ یا کلیہ بتا دیتا ہے۔ پھر مخصوص مثالوں سے اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔ طلبہ معلم کے اعتماد پر اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ مزید تصدیق کے لیے بعد میں وہ کچھ اور مثالوں پر اس کلیے کو منطبق کرنے کا موقع دیتا ہے، مثلاً:

قواعد میں استاد نے اسم، ضمیر، فعل، حرف یا صفت کی تعریف بتا دی۔ مثالوں سے واضح کر

دیا۔ طلبہ نے استاد کے علم پر بھروسہ کر کے انہیں مان لیا، ایک پیراگراف دے کر طلبہ سے کہا گیا کہ وہ اس میں سے اسم فعل حرف وغیرہ کی نشاندہی کریں۔ اگر طلبہ ٹھیک نشاندہی کر دیتے ہیں تو سبق کامیاب ہے۔ اسی طرح ریاضی میں کوئی گر یا قاعدہ بتا کر مثالوں سے واضح کر دیا گیا۔ اب طلبہ اسی قاعدے کو استعمال کر کے مزید سوالات حل کرتے ہیں مثلاً ضرب کرنا ہو تو پہاڑے پڑھیں۔ تفریق میں اوپر اکائی کا ہندسہ کم ہو تو دہائی سے ادھار لیں وغیرہ طلبہ اگر انہیں استعمال کر لے جاتے ہیں تو سبق کامیاب شمار کیا جاتا ہے۔

خامیاں:

اس طریقے میں متعدد خامیاں ہیں مثلاً:

☆ طلبہ کی حیثیت مجہول سامع کی ہوتی ہے اس لیے وہ سبق میں عملی دلچسپی نہیں لیتے۔

☆ حقیقت تک چونکہ براہِ راست اور اپنی جدوجہد سے طلبہ کی رسائی نہیں ہوتی اس لیے ان کا علم پختہ اور قابل اعتماد نہیں ہوتا۔ اسے حسب ضرورت عمل میں لانے اور برتنے کی صلاحیت بھی پیدا نہیں ہوتی۔

☆ تعلیمی کام کا بیشتر حصہ قاعدوں، ضابطوں اور اصول وکلیات کے رٹنے تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے جو دیر تک محفوظ بھی نہیں رہتا کیونکہ یہ ان کا اپنا کمایا ہوا نہیں ہوتا۔

☆ یہ طریقہ بچوں کو ''خود کر کے سیکھنے'' اور اس کے جملہ فوائد سے محروم کر دیتا ہے۔

☆ علم کے حصول کا یہ غیر فطری اور غیر نفسیاتی طریقہ ہے۔ افراد زندگی میں ٹھوس حقائق سے دوچار ہوتے ہیں، مجرد تصورات سے نہیں، مجرد تصورات تو ان ٹھوس حقائق کی بنیاد پر اخذ کیے جاتے ہیں۔

خوبیاں:

اس طریقے میں بعض خوبیاں بھی ہیں، مثلاً:

☆ بڑے اپنے علم اور تجربات کو، جو وہ بڑی محنت سے اور بہت کچھ کھو کر حاصل کرتے ہیں، قلیل مدت میں بچوں کو منتقل کر دیتے ہیں۔ چنانچہ بچوں کا وقت ان چیزوں کو خود کر کے سیکھنے پر ضائع نہیں ہوتا جن پر بڑے اپنا بہت سا وقت، قوت اور پیسہ خرچ کر چکے ہیں۔

☆ معلم کا کام بہت ہلکا ہو جاتا ہے۔ وہ ایک قاعدہ یا اصول بتا دیتا ہے طلبہ اسے یاد کر کے اس کی مدد سے متعدد مسائل حل کرتے رہتے ہیں۔

☆ ساری چیزیں خود کر کے سیکھی نہیں جا سکتیں نہ کسی کے پاس اتنا وقت ہے نہ قوت۔ اس لیے لامحالہ بہت سی معلومات اسی طریقے سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

بہر حال چھوٹے بچوں کی تدریس میں استقرائی طریقہ زیادہ مفید اور موثر ہے۔ حتی الامکان اسی طریقے کو استعمال کرنا چاہیے الا یہ کہ کوئی مجبوری ہو۔ مثلاً وقت کم ہو، خود تجربے و مشاہدے میں مختلف طرح کے نقصانات کا اندیشہ ہو یا ایسا کرنا کسی طرح درست اور مناسب نہ معلوم ہوتا ہو۔ البتہ بڑے طلبہ کے تصورات چونکہ نسبتاً واضح ہوتے ہیں۔ ان کے اندر استدلال کی قوت بھی کسی حد تک پختہ ہوتی ہے اس لیے انہیں استخراجی طریقے سے کم وقت میں زیادہ معلومات بہم پہنچائی جا سکتی ہیں اور ان کے لیے یہ طریقہ زیادہ مفید ہے لیکن مشق و اعادے کا بہر حال انہیں کافی موقع ملنا چاہیے۔ ورنہ اس طرح حاصل کیا ہوا علم وہ زیادہ دنوں تک محفوظ نہ رکھ سکیں گے، اور اس کے برتنے میں بھی طرح طرح کی عملی دشواریاں پیش آئیں گی۔

موازنہ

استقرائی طریقہ	استخراجی طریقہ
ا۔ مخصوص واقعات اور انفرادی مثالوں پر پہلے غور کیا جاتا ہے اور ان سے تعریفیں، قاعدے اور کلیے اخذ کیے جاتے ہیں۔	ا۔ تعریفیں، قاعدے اور کلیے پہلے بتا دیئے جاتے ہیں۔ پھر مخصوص واقعات یا انفرادی مثالوں پر انہیں منطبق کیا جاتا ہے۔

۲۔ اس سے جدید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

۳۔ یہ انکشاف وتحقیق کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

۴۔ یہ بہت سست رفتاری کا طریقہ ہے کیونکہ بچے خود رفتہ رفتہ تجربے ومشاہدے کر کے کسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔

۵۔ مختلف ذہنی قوتوں اور صلاحیتوں مثلاً غور وفکر، استدلال، قوت فیصلہ وغیرہ کی تربیت ہوتی ہے۔

۶۔ بچوں میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

۷۔ اس میں خیالات کا رخ بلندی کی طرف ہوتا ہے اور مخصوص واقعات سے کلیات اخذ کرنے کی فکر ہوتی ہے۔

۸۔ خود کر کے سیکھنے کا موقع ملتا ہے اس لیے علم پختہ اور کارآمد ہوتا ہے اور حسب ضرورت سلیقے سے برتا جا سکتا ہے۔

۹۔ اس سے تربیت زیادہ اور معلومات کم ہوتی ہیں۔

۱۰۔ یہ طریقہ بچوں کے لیے موزوں ہے۔

۲۔ اس سے سابقہ معلومات مستحکم ہوتی ہیں۔

۳۔ اس سے دوسروں کی معلومات کی صرف تصدیق ہوتی ہے۔

۴۔ اس طریقے سے کام کی رفتار تیز ہوتی ہے کیونکہ بچے کو خود تجربہ یا مشاہدہ کرنا نہیں پڑتا بلکہ بڑوں کے علم وتجربے سے کام چل جاتا ہے۔

۵۔ زیادہ تر حافظے سے کام لینا پڑتا ہے۔ ذہن کی دوسری قوتوں کو کام میں لانے کا کم ہی موقع ملتا ہے۔

۶۔ اساتذہ پر تکیہ کرنے کی عادت پڑتی ہے۔

۷۔ خیالات کا رخ پستی کی طرف ہوتا ہے اور کلیات سے مخصوص واقعات کی طرف آنا پڑتا ہے۔

۸۔ دوسروں کے بتانے پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے چنانچہ اس علم پر پورا یقین بھی نہیں جمتا اور استعمال میں لانے کا سلیقہ بھی نہیں آتا۔

۹۔ اس سے معلومات زیادہ اور تربیت کم ہوتی ہے۔

۱۰۔ یہ طریقہ بڑوں کے لیے موزوں ہے۔

۳۔ تحقیقاتی طریقہ یا طریقۂ دریافت:

''آگ جلا دیتی ہے'' یہ ایک سادہ سی حقیقت ہے جس کا علم ہمیں مشاہدے اور تجربے سے اوائل عمر ہی میں ہو جاتا ہے۔ اگر ایک ننھے بچے سے کہا جائے کہ ''بیٹا! آگ جلا دیا کرتی ہے، اس میں ہاتھ مت ڈالنا ورنہ جل جاؤ گے اور بہت تکلیف ہوگی۔'' تو ہو سکتا ہے کہ ہم پر اعتماد کی وجہ سے وہ اس حقیقت کو تسلیم کر لے اور کسی حد تک آگ سے بچنے لگے مگر یقین اس وقت ہوگا جب وہ دیکھ لے کہ اماں کھانا پکانے میں جل گئیں اور انہیں بہت تکلیف ہوئی اور کامل یقین تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ جلنے کے تلخ تجربے سے خود دوچار ہو جائے پھر تو دودھ کا جلا مٹھا بھی پھونک کر پئے گا۔

بچوں کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے بتائے پر کم ہی یقین کرتے ہیں۔ وہ خود مشاہدہ اور تجربہ کر کے کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتے ہیں اور اسی صورت میں ان کا علم پختہ اور یقین کامل ہوتا ہے۔ اسی لیے تدریس میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ بچوں کو سب کچھ خود بتانے کے بجائے انہیں کر کے سیکھنے اور اپنی جدوجہد سے حقائق تک پہنچنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع دیئے جائیں۔ تحقیقاتی طریقۂ تدریس بھی دراصل اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اس سے طلبہ میں تحقیق وتلاش کا ذوق پروان چڑھتا ہے اور اس طرح جو علم حاصل کرتے ہیں وہ پختہ ہوتا ہے۔

اس طریقے میں بچے کی حیثیت ایک محقق یا مکتشف کی ہوتی ہے اور معلم کی ایک مشیر، معاون اور رہنما کی۔ طلبہ کا تجسس بیدار اور ضروری لوازمات فراہم کر کے انہیں زیادہ سے زیادہ آزادی دے دی جاتی ہے کہ وہ اپنے طور پر حقائق کا پتہ لگائیں۔ معلم ان کے تجسس کو بیدار رکھتا اور ضروری امداد کرتا رہتا ہے۔ مناسب سوالات واشارات کے ذریعے اور کبھی کبھی براہِ راست کچھ بتلا کر حقائق تک پہنچنے میں طلبہ کی پوری رہنمائی کرتا رہتا ہے۔ اس طرح بچے استاد کی مدد سے

حقائق کا خود پتہ لگاتے ہیں۔ سائنس، ریاضی اور مقامی جغرافیہ پڑھانے میں اس طریقہ سے بہت کام لیا جاسکتا ہے۔

خوبیاں:

اس طریقہ تدریس میں متعدد خوبیاں ہیں:

- ☆ طلبہ کو چونکہ خود تجربے ومشاہدے کا موقع ملتا ہے اس لیے وہ سبق میں عملی دلچسپی لیتے ہیں۔
- ☆ اس طریقے سے حاصل کیا ہوا علم مستحکم ہوتا ہے اور زندگی بھر نہیں بھولتا۔ ایسے علم پر پورا یقین اور بھروسہ بھی ہوتا ہے اور ضرورت پر ٹھیک ٹھیک برتا بھی جاسکتا ہے۔
- ☆ اس سے طلبہ میں تحقیق وجستجو کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنی مدد آپ کرنا سیکھتے ہیں اور مدرسے کے علاوہ اوقات میں بھی نئی نئی باتوں کا مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ کرتے رہتے ہیں۔
- ☆ کرکے سیکھنے اور اپنی کوششوں میں کامیاب ہونے سے جو مسرت ہوتی ہے، وہ مزید جدوجہد کے لیے محرک کا کام دیتی ہے۔
- ☆ اس سے غور وفکر، استدلال اور فیصلے کی قوتوں کی نشوونما ہوتی ہے۔

لیکن اس طریقے کو استعمال کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ بچوں کو اپنی طرف سے کچھ بتایا ہی نہ جائے بلکہ سب کچھ انہیں اپنے طور پر تجربہ ومشاہدہ کرکے سیکھنے دیا جائے جیسا کہ بعض انتہا پسند کہتے ہیں، یہ تو ایک انتہائی نامعقول اور احمقانہ بات ہوگی کہ بچوں کو وہ تمام غلطیاں دہرانے دی جائیں جن کا ارتکاب کرکے ماضی میں لوگ انتہائی خراب نتائج بھگت چکے ہیں۔ اس طرح وہ ماضی کے تجربات سے محروم ہو جائیں گے اور سابقہ علوم سے ان کا رشتہ کٹ جائے گا اور وہ ساری زندگی ان معمولی لاحاصل یا خطرناک باتوں ہی کے تجربے میں برباد کردیں گے جن کے بارے میں وہ بآسانی نہایت قلیل مدت میں معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔ اس کی غرض صرف یہ ہے کہ بچوں کو سب کچھ اپنی طرف سے نہ بتا دیا جائے بلکہ حتی الامکان انہیں خود کرکے سیکھنے کے مواقع

دیئے جائیں، البتہ جہاں کام بگڑتے یا وقت ضائع ہوتے دیکھیں، وہاں ضرور رہنمائی کریں اور ایسے تجربات میں کچھ زیادہ ڈھیل دیا کریں جن سے کسی قابل لحاظ نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔

کنڈرگارٹن طریقہ تعلیم

کنڈرگارٹن کے معنی "بچوں کا باغ" یعنی وہ باغ جس میں نونہال پروان چڑھتے ہیں۔ یہ دراصل ننھے بچوں کے (تین چار سال سے چھ سات سال تک کی عمر کے) ان مدارس کا اصطلاحی نام ہے جو جرمنی کے ایک ماہر تعلیم فروبل کے بتائے ہوئے خاکے کے مطابق چلائے جاتے ہیں۔ ان مدارس میں بچے کی حیثیت پودے کی اور استاد کی حیثیت مالی کی ہوتی ہے، استاد کا یہ کام ہوتا ہے کہ ان نونہالوں کو پروان چڑھنے کے لیے مالی کی طرح مناسب حالات پیدا کردے اور ضروری سامان فراہم کر کے ان پودوں کو اپنی اندرونی تحریک سے پروان چڑھنے کا موقع دے۔

اس طریقہ تعلیم کا موجد فروبل ۱۷۸۳ء میں پیدا ہوا، سوتیلی ماں کے برے برتاؤ کی وجہ سے وہ گھر سے نکل جاتا اور جنگلوں میں مارا مارا پھرتا۔ ابتدائی تعلیم کا کوئی خاص بندوبست نہ ہو سکا۔ بعد میں اس نے اپنی محنت سے تدریسی طریقوں میں مہارت حاصل کی۔ ۱۸۳۷ء میں اس نے ننھے بچوں کے لیے کنڈرگارٹن نام کا ایک مدرسہ قائم کیا۔ ننھے بچوں کی تعلیم وتربیت کو موثر اور مفید بنانے کے ضمن میں اس کا یہ اقدام ایک انقلابی قدم تھا۔ اس سے پہلے ننھے بچوں کی تعلیم وتربیت کے ناقص انتظام پر کڑھنے والے تو متعدد ہوئے لیکن ایک سوچے سمجھے پلان کے تحت عملی قدم اسی نے اٹھایا۔ ۱۸۵۲ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ خدا کے وجود کا قائل اور مذہبی زندگی کا دلدادہ تھا اس کے نزدیک تعلیم کا مقصد "کھری، پُرخلوص، بے عیب اور پاک صاف زندگی بسر کرنے کے قابل بنانا ہے۔"

اور چونکہ یہ مقصد پاکیزہ مذہبی زندگی ہی سے حاصل ہوسکتا ہے اس لیے وہ تعلیم کی بنیاد مذہب پر رکھنا ضروری سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ افراد اپنے آپ کو پہچان

سکیں اوران کے اندر ''شرکت میں وحدت'' کا احساس ابھرے۔

اس کے پیش کردہ اصول یہ ہیں:

☆ اجتماعی اداروں ہی کے ذریعے انفرادیت کی مناسب نشوونما ہوسکتی ہے اس لیے اوائل عمر ہی سے بچوں کے اندر مل جل کر زندگی گزارنے کی ضرورت کا احساس بیدار کرنا نیز تربیت کے ذریعے حسن اخلاق اور اجتماعی اوصاف پیدا کرنا چاہیے۔

☆ جس طرح بیج میں درخت بننے کی پوری صلاحیت موجود ہوتی ہے، صرف مناسب حالات اور ضروری امداد ملنی چاہیے، اسی طرح بچے میں بھی پروان چڑھنے کی پوری صلاحیت موجود ہوتی ہے اس لیے اس کی اندرونی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے اور اس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں (ذہنی، جسمانی، عملی، اخلاقی، جذباتی وروحانی) کو ہم آہنگی کے ساتھ پروان چڑھنے میں امداد کرنی چاہیے۔ وہ اپنی اندرونی تحریک سے خود پھلے پھولے گی۔

☆ تعلیم کا موثر ترین ذریعہ بچوں کی خود فعلی ہے۔ وہ خود کر کے زیادہ بہتر طور پر سیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے ان کی جبلی اور بے ساختہ حرکات وسکنات اور مشاغل ومصروفیات کے ذریعے انہیں تعلیم دینا چاہیے۔

☆ بچوں کی نشوونما کے لیے کھیل ناگزیر ہیں اس لیے کھیل کھیل میں تعلیم دینی چاہیے۔

☆ مدرسے کی فضا ایسی ہونی چاہیے کہ بچے آزادی اور مسرت محسوس کریں اور مختلف: رائع (مثلاً تعمیری مشاغل، گیتوں اور نقل کے کھیلوں) سے اپنے خیالات وجذبات کا کھل کر اظہار کر سکیں۔ خارجی دباؤ بالکل نہ ہونا چاہیے بلکہ رفتہ رفتہ خود انضباطی پیدا کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔

☆ تعلیم بچے کی فطرت وضرورت کا لحاظ کر کے دی جانی چاہیے اور اس ضمن میں بچے کا قلبی تعاون حاصل کرنا چاہیے۔

مجوزہ نصاب اور طریقہ تعلیم وغیرہ:

ننھے بچوں کے لیے لکھنے پڑھنے یا حساب وغیرہ کا کوئی باقاعدہ نصاب تو تجویز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ چھ سال کی عمر سے پہلے بچہ ذہنی وجسمانی حیثیت سے اس لائق ہوتا ہی نہیں کہ باقاعدہ تدریس کا بار اٹھا سکے۔ اس لیے فروبل نے ننھے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے سات تحائف اور بیس مصروفیات تجویز کی ہیں۔ یہ سب کھیل کھلونے ہیں جن کو بچے اپنے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ تحائف تو بچوں کی ذہنی تربیت میں مدد دیتے ہیں اور مصروفیات مختلف قسم کی مہارتیں حاصل کرنے میں معاون ہوتی ہیں۔

☆ پہلا تحفہ: مختلف رنگ کے چھ اون یا لکڑی کی گیندوں پر مشتمل ہوتا ہے جنہیں بچے آزادی سے لڑھکاتے اور ان کے ذریعہ رنگ، شکل، سائز، حرکت، سختی، نرمی وغیرہ کا علم حاصل کرتے ہیں۔

☆ دوسرا تحفہ: گول مکعب اور بیلن کی شکل کی لکڑی کے کھلونوں پر مشتمل ہوتا ہے، جن سے مختلف رنگ وروپ کی اشیاء کے مابین فرق و مماثلت کا اندازہ ہوتا ہے۔

☆ تیسرا تحفہ: لکڑی کا ایک بڑا مکعب ہوتا ہے جس کے آٹھ اجزا ہوتے ہیں۔ ان اجزا کو ترتیب دے کر بچے میز، چوکی، بنچ، سیڑھی وغیرہ بناتے ہیں۔ ان کے ذریعے گنتی گننے اور جوڑنے گھٹانے کا بھی ابتدائی تصور ہوتا ہے۔

☆ چوتھا تحفہ: بچوں کی تعمیری صلاحیتیں ابھارنے کے لیے آٹھ چوکور ٹکڑوں پر مشتمل ایک مکعب ہوتا ہے۔ تیسرے تحفے کے اجزا سے ان کا مقابلہ کرایا جاتا ہے اور ان کو ترتیب دے کر متعدد چیزیں بنوائی جاتی ہیں' ورڈ زائنیں تیار کرائی جاتی ہیں۔

☆ پانچواں تحفہ: ستائیس چھوٹے مکعبوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان کو ترتیب دینے سے طرح طرح کی ڈزائنیں اور عمارتیں بنتی ہیں۔ تیسرے تحفے کے اجزا سے اس کے اجزا ملتے جلتے

ہیں۔ یہ نسبتاً پیچیدہ ہوتا ہے اور ننھے بچوں کو نہیں دیا جاتا۔

☆ چھٹا تحفہ: اس میں اٹھارہ بڑے اور نو چھوٹے چوکور ٹکڑے ہوتے ہیں۔ چوتھے تحفے کے ٹکڑوں سے ان کا مقابلہ کیا جاتا ہے اور ان کو ترتیب دے کر گڑیا کا گھر، مدرسہ، کھیت وغیرہ بنائے جاتے اور طرح طرح کی ڈزائنیں تیار کی جاتی ہیں۔

☆ ساتواں تحفہ: اوپر کے چھ تحفے ٹھوس اشیاء کے بارے میں تصورات قائم کرانے کے لیے ہوتے ہیں۔ ساتواں تحفہ دو ایسے چھوٹے صندوقوں پر مشتمل ہوتا ہے جس میں جیومیٹری کی شکلوں کے مختلف ٹکڑے بھرے ہوتے ہیں۔ ان کی مدد سے جیومیٹری کی شکلیں پہچانی جاتی ہیں۔

☆ ان کے علاوہ تار کے چھلے، ڈور، پنسلیں، رنگین کاغذ، دفتی کے ٹکڑے، چاک، جھنجھنے اور دوسرے متعدد کھلونے ہوتے ہیں۔

☆ فروبل کے نزدیک معلم کے پیش نظر بچوں کے لیے مندرجہ ذیل مضامین ومشاغل ہونے چاہئیں۔

☆ مذہب اور مذہبی تربیت۔

☆ مطالعہ قدرت: باغبانی کے ذریعے اور جانور پال کر۔

☆ گنتی گننا: اصل اشیاء کی مدد سے اور ابتدائی جمع وتفریق کا تصور۔

☆ زبان سکھانا: قصے کہانیوں اور گیتوں نظموں وغیرہ کی مدد سے۔

☆ دستی مشاغل: تعمیری صلاحیتیں ابھارنے کے لیے مختلف قسم کی مشقیں۔

☆ کھیل اور متوازن حرکات کے ذریعے جسمانی تربیت۔

☆ طریقۂ تعلیم ایسا اپنانا چاہیے کہ بچے کھیل کھیل میں اور قصے کہانیوں، گیتوں، نظموں وغیرہ کی مدد سے بہت کچھ سیکھ لیں۔ پڑھانے لکھانے کے رسمی طریقے اس عمر میں ہرگز استعمال نہ کیے جائیں۔

خوبیاں:

☆ اس طریقے سے ننھے بچوں کی تعلیم وتربیت کا کام بہت ہی دلچسپ، موثر اور مفید بن جاتا ہے۔ فروبل پہلا شخص ہے جس نے ننھے بچوں کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دلائی اور موثر تعلیم کا ایک دلچسپ عملی خاکہ پیش کیا۔

☆ اسکول کی فضا گھر جیسی ہوتی ہے چنانچہ بچے اجنبیت محسوس نہیں کرتے۔ خوشی خوشی مدرسے جاتے اور دن گزارتے ہیں ان کے اندر تعاون، ہمدردی، فرض شناسی وغیرہ جیسے اجتماعی اوصاف پروان چڑھانے میں مدد ملتی ہے۔

☆ بچوں کو خود کر کے سیکھنے اور عملی تربیت حاصل کرنے کے بہت زیادہ مواقع ملتے ہیں۔

☆ بغیر بار محسوس کیے ہوئے کھیل کھیل میں بچے پوری دلچسپی توجہ اور انہماک سے متعدد باتیں کر لیتے ہیں۔

☆ نقل کے کھیلوں کے ذریعے وہ روزمرہ زندگی کے متعدد کام، طور طریقے، آداب سلیقے وغیرہ سے عملاً واقف ہو جاتے ہیں۔

☆ تحفوں، کھیلوں اور دلچسپ مصروفیات ومشاغل کی مدد سے بچوں کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی ہم آہنگ تربیت ہوتی ہے۔

خامیاں:

اس طریقے میں جہاں متعدد خوبیاں ہیں، وہیں بعض خامیاں بھی ہیں مثلاً:

☆ تعلیم کے مصارف بہت بڑھ جاتے ہیں اس لیے صرف دولت مندوں ہی کے بچے استفادہ کر سکتے ہیں۔

☆ ننھے بچوں کو کھیل میں جو آزادی ملنی چاہیے کھیلوں میں بھی تعلیمی مقاصد حاوی ہونے کی وجہ سے وہ حاصل نہیں ہوتی۔

☆ چھوٹے بچوں کو کھیل کھیل میں تعلیم دینے کی بہر حال بڑی اہمیت ہے اور بہت سی باتیں اسی طرح سکھائی جائیں لیکن مدرسے پر ہمہ وقت کھیل کے میدان کی سی کیفیت طاری کر دینا بھی درست نہیں۔ اس سے تو تعلیم وتربیت کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ کھیل تو وہ بہر حال ہر جگہ کھیل سکتے ہیں، پھر مدرسے کی کیا ضرورت۔

☆ اجتماعیت پر اتنا غیر معمولی زور دیا جاتا ہے کہ بچوں کی انفرادیت متاثر ہونے لگتی ہے۔ ننھے بچوں میں اتنا زیادہ اجتماعی شعور پیدا کرانا قبل از وقت اور ان کی حریت پسند طبیعت پر ایک طرح کا جبر ہے۔

☆ کھیلوں اور تحفوں کی مدد سے بلاشبہ متعدد باتیں سکھائی جاسکتی ہیں لیکن جن اخلاقی وروحانی اوصاف کو پروان چڑھانے کی فروبل توقع رکھتا اور وکالت کرتا ہے وہ خیالی ہیں اور خوش گمانی سے زیادہ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

بہر حال بحیثیت مجموعی فروبل نے ننھے بچوں کی تعلیم وتربیت میں کھیل، تعمیری مشاغل اور ان کی فطری دلچسپیوں کا لحاظ رکھنے کی طرف خصوصی توجہ دلا کر بچوں کی بڑی خدمت کی ہے۔ ابتدائی درجات میں اس طرف پوری توجہ دینی چاہیے۔

۵۔ مانٹسوری طریقۂ تعلیم:

اس طریقہ کی موجد اٹلی کی ایک خاتون میریا مانٹسوری ہے۔ وہ ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئی۔ ڈاکٹری پاس کر کے ایک ہسپتال میں ننھے بچوں کا علاج کرنے لگی۔ اسے معذور بچوں سے غیر معمولی ہمدردی تھی۔ اسی ہمدردی نے اس سے، تین سے سات سال تک کی عمر کے بچوں کے لیے تعلیمی اسکیم ایجاد کرائی۔ وہ بھی فروبل کی طرح کتابی علم کے بجائے کھیلوں کے ذریعے تعلیم دینے کی قائل تھی۔ یہ اسکیم دراصل کنڈرگارٹن ہی کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ دونوں میں برائے نام ہی فرق ہے۔ مانٹسوری کی اسکیم کے مطابق ہمارے ملک میں بھی متعدد مدارس چل رہے ہیں۔ وہ

ہمارے ملک کے دورے پر بھی آئی تھی۔۱۹۵۲ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ یہ اسکیم اب بارہ سال تک پھیلا دی گئی ہے۔

بنیادی اصول:

مانٹسوری اسکیم مندرجہ ذیل اصولوں پر مبنی ہے:

- ☆ بچے کو مکمل آزادی دی جائے اس کے بغیر اندرونی صلاحیتوں کی نشوونما ممکن نہیں۔
- ☆ شخصیت کے تمام پہلوؤں کی طرف عمومی اور جسمانی اور حواس کی تربیت کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔
- ☆ بچوں کو خود کر کے سیکھنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔
- ☆ حواس کی مناسب تربیت کی جائے خصوصاً چھونے کی حس (قوت لامسہ) کی کیونکہ اوائل عمری میں یہی بنیادی حس ہوتی ہے۔ حواس ہی علم کے ذرائع ہیں اور خارجی دنیا کے بارے میں جتنی معلومات بھی ہمارے دماغ تک پہنچتی ہیں وہ انہی راستوں سے جاتی ہیں اس لیے حواس کی جتنی اچھی تربیت ہوگی۔ اتنی ہی واضح معلومات اور پختہ علم ہوگا۔ اگر حواس ناقص ہوں تو معلومات بھی ناقص ہی حاصل ہوں گی۔
- ☆ بچوں کو اپنی مدد آپ کرنے کے لائق بنایا جائے۔ (مانٹسوری اسکولوں میں اس کا پورا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بچے خود صفائی کرتے، ہاتھ منہ دھوتے، غسل کرتے، اپنا سامان ترتیب سے رکھتے، تعلیمی سامان اور کرسیاں خود اٹھاتے دھرتے، لباس خود بدل لیتے اور اپنے کاموں کے کسی محتاج نہیں رہتے۔ اور یہ سب کام کسی خارجی دباؤ سے نہیں بلکہ آزادی کی فضا میں کرائے جاتے ہیں)
- ☆ بچوں کو جسمانی سزا ہرگز نہ دی جائے۔
- ☆ کھیل کھیل میں تعلیم دی جائے۔

☆ اخلاقی تربیت کی جائے لیکن اس ضمن میں سختی ہرگز نہ برتی جائے بلکہ خوش وخرم اور آزاد رہ کر خود انضباطی سکھانے کی فکر کی جائے۔

مانٹسوری اسکول:

اسکول کی عمارت عموماً ہوادار اور کھلے مقامات پر واقع، صاف ستھری اور آراستہ ہوتی ہے۔ قریب ہی سایہ دار درخت اور صحن میں پھول پودے لگے ہوتے ہیں۔ کمروں کی دیواریں خوش رنگ تصاویر وغیرہ سے آراستہ رہتی ہیں۔ نہانے، دھونے اور کھانے پینے کے لیے الگ الگ کمرے ہوتے ہیں۔ بیچ میں ایک بڑا ہال ہوتا ہے جسے خاص طور پر آراستہ کیا جاتا ہے۔ اس میں چھوٹی کرسیاں پڑی ہوتی ہیں جو اتنی ہلکی ہوتی ہیں کہ بچے خود اٹھا کر ادھر ادھر لے جا سکتے ہیں۔ کمروں میں چھوٹے چھوٹے تختہ سیاہ ہوتے ہیں جن پر بچے اپنی پسند کی تصاویر بنا سکتے ہیں۔ الماریوں میں اتنی بلندی پر تعلیمی سامان ترتیب سے لگائے جاتے ہیں کہ بچے بآسانی وہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ ایک کمرہ ان کی تفریح اور دل بہلاؤ کے لیے مخصوص ہوتا ہے، اسے خاص طور سے آراستہ کیا جاتا ہے اور بچوں کی دلچسپی کے اس میں متعدد سامان رکھے جاتے ہیں۔ وہاں بچے آزادی سے بات چیت کر سکتے ہیں۔ ہنس بول اور گا بجا سکتے ہیں۔ عام طور پر معلمات سے کام لیا جاتا ہے۔ معلمہ وہیں آ کر بچوں کو قصے کہانیاں سناتی اور بچوں کا دل بہلاتی ہے۔ اس کمرے میں صوفے اور گدے دار اسٹول بھی ہوتے ہیں جن پر بچے آزادی سے لیٹ بیٹھ سکتے ہیں۔ کھانے، سونے، کھیلنے وغیرہ کے سلسلے میں ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ بچے مدرسے کو بالکل اپنا گھر سمجھتے ہیں۔

تعلیمی آلات وسامان:

مانٹسوری اسکول میں تعلیمی آلات وسامان کی بہت زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔ وہاں لکڑی کے طرح طرح کے ٹکڑے اور کھلونے استعمال کیے جاتے ہیں۔ سامان کی ایک مختصر فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ لکڑی کے طرح طرح کے رنگین ٹکڑے جو گول، تکونے، چوکور، لمبے اور بیلن کی شکل میں ہوتے ہیں۔

۲۔ مختلف وزن کی ٹکیاں۔

۳۔ کارڈوں کے سیٹ (جن کی مدد سے حروف تہجی، الفاظ اور گنتیاں وغیرہ سکھائی جاتی ہیں)

۴۔ طرح طرح کی گھنٹیاں وغیرہ۔

ان آلات وسامان کے ذریعے بچوں کے حواس کی تربیت کی جاتی ہے اور انہیں چکنے، کھردرے، ملائم، سخت، گرم، سرد، وزنی ہلکے وغیرہ کا تصور دلایا جاتا ہے۔ مختلف رنگوں اور شکلوں کی پہچان کرائی جاتی ہے۔ مختلف قسم کی آوازوں میں فرق کرنا سکھایا جاتا ہے۔

مانٹسوری کی توجہ پہلے لکھنا پڑھنا وغیرہ سکھانے کی طرف نہیں تھی لیکن بعد میں یہ چیزیں بھی شامل کر لی گئیں۔ چنانچہ اب اس اسکیم میں چھوٹے بچوں کو دلچسپ انداز اور تعلیمی سامان کی مدد سے پڑھنا لکھنا، بولنا اور گننا وغیرہ بھی سکھایا جاتا ہے۔ باغبانی اور روزمرہ کے عملی کاموں کے ذریعہ عملی تربیت بھی کی جاتی ہے۔

خوبیاں:

اس طریقہ تعلیم میں متعدد خوبیاں ہیں۔

☆ طلبہ پر انفرادی توجہ دی جاتی ہے۔

☆ چھوٹے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے یہ اسکیم تجربے سے مفید اور موثر ثابت ہوئی ہے حواس کی تربیت پر غیر معمولی توجہ دی جاتی ہے۔

☆ جسمانی، عملی اور اخلاقی تربیت کا بھی مناسب بندوبست ہوتا ہے۔

☆ بچے مدرسے میں گھر کی سی فضا محسوس کرتے ہیں اور پوری آزادی سے دن بھر مختلف مصروفیات میں منہمک رہتے ہیں۔

☆ بچوں میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور وہ ابتدا ہی سے اپنی مدد آپ کرنا سیکھتے ہیں۔

☆ تعمیری صلاحیتوں کی نشو ونما کا مناسب بندوبست ہوتا ہے۔

☆ ''کھیل کھیل میں تعلیم'' اور ''کر کے سیکھنے'' کی متعدد خوبیاں اس میں بھی پائی جاتی ہیں۔

نقائص:

یہ طریقہ تعلیم بہت ہی گراں اور اکثریت کے لیے نا قابل برداشت ہے۔ بچوں کو کھیل کی حقیقی مسرت سے کسی حد تک محروم ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ تعلیمی اغراض مقدم ہونے کے باعث کھیل بھی ان کے لیے کام بن جاتے ہیں۔

☆ بچوں پر ذمہ داریوں کا بار قبل از وقت لادا دیا جاتا ہے۔

☆ قوت متخیلہ کی تربیت کی طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔

☆ انفرادی ترقی پر اتنا زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ اجتماعی اوصاف نظر انداز ہو جاتے ہیں اور بچوں میں عموماً خود غرضی پیدا ہوتی ہے۔

پھر بھی ننھے بچوں کی تعلیم کو دلچسپ، آسان اور موثر بنانے نیز ان کے حواس کی مناسب تربیت کرنے کے ضمن میں مانٹسوری کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

تعلیم وتربیت میں تعلیمی سامان وآلات کی غیر معمولی ضرورت کا احساس سب سے زیادہ اسی نے دلایا اور حواس کی تربیت کی طرف سب سے پہلے اس نے پوری شدت سے متوجہ کیا۔

کنڈر گارٹن اور مانٹسوری اسکیم کا مقابلہ:

مماثلت:

۱۔ دونوں میں ننھے بچوں (۳۔۷ سال) کی تعلیم کا مفصل عملی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

۲۔ بچوں کی اندرونی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے پر دونوں میں غیر معمولی توجہ دی گئی ہے۔

۳۔ تعلیم وتربیت میں تعلیمی سامان سے مدد لینے پر دونوں میں بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے۔

۴۔ حواس کی تربیت کی طرف دونوں میں توجہ دی جاتی ہے۔ اگرچہ مانٹسوری نے اس کا بہتر انتظام کیا ہے۔

۵۔ آزادی اور مسرت کی فضا میں تعلیم دینے کا دونوں میں پورا لحاظ کیا جاتا ہے۔

۶۔ خود کر کے سیکھنے اور کھیل کھیل میں تعلیم دینے پر دونوں میں زور دیا جاتا ہے۔

۷۔ مدرسے کا ماحول دلچسپ اور خوشگوار بنانے نیز گھر کی سی فضا محسوس کرانے کی دونوں میں فکر کی جاتی ہے۔

فرق

کنڈرگارٹن	مانٹسوری اسکیم
۱۔ اجتماعی اوصاف پیدا کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔	۱۔ انفرادی ترقی کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔
۲۔ بنیادیں فلسفیانہ ہیں کیونکہ فروبل فلسفی تھا۔	۲۔ بنیادیں سائنسی ہیں کیونکہ مانٹسوری ڈاکٹر تھی۔
۳۔ اجتماعی انداز سے تعلیم دی جاتی ہے۔	۳۔ جماعتی تعلیم کے ردعمل میں زیادہ تر انفرادی حیثیت سے تعلیم دی جاتی ہے۔
۴۔ حواس کی تربیت تحائف اور کھلونوں کی مدد سے کی جاتی ہے۔	۴۔ حواس کی تربیت کے لیے تعلیمی سامان وآلات سے کام لیا جاتا ہے۔
۵۔ بغیر تحائف کے بھی تعلیم دی جا سکتی ہے اس لیے مختلف مدارس جزوی ردوبدل کر کے اپنے ہاں چلا سکتے ہیں۔	۵۔ بغیر سامان وآلات کے تعلیم نہیں دی جا سکتی اس لیے اسے اپنانے میں عام طور پر دشواریاں پیش آتی ہیں۔
۶۔ دستی مشاغل اور کھیل پر زور دیا جاتا ہے۔	۶۔ عملی زندگی سے متعلق کاموں پر توجہ دی جاتی ہے۔

٦۔ منصوبی طریقہ (پروجیکٹ میتھڈ)

منصوبہ ایسی اسکیم یا خاکے کو کہتے ہیں جو وسیع پیمانے پر شروع ہونے والے کسی کام سے متعلق پہلے سے تیار کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً منگلا ڈیم پروجیکٹ۔

تعلیمات کی اصطلاح میں منصوبہ ایسے حل طلب مسائل کو کہتے ہیں جس میں عملی کام پایا جائے اور جس کی تکمیل اس کے فطری موقف وماحول میں ہو۔ مثلاً عید کے دن بچوں کا مل جل کر عید منانا، بیماریوں کے تحفظ کے لیے نالیاں صاف کرنا۔

منصوبی طریقہ تعلیم کا سہرا امریکہ کے سر ہے۔ اس کی ابتداء ۱۸۸۹ء میں امریکہ کے رچرڈ سن نے کی۔ کلپیٹرک نے اس میں جزوی اصلاح وترمیم کی اسٹیونس نے ۱۹۲۱ء میں اس کو تکمیل تک پہنچایا۔ یہ اسکیم ابتدائی درجات کے طلبہ کے لیے ہے۔

منصوبی طریقے پر عمل کیسے ہوتا ہے:

اس پر عمل کے مندرجہ ذیل اقدام ہوتے ہیں:

۱۔ **مخصوص صورت حال پیدا کرنا:** سب سے پہلے معلم کسی عنوان پر بات چیت یا بحث مباحثے کے ذریعے بچوں کے سامنے مخصوص صورت حال رکھتا ہے، مثلاً چھٹیاں کہاں اور کس طرح گزاریں۔ کوئی تہوار یا تقریب کیونکر منائیں۔ سیر وسیاحت کے مواقع کس طرح نکالیں، آبادی کو بیماریوں سے محفوظ رکھنے، معذوروں کی امداد کرنے، لوگوں کو نماز کا پابند بنانے، نادار طلبہ کی امداد کرنے کی کیا صورت کریں وغیرہ۔

۲۔ **مناسب منصوبے کا انتخاب:** صورت حال سامنے آنے پر طلبہ بحث ومباحثہ اور آپس میں صلاح ومشورہ کر کے منصوبے کا انتخاب کرتے ہیں۔ انتخاب میں پوری آزادی دی جاتی ہے تاکہ بچوں کا اپنا ذوق، خواہش اور ارادہ شامل ہو اور وہ پوری تندہی سے کام کریں۔ انتخاب کے وجوہ ہر ایک سے قلم بند کرا دیے جاتے ہیں۔

۳۔ تکمیل کا عہد: انتخاب کے بعد منصوبے کو خوش اسلوبی کے ساتھ تکمیل تک پہنچانے کا طلبہ سے عہد لیا جاتا ہے۔

۴۔ خاکہ مرتب کرنا: منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اب مکمل خاکہ تیار کیا جاتا ہے۔ یہ کام معلم کی رہنمائی میں خود طلبہ انجام دیتے ہیں۔ طلبہ سے تجویزیں مانگی جاتی ہیں۔ ہر ایک کو عملی دلچسپی لینے پر اکسایا جاتا ہے۔ تجاویز پر غور ہوتا ہے اور پورا خاکہ مرتب کر کے لکھ لیا جاتا ہے۔

۵۔ عملی جامہ پہنانا: منصوبے کا یہ سب سے بڑا حصہ ہوتا ہے۔ اس میں مختلف قسم کی مصروفیات و مشاغل ہوتی ہیں مثلاً معلومات فراہم کرنا، لکھنا پڑھنا، مختلف مقامات کی سیر، نقشہ جات اور کتب کا مطالعہ، مختلف لوگوں سے خط و کتابت، بازار سے بھاؤ معلوم کرنا۔ مصارف کا اندازہ لگانا اور پورے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانا، خاکہ مرتب ہو جانے کے بعد طلبہ کو انفرادی و اجتماعی حیثیت سے مختلف قسم کی ذمہ داریاں سونپ دی جاتی ہیں۔ استاد اپنی نگرانی میں پورے منصوبے کو عملی جامہ پہنواتا ہے۔ حسب ضرورت خاکہ میں تبدیلی کی پوری گنجائش رکھی جاتی ہے۔ ہر بچے کو عملی دلچسپی لینے اور منصوبے میں ہاتھ بٹانے پر اکسایا اور اس کا موقع دیا جاتا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ حتی الامکان بچوں کو خود کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع ملیں۔

۶۔ جائزہ: کام کی تکمیل کے بعد پورے کام کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس جائزے سے طلبہ کو اپنی غلطیاں اور کوتاہیاں معلوم کرنے میں آسانی ہوتی ہے، اس طرح وہ آئندہ محتاط ہو جاتے ہیں۔

۷۔ ریکارڈ رکھنا: طلبہ ایک کاپی میں پورے منصوبے کا ریکارڈ درج کر لیتے ہیں مثلاً کیا مباحثے ہوئے، کیا تجاویز آئیں، کس طرح اور کیا خاکہ بنا، کیسے عملی جامہ پہنایا گیا، کون سی کتابیں پڑھی گئیں، کس طرح کام تقسیم ہوئے، کن سے امداد لی گئی وغیرہ۔

خوبیاں:

پرائمری درجات کے بچوں کے لیے یہ طریقہ مختلف حیثیتوں سے بہت مفید اور موثر ہے کیونکہ

☆ نفسیات کے اصولوں کے عین مطابق ہے۔ بچوں کے سامنے منصوبے کی پوری غرض وغایت ہوتی ہے۔ وہ خود کر کے اسے تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ انہیں کام کا پورا موقع ملتا ہے۔ تعلیمی کام میں ان کے ارادے کو دخل ہوتا ہے۔ اس لیے وہ پوری توجہ انہماک اور دلچسپی سے کام کرتے ہیں۔

☆ علم کا زندگی سے گہرا ربط ہوتا ہے اور ساری معلومات ذہن میں منظم اور مربوط شکل میں آتی ہیں۔

☆ تدریس میں بچے کو مجہول سامع کے بجائے فعال کارکن کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

☆ ترقی کی رفتار کا بچوں کو خود بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اور دوسرے بھی بآسانی اس کی صلاحیتوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

☆ بچوں کو اپنی رائے کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔

☆ علم و ہنر کے سیکھنے میں سرعت، عمدگی اور پختگی آتی ہے۔

☆ نظری کی بجائے بچے عملی انسان بنتے ہیں۔

☆ ذمہ داریاں اٹھانے کی تربیت ہوتی اور بچوں میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

☆ جم کر محنت کرنے اور کام کو تکمیل تک پہنچانے کی عادت پڑتی ہے۔

☆ اجتماعی منصوبہ بندی اور مل جل کر کام کرنے کا تجربہ ہوتا ہے۔

☆ حافظہ پر زور کم پڑتا ہے اور ذہنی و تخلیقی قوتوں کی نشو ونما ہوتی ہے۔

☆ مطالعہ کا شوق اور مسائل خود حل کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

خامیاں:

☆ بچے جو کچھ سیکھتے ہیں اس کے مشق واعادے کا انہیں موقع نہیں ملتا۔
☆ بہت سی معلومات وقتی ضروریات سے متعلق ہوتی ہیں جن کی کوئی مستقل قدر و قیمت نہیں ہوتی۔
☆ دستی کام بہت زیادہ اور علمی کام بہت کم ہو پاتا ہے۔
☆ تعلیمی مواد غیر منظم ہوتا ہے۔ مجوزہ نصاب الٹ جاتا ہے۔
☆ نصاب کے بعض حصوں پر بہت زیادہ وقت صرف ہو جاتا ہے اور بعض حصے نظر انداز ہو جاتے ہیں۔
☆ موزوں درسی کتب کی تیاری اور اہل اساتذہ کی فراہمی میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس طریقے سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ اگر کبھی کبھی تعطیلات وغیرہ میں یا روزانہ چند گھنٹے اس طریقے سے تعلیم ہو۔ باقی عام طریقے سے نصاب کی تکمیل کرائی جائے تو بلاشبہ بچوں کے لیے بہت مفید ہوگا۔ مدرسے کی تقریبات، ادارے اور آس پاس کی صفائی، تعلیمی سیر و سیاحت وغیرہ کے ضمن میں اس طریقے پر ضرور عمل ہونا چاہیے۔ اس سے طلبہ دلچسپی سے کام کریں گے اور انہیں کافی فائدہ پہنچے گا۔

۷۔ ڈالٹن پلان:

جماعتی تعلیم کی خامیوں کا اوپر تذکرہ آچکا ہے۔ ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے جدید دور میں متعدد کوششیں ہوئی ہیں۔ ان میں ڈالٹن پلان سب سے اہم ہے۔ اس کی موجد امریکہ کی مس پارک ہرسٹ ہے جس نے ۱۹۲۰ء میں ڈالٹن کے ہائی سکول میں اس کا تجربہ کیا۔ یہ طریقہ ثانوی جماعتوں کے طلبہ کے لیے بہت مفید ہے، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ:

☆ مروجہ جماعتی نظام میں جزوی تبدیلی اور معمولی مصارف سے کام چلایا جا سکتا ہے۔

☆ نصاب میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں پڑتی۔

☆ طلبہ کو ان کی فطری رفتار سے آگے بڑھانے میں امداد ملتی اور ان کی انفرادیت برقرار رہتی ہے۔

☆ طریقہ تعلیم بھی نہایت سادہ اور آسان ہے۔

پلان کا تعارف:

اس اسکیم میں

☆ اساتذہ کو سال بھر کا کام مضمون وار اس انداز سے ترتیب دینا پڑتا ہے کہ ہر مضمون کا پھیلاؤ اور اس ضمن میں انہیں کیا کرنا ہے طلبہ کو اس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

☆ سال بھر کے کام کو ایک ایک ماہ کی میقات میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

☆ عمومی قاعدے بتا کر طلبہ سے مقررہ مدت میں کام کی تکمیل کا معاہدہ لیا جاتا ہے۔

☆ دوران میقات کام میں زحمتوں اور مشکلات کو دور کرنے میں اجتماعی وانفرادی امداد دی جاتی ہے۔

☆ ایک میقات میں جتنا کام تفویض کیا جاتا ہے اس کی تکمیل کے بعد دوسرا کام دیا جاتا ہے۔

☆ طلبہ کی امداد کے لیے مضمون وار اساتذہ اور لائبریریاں ہوتی ہیں، کتابیں، چارٹس، تعلیمی سامان وغیرہ بکثرت ہوتے ہیں تاکہ پوری جماعت بیک وقت استفادہ کر سکے۔

☆ روزانہ نصف وقت طلبہ انفرادی طور پر یا گروپ میں اپنی مرضی سے تعلیمی کام کرتے ہیں باقی نصف وقت اجتماعی مشکلات دور کرنے اور نیا اصول سکھانے کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔

☆ جماعت کو کانفرنس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ طلبہ کو کانفرنس کے ارکان درجے کو دار العمل کہتے ہیں، کام کو تفویض، کام کی تکمیل کے وعدے کو معاہدہ کا نام دیا جاتا ہے، اور مدت تکمیل کو میقات کا۔

☆ ایک کام ختم کر کے بچے دوسرے کام لے سکتے ہیں بشرطیکہ استاد مطمئن ہو۔
☆ بچے الگ الگ کام کریں، یا مل جل کر یہ ان کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے۔
☆ کام اور ترقی کی رفتار معلوم کرنے کے لیے اساتذہ اور طلبہ دونوں کے پاس چارٹ ہوتا ہے۔ طالب علم کے پاس ایک چارٹ مضمون وار ہوتا ہے۔ دوسرا مجموعی۔

فوائد:

اس پلان کو اپنانے سے مندرجہ ذیل فوائد متوقع ہوتے ہیں:

☆ ہر طالب علم اپنی رفتار سے آگے بڑھتا ہے۔ اس لیے ذہین اور غبی دونوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔
☆ ذمہ داری لینے اور تکمیل کا معاہدہ کرنے کی وجہ سے سست رفتار طلبہ بھی سخت محنت کر کے اپنا کام مکمل کرتے ہیں۔
☆ طلبہ صرف استادوں ہی پر بھروسہ نہیں کرتے، بلکہ کتابوں، چارٹوں، پوسٹروں وغیرہ سے اپنے طور پر بھی استفادہ کر لینے کی ان میں صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔
☆ تحقیق وجستجو کا ذوق پروان چڑھتا ہے۔
☆ معاہدے کی وجہ سے طالب علم توجہ اور دلچسپی سے کام کرتا ہے کیونکہ اس طریقۂ تعلیم میں خود اس کا ارادہ شامل ہو جاتا ہے۔
☆ طلبہ کی حیثیت انفعالی نہیں بلکہ فاعلی ہوتی ہے۔ وہ مجہول سامع نہیں بنتے بلکہ خود کر کے سیکھتے ہیں۔
☆ استاد اور طالب علم دونوں کو رفتار ترقی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔
☆ ہر مضمون کو ضرورت کے مطابق وقت ملتا ہے۔ اس لیے کمزور مضامین پر مناسب توجہ دے کر کمزوری دور کرائی جا سکتی ہے۔
☆ بغیر خارجی دباؤ کے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی تربیت دیتی ہے۔

☆ بچے کو آزادی ہوتی ہے کہ وہ جب اور جتنا چاہے پڑھے، ہوم ورک کی ضرورت نہیں پڑتی۔
☆ نظم وضبط کا مسئلہ زیادہ پریشان کن نہیں رہ جاتا کیونکہ ہر فرد اپنے اپنے کام میں منہمک رہتا ہے۔
☆ بچہ محسوس کرتا ہے کہ اس پر اعتماد کیا جارہا ہے۔ چنانچہ وہ اس اعتماد کو مجروح نہیں ہونے دیتا۔ اسے گھنٹہ بجتے ہی کام چھوڑنے یا نئے کام پر لگنے یا نظام الاوقات کی پابندی کرنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔
☆ محدود وقت میں امتحانات کے ذریعے جائزہ لینے کے مقابلے میں گراف اور روزانہ کے کام کی تفصیلات کے ذریعے ترقی کی رفتار کا صحیح اندازہ کرنے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے۔

نقائص:

اس اسکیم کے اپنانے میں بعض دشواریاں بھی ہوتی ہیں، مثلاً:
☆ ایسی حوالہ جاتی کتب جن سے کم عمر طلبہ اپنے طور پر استفادہ کرسکیں کمیاب بلکہ نایاب ہیں۔
☆ بیشتر اساتذہ نئی اسکیموں پر تجربہ کرنے کے قائل نہیں ہوتے، انہیں طلبہ کی آزادی کھلتی ہے۔ چنانچہ وہ اس طریقے کو اپنانے پر آمادہ نہیں ہوتے۔
☆ بہت بڑی لائبریری اور بہت زیادہ تعلیمی سامان کی ضرورت پیش آتی ہے جو چند ہی ادارے فراہم کرسکتے ہیں۔
☆ مناسب تفویضات تجویز کرنے کے لیے اچھی لیاقت وصلاحیت، تحقیقی ذوق اور کافی تجربے کی ضرورت ہوتی ہے جن سے بیشتر اساتذہ محروم ہوتے ہیں۔
☆ بہت سے مضامین، مشاغل کی تعلیم اجتماعی طور پر مناسب ہوتی ہے۔ مثلاً نظم، زبانی اسباق، غیر نصابی مشاغل، ڈرل وغیرہ۔
☆ بعض بچے آزادی پاکر کام ہی نہیں کرتے۔

ان نقائص کے باوجود اسکیم سے فائدہ اٹھانے کے لیے طلبہ سے کچھ کام اس انداز سے بھی لینا چاہیے۔ ہر سبق پڑھا چکنے کے بعد انفرادی طور پر کرنے کے لیے کچھ تحریری یا عملی کام تفویض کیا جانا چاہیے۔ خاکہ بنوا کر اور حوالہ جات بتا کر مضامین لکھنے یا تقاریر تیار کرنے پر بچوں کو آمادہ کرنا چاہیے۔ اس طرح وہ کتابوں سے اپنے طور پر بھی استفادہ کرنا سیکھیں گے۔

............☆☆☆..........

باب ۳۳:

واردھا (بیسک) اسکیم

اس اسکیم کے محرک گاندھی جی تھے۔ موصوف نے اپنے اخبار ہریجن (۱۹۳۷ء) میں قومی بنیادی تعلیم کا ایک خاکہ پیش کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ "تعلیم کسی حرفے کی مدد سے مادری زبان میں اور خود کفیل ہونا چاہیے۔" کانگریس اس وقت سات صوبوں میں برسر اقتدار تھی۔ ان صوبوں کے وزرائے تعلیم نے ۲۲، ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو واردھا میں زیر صدارت گاندھی جی منعقدہ اپنی کانفرنس میں چند بنیادی اصول طے کیے اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (نائب صدر جمہوریہ بھارت) کی زیر صدارت ایک کمیٹی بنا دی گئی جس نے اسکیم کا مفصل خاکہ تیار کیا۔ وزراء کے طے کردہ بنیادی اصول یہ تھے۔

☆ سات سے چودہ سال کی عمر تک تمام بچوں کے لیے مفت لازمی تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔

☆ ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو۔

☆ کسی بنیادی حرفے کو مرکزی حیثیت دے کر تعلیم دی جائے اور دوسرے تمام مضامین، حتی الامکان اس سے مربوط کر کے پڑھائے جائیں۔

☆ تعلیم خود کفیل ہو (یعنی دوران تعلیم مختلف بنیادی حرفہ جات کے تحت بچوں کی محنت سے جو آمدنی ہو، اس سے تعلیم کے مصارف پورے ہو جائیں۔ یہاں تک کہ اساتذہ کی تنخواہیں بھی نکل آئیں اور سات سالہ تعلیم کی تکمیل کے بعد طلبہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں اور اپنی روزی خود کمانے کے قابل ہو جائیں)۔

☆ عدم تشدد کی روح کار فرما ہو۔

کمیٹی نے مفصل اسکیم میں ان امور کو پیش نظر رکھنے کے ساتھ مندرجہ ذیل پہلوؤں پر بھی

توجہ دی۔

☆ تعلیم کے ذریعے ایسے کار آمد شہری بنائے جائیں جو سماج پر بوجھ بننے کے بجائے اپنی محنت سے اس کی خدمت کر سکیں اور جن کو شہریت کے حقوق وفرائض کا پاس ولحاظ ہو۔

☆ تعلیم بچوں کی روزمرہ کی زندگی سے مربوط ہو۔ ہر نئی بات حرفہ جات یا فطری وسماجی ماحول سے مربوط کر کے پیش کی جائے۔

☆ اطفال کی تعلیم (سات سال سے قبل) سرپرستوں اور نجی اداروں کی صوابدید پر چھوڑ دی جائے۔ البتہ حکومت اطفال کے کچھ ماڈل اسکول قائم کرے۔

☆ تعلیم کا معیار سات سال میں انگریزی حذف کر کے ہائی اسکول کے برابر ہو۔

☆ طلبہ کی تیار کی ہوئی اشیاء کی خرید وفروخت مملکت کے ذمہ ہو۔

☆ نظری کے بجائے عملی پہلو پر زیادہ سے زیادہ توجہ ہو۔

☆ اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے لائق اساتذہ تیار کیے جائیں۔ ٹریننگ کا کورس دو طرح کا ہو، ایک جونیئر اور ایک سینئر۔

☆ امتحانات کا موجودہ نظام ختم کر کے ترقی چارٹ رکھے جائیں اور جدید طرز سے (Test) لیے جائیں۔

☆ ایک تعلیمی بورڈ ہو جو نصاب، طریق تعلیم اور جانچ کے مفید طریقوں وغیرہ پر تجربات کرے۔

موجودہ معائنہ افسروں کی جگہ ایسے سپروائزر مقرر کیے جائیں جو تعلیمات کا ذوق رکھتے ہوں اور اساتذہ کی بروقت رہنمائی کر سکیں۔

اسے بیسک (بنیادی) اسکیم اس لیے جاتا ہے کہ:

☆ اتنی تعلیم تو ہر شہری کی بنیادی ضرورت ہے جس سے بہر حال اسے بلالحاظ مذہب وملت آراستہ ہونا چاہیے۔

☆ اس میں بنیادی حرفہ جات سے مربوط کر کے تعلیم دینے کا انتظام کیا گیا ہے۔

☆ طلبہ کی بنیادی ضروریات اور دلچسپیوں کا اس میں لحاظ رکھا گیا ہے۔

مجوزہ نصاب ونظام الاوقات:

سات سالہ مجوزہ نصاب مندرجہ ذیل مضامین ومشاغل پر مشتمل ہے۔

۱ بنیادی حرفہ (کتائی، بنائی، باغبانی، دفتی یا چمڑے کا کام وغیرہ)

۲ مادری زبان۔

۳ ریاضی۔

۴ سماجی علوم (تاریخ، جغرافیہ اور علم تمدن)

۵ عام سائنس (مطالعہ قدرت حفظان صحت، وظائف اعضاء، نباتیات، حیوانیات، علم کیمیا، علم طبیعات وغیرہ کے مبادیات)

۶ آرٹ (پینٹنگ اور ڈرائنگ)

۷ میوزک (سرود ونغمہ)

۸ ہندوستانی (شمالی ہند میں بولی جانے والی عام فہم زبان جو ناگری رسم الخط میں ہندی اور فارسی رسم الخط میں اردو کہلاتی ہے)

مجوزہ نصاب کے بعض اہم پہلو:

☆ انگریزی کو نصاب سے بالکل خارج کر دیا گیا ہے۔

☆ ہندوستانی زبان کو ملک کی قومی زبان تسلیم کر لیا گیا ہے اور پانچویں چھٹی جماعت میں اسے ان علاقوں میں بھی لازمی قرار دیا گیا ہے جہاں دوسری زبانیں بولی جاتی ہیں۔

☆ گیارہ سال تک مخلوط تعلیم اور لڑکے لڑکیوں کے لیے ایک ہی نصاب تجویز کیا گیا ہے۔ البتہ آخری دو درجات میں لڑکوں کے لیے، جنرل سائنس اور لڑکیوں کے لیے امور خانہ داری

رکھا گیا ہے۔

☆ مذہبی تعلیم کے لیے کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ البتہ اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اساتذہ سارے مذاہب کی ''مشترکہ سچائیوں'' کی جھلک اپنی عملی زندگی میں پیدا کریں تاکہ طلبہ ان کی تقلید کرسکیں اور کتابوں کے بجائے اپنے عمل سے اس کی تعلیم دیں۔

نظام الاوقات:

مجوزہ نظام الاوقات یہ ہے:

ا۔	بنیادی حرفہ:	۳ گھنٹے	۲۰ منٹ روزانہ
۲۔	ریاضی، ڈرائنگ، میوزک		۴۰ منٹ روزانہ
۳۔	مادری زبان		۴۰ منٹ روزانہ
۴۔	سماجی علوم اور عام سائنس		۳۰ منٹ روزانہ
۵۔	جسمانی تربیت		۱۰ منٹ روزانہ
۶۔	وقفہ		۱۰ منٹ روزانہ

میزان کل ۵ گھنٹے ۳۰ منٹ روزانہ

بیسک اسکیم میں تبدیلیاں:

مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد اصل اسکیم میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں آچکی ہیں۔

☆ اطفال کی تعلیم کو بھی اسکیم میں شامل کرلیا گیا ہے۔ چھ سال سے چودہ سال تک (آٹھ درجات پر مشتمل) تعلیم ہوتی ہے۔ پانچ سال کے بچوں کو بھی درجہ اول میں داخل کیا جاسکتا ہے۔ یہ مدت دو مراحل میں تقسیم کردی گئی ہے۔

ا اول تا پنجم جونیئر بیسک اسکول

۲ ششم تا ہشتم سینئر بیسک اسکول

- ☆ تعلیم کا نظام، سٹیٹ اپنے مصارف سے چلاتی ہے۔ خودکفیل ہونے کی شرط ہٹادی گئی ہے۔
- ☆ چھٹی جماعت سے انگریزی کے لیے گنجائش نکالی گئی ہے۔
- ☆ ہندوستانی زبان لازمی نہیں رہی ہے۔
- ☆ ابتدائی درجات میں ایک سے زائد حرفہ جات کا انتظام کیا گیا ہے اور سینئر بیسک میں کسی ایک حرفے میں خصوصی مہارت حاصل کرنے کی گنجائش دی گئی ہے۔

خصوصیات:

اس اسکیم کے مویدین اس میں مندرجہ ذیل خوبیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

- ☆ بچوں کو خود کر کے سیکھنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع ملتے ہیں۔ اس لیے تعلیم میں وہ پوری دلچسپی لیتے ہیں اور جو کچھ سیکھتے ہیں اسے زندگی میں برت بھی سکتے ہیں۔ اور ان کی معلومات ٹھوس اور مستحکم ہوتی ہیں۔
- ☆ نظری کے بجائے عملی انسان بنتے ہیں اور ہاتھ سے کام کرنے میں وہ کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔
- ☆ اس سے بیکاری و بےروزگاری کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔
- ☆ اس سے اجتماعی اور شہری اوصاف پروان چڑھتے ہیں اور مل جل کر کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔
- ☆ دل ودماغ آنکھ اور ہاتھ سب کی ایک ساتھ اور متوازن تربیت ہوتی ہے کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہوتا۔
- ☆ طلبہ کو اس لائق بناتی ہے کہ وہ اپنے آبائی پیشے یا کسی اور مفید مشغلہ کے ذریعے قومی دولت میں اضافہ کر سکیں۔
- ☆ مملکت کی صنعتی ترقی میں معاون ہے۔

☆ مادری زبان کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے اس لیے تعلیم زیادہ موثر ہوتی ہے۔

☆ شہری ودیہاتی تعلیم میں یکسانیت پیدا ہوتی ہے۔ بنیادی تعلیم کی حد تک پورے ملک میں ایک ہی تعلیم نظام زیرعمل آتا ہے۔

☆ ہاتھ کے کاموں کی قدروقیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

☆ بچوں کی نفسیات، اصول تعلیم اور قومی وملکی امنگوں کے عین مطابق ہے وغیرہ۔

تنقید:

یہ اسکیم اب اگرچہ جزوی اختلاف کے ساتھ پورے ہندوستان میں رائج ہو چکی ہے اور ہر اسٹیٹ نے ابتدائی تعلیم کی حد تک اسے تسلیم کر کے اس کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا ہے لیکن ہمیشہ سے یہ تنقید کا غیر معمولی ہدف رہی ہے اور اتنی تبدیلیوں کے باوجود اس پر اب بھی متعدد اعتراضات کیے جاتے ہیں مثلاً

☆ بچے کو مرکزی حیثیت دینے کے بجائے اس میں حرفے کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔

☆ مذہبی تعلیم کو نصاب سے خارج کر کے دین اور مذہب واخلاق سے نئی نسلوں کا رشتہ کاٹ دیا گیا ہے۔

☆ باقاعدہ مذہبی تعلیم کی تو گنجائش نہیں دی گئی ہے لیکن کلچر کے نام سے ایک ہی فرقے کے معتقدات کو سب پر تھوپنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

☆ اصل اسکیم کا یہ پہلو ناممکن العمل ہے کہ ابتدائی تعلیم خود کفیل ہو۔ اگر اس پر عمل کیا جائے تو طلبہ کا سارا وقت اساتذہ کے لیے روٹی پیدا کرنے پر صرف ہو جائے گا۔ بچوں پر اس طرح کا بارڈالنا بھی صحیح نہیں ہے۔

☆ دستور ہند نے چودہ سال کی عمر تک مفت لازمی تعلیم کا انتظام اسٹیٹ کی ذمہ داری قرار دیا ہے اس دفعہ کی موجودگی میں یہ جزیوں بھی بے معنی سا ہے۔

☆ اس اسکیم کی وجہ سے بچوں کے ذریعے خام اشیاء کی بہت زیادہ بربادی ہوتی ہے۔

☆ مدارس کارخانوں میں تبدیل ہو گئے ہیں کیونکہ حرفہ جات ہی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور مدارس کی کامیابی انہی سے ناپی جاتی ہے چنانچہ علمی پہلو بہت زیادہ نظر انداز ہو گیا ہے۔

☆ اس کو حسن وخوبی چلانے کے لیے موزوں اساتذہ اور درسی کتب کی فراہمی بہت مشکل ہوئی۔

☆ بچوں کے انفرادی فرق کو اس اسکیم میں بھی نظر انداز کر کے سب کے لیے ایک ہی نصاب تجویز کیا گیا ہے۔

☆ صنعت وحرفت کو غیر معمولی اہمیت دے کر مادہ پرستی کی چاٹ لگا دی گئی ہے اور تمدنی ارتقاء نیز اخلاق وروحانیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

☆ مشین کے اس دور میں گھریلو صنعتوں یا معمولی حرفہ جات کو اتنی اہمیت دینا صنعتی ترقی میں مانع ہو سکتا ہے اور دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش چلنے میں ہم ناکام رہیں گے۔

☆ وحدت ادیان اور عدم تشدد کو بطور عقیدہ ومسلک لازمی بنیادی تعلیم کی روح قرار دینا آزادی رائے وضمیر کے حق کے منافی ہے۔

............☆☆☆............

باب ۳۴

متفرق مسائل

تعلیمی اداروں کو اپنے فرائض کی انجام دہی کے ضمن میں متعدد مسائل سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ان میں سے چند اہم امور پر ذیل میں بحث کی جارہی ہے۔

۱۔ حاضری کا مسئلہ

یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے جس سے تقریباً تمام تعلیمی اداروں کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ غیر سرکاری ابتدائی مدارس کو تو یہ مسئلہ اور زیادہ پریشان کرتا ہے۔ حاضری اور وقت کی پابندی کے معاملے میں اساتذہ اور طلبہ دونوں سے کوتاہیاں ہوتی ہیں جس کا تعلیم وتربیت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اساتذہ کی غیر حاضری یا دیر حاضری سے تعلیم کا نقصان تو ہوتا ہی ہے، درجے اور مدرسے کا نظم وضبط بھی بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ بچے درجے میں مار پیٹ، لڑائی جھگڑا اور شور وغل کرنے کے عادی ہوجاتے ہیں۔ درجے اور مدرسے کی فضا سے سنجیدگی رخصت ہوجاتی ہے۔ جھگڑے نمٹانے کے لیے کافی وقت خرچ کرنے اور نظم وضبط قائم کرنے کے لیے ڈنڈا استعمال کرنے کی ضرورت پیش آنے لگتی ہے۔ کپڑے پھٹتے، دواتیں الٹتی اور سامان برباد ہوتا ہے۔ بچے کی غیر حاضری سے جہاں صرف ایک بچے کا نقصان ہوتا ہے، معلم کی غیر حاضری، دیر حاضری یا درجے میں تاخیر سے پہنچنے کے نتیجے میں تیس چالیس طلبہ کی ایک پوری جماعت کا نقصان ہوتا ہے۔ دینی اداروں کے اساتذہ اور طلبہ کی طرف سے اس ضمن میں کوتاہیاں حیرت ناک بھی ہیں اور افسوس ناک بھی، کیونکہ جس ملت کے افراد پر روزانہ پانچ وقت کی نمازیں پابندئ وقت کے ساتھ فرض ہیں، جس کے افراد کو سات برس کی عمر سے نماز کی پابندی کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ جو لوگ وقت کو اللہ کی

امانت سمجھتے اور اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ ایک ایک لمحہ کا اللہ کو حساب دینا ہوگا۔ ان کو تو پابندئ وقت کے معاملے میں ساری دنیا کے سامنے بہترین نمونہ پیش کرنا چاہیے۔ عذر شرعی کے بغیر غیر حاضری یا دیر حاضری ان کے نزدیک تو کسی حال میں جائز نہیں۔ ایسی صورت میں کوتاہی کسی بنیادی خامی کا پتہ دیتی ہے جس کے ازالے کی بہر حال کوشش ہونی چاہیے۔

اساتذہ کی غیر حاضریوں کے عموماً مندرجہ ذیل اسباب ہوتے ہیں۔

۱۔ علالت یا صحت کی خرابی۔

۲۔ ہنگامی ضروریات کے تحت گھریلو مصروفیات۔

۳۔ اعزہ واقارب کی تقاریب میں شرکت یا ہاتھ بٹانا۔

۴۔ سستی و کاہلی یا احساس ذمہ داری وفرض شناسی کی کمی۔

۵۔ ادارے کے معمولات اور قواعد وضوابط کی پابندی کی طرف سے لاپروائی۔

جہاں تک پہلے اور دوسرے کا تعلق ہے بلاشبہ یہ معقول عذرات ہیں۔ اس طرح کی غیر حاضریاں ہر ادارے میں متوقع ہیں۔ البتہ اساتذہ میں ایسی اسپرٹ ہونی چاہیے کہ وہ مدرسے میں حاضری کو مقدم سمجھیں اور معمولی علالت یا ایسی ہنگامی ضرورت کو جس سے صرف نظر کیا جا سکتا ہو غیر حاضری کا بہانہ بنانے سے گریز کریں۔

رہا تقاریب کا معاملہ تو اس کے لیے تاریخیں بہت پہلے سے طے کی جاتی ہیں اور مدارس میں چھوٹی بڑی متعدد تعطیلات ہوتی رہتی ہیں۔ انہیں بآسانی تعطیلات پر ٹالا جا سکتا ہے۔ غیر حاضری کے لیے بہر حال یہ معقول عذر نہیں ہے۔

رہے آخری دونوں اسباب تو یہ دراصل بہت ہی بنیادی خرابیوں کا پتہ دیتے ہیں۔ اس طرح کی کوتاہیوں کو تو ہرگز برداشت نہ کرنا چاہیے۔ جن اساتذہ میں یہ خرابیاں پائی جاتی ہوں وہ بہت زیادہ اصلاح وتربیت کے محتاج ہیں۔ اگر توجہ دلانے کے باوجود نہ سدھرتے تو ادارے کے مفاد میں ان کا اخراج ہونا چاہیے۔

طلبہ کی غیر حاضری کے متعدد اسباب ہوتے ہیں۔

☆ **علالت:** عموماً چھوٹے بچے بار بار بیمار پڑتے اور غیر حاضریاں کرتے ہیں جس سے تعلیم بہت متاثر ہوتی ہے۔

☆ **گھر کی مصروفیات:** خصوصاً گھر کے لوگوں کی علالت، مہمانوں کی آمد دوکان وغیرہ کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کی ضرورت، لڑکیوں کو گھریلو کام کاج میں عموماً ہاتھ بٹانا پڑتا ہے۔

☆ والدین کی عدم توجہی اور اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف سے لا پروائی۔

☆ گھر سے مدرسے کی دوری اور راستے میں دلچسپ مصروفیات کے مواقع ملنا۔

☆ موسم کی خرابی، بارش یا شدید سردی وغیرہ۔

☆ گھر پر دیا ہوا کام (ہوم ورک) پورا نہ کر سکنا۔

☆ گھر، رشتے، ناطے یا محلہ پڑوس میں تقریبات۔

☆ طلبہ یا اساتذہ کا ناروا سلوک وغیرہ۔

حاضری کا پابند بنانے کی تدابیر:

☆ طلبہ، اساتذہ اور سرپرستوں کو حاضری اور وقت کی پابندی کی اہمیت پورے طور پر ذہن نشین کرادی جائے اور خلاف ورزی پر بروقت گرفت کی جائے۔

☆ ادارے کے ذمہ دار حاضری اور وقت کی پابندی کے ضمن میں اعلیٰ نمونہ پیش کریں۔

☆ وقت مقررہ پر پابندی سے گھنٹی بجنے کا اہتمام کیا جائے اور فضا ایسی بنائی جائے کہ ہر ایک گھنٹیوں کا پورا لحاظ کرے۔

☆ حاضری کی گھنٹی سے دس پانچ منٹ پہلے تیاری کی گھنٹی بجائی جائے یہ گھنٹی طلبہ کو چوکنا کرنے کے لیے ہو۔ اساتذہ کو اس گھنٹی سے پہلے پہنچنے کا پابند بنایا جائے۔

☆ طلبہ اور اساتذہ دونوں کی حاضری کے لیے باقاعدہ رجسٹر رکھے جائیں۔ اساتذہ اپنی

حاضری کے رجسٹر پر دستخط کے ساتھ آمد کا وقت بھی نوٹ کیا کریں۔

☆ درجے وار حاضری سے پہلے اجتماعی حاضری کا اہتمام کیا جائے جس میں تمام طلبہ اور اساتذہ کی شرکت لازمی ہو۔ طلبہ کو درجے اور قد کے لحاظ سے کھڑا کیا جائے۔ یہاں رجسٹر سے حاضری لینے کی ضرورت نہیں کلاس ٹیچر حضرات کا ایک سرسری جائزہ لے لینا کافی ہے۔ سستی یا لاپروائی برتنے اور حاضری میں تاخیر سے آنے والوں کی اصلاح کے لیے یہ بہت موثر طریقہ ہے۔ ہر ایک اجتماعی دباؤ کو محسوس کرتا اور کوتاہی پر بغیر ٹوکے شرمندہ ہوتا ہے اور آئندہ احتیاط برتتا ہے۔

☆ درخواست یا اجازت نامے کے ذریعے رخصت لینے کا پابند بنایا جائے اور بغیر درخواست یا اجازت کے غیر حاضر ہونے یا تاخیر سے آنے پر شدت سے نوٹس لیا جائے۔

☆ حاضری کا ریکارڈ قائم کرنے والے طلبہ یا درجات کی ہمت افزائی کی جائے اس کے لیے نمبر سند شیلڈ یا انعامات بھی رکھے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح بغیر معقول عذر کے غیر حاضری پر سرزنش، جرمانہ اور امتحانات میں بیٹھنے یا ترقی پانے سے محروم بھی کیا جاسکتا ہے۔

☆ وقتاً فوقتاً طلبہ کا طبی معائنہ کرایا جائے تاکہ ان کی صحت کی طرف والدین کو بروقت توجہ دلائی جاسکے۔

بھگوڑے بچے:

بعض بچے سرے سے تعلیم ہی سے بھاگنے لگتے ہیں۔ یہ بہت بڑی محرومی اور بدنصیبی ہے۔ تعلیم سے بھاگنے کے عموماً مندرجہ ذیل اسباب ہوتے ہیں۔

☆ اساتذہ کی سختی، بے رخی یا بدسلوکی۔ اگر معلم شفیق ہو اور بچوں کی شخصیت کا احترام کرے تو بچے تعلیم کے راستے کی متعدد دشواریاں بخوبی جھیل لیتے ہیں لیکن اساتذہ کا برتاؤ اچھا نہ ہو تو وہ بمشکل ٹکیں گے۔

☆ بچے کے سامنے اساتذہ یا ادارے کی تنقیص۔

☆ مدرسے کا غیر دلچسپ ماحول جس میں بچوں کو کھیل کود، تعمیری مشاغل اور تعلیمی سیر و سیاحت کے مواقع نہ ملتے ہوں۔

☆ ہم جماعت طلبہ کا نامناسب برتاؤ، مارنا، پیٹنا، چڑانا، طعن وطنز، تذلیل وتحقیر وغیرہ، خواہ یہ برتاؤ جسمانی واخلاقی عیب کی وجہ سے ہو یا والدین کے افلاس اور وسائل کی کمی سے۔

☆ گھر یا محلہ پڑوس میں ایسے ساتھیوں کی موجودگی جو کھیل کود، خوش گپیوں اور سیر وتفریح میں لگے رہتے ہوں۔

☆ علالت یا طویل غیر حاضری کی وجہ سے درجے میں اپنے مقام سے گر جانا۔

☆ ذہنی یا جسمانی کمزوری کے باعث درجے میں نہ چل سکنا۔

☆ بچے کی تعلیم وتربیت کی طرف سے والدین کی لاپروائی۔

☆ ذہین بچوں کو ان کی رفتار کے مطابق درجے میں کام نہ ملنا۔

☆ عدم توجہی یا گھر کی مصروفیات وغیرہ کے باعث، ہوم ورک پورا کرنے یا آموختہ دیکھنے میں کوتاہی۔

صحیح اسباب کی کھوج لگا کر اصلاح حال کی پوری کوشش کرنی چاہیے خدانخواستہ کوئی بچہ اساتذہ یا ادارے کی کوتاہیوں کے باعث دینی تعلیم وتربیت سے بھاگنے لگا تو کتنا بڑا وبال ہوگا۔

۲۔ پھسڈی پن

ہر درجے میں کچھ بچے ایسے ہوتے ہیں جو درجے کے ساتھ نہیں چل سکتے، یہ پھسڈی کہلاتے ہیں۔ یوں تو تقریباً ہر بچہ وقتی طور پر کسی نہ کسی مضمون میں سست روی کا ثبوت دیتا ہے۔ یہ فطری ہے اس پر کسی خاص تشویش کی ضرورت نہیں۔ یہ چیز معمولی توجہ سے جلد یا بدیر اپنے آپ دور ہو جاتی ہے۔ الا یہ کہ بچہ اپنے اساتذہ، ہم جولیوں یا گھر کے افراد کے طنز وتعریض اور ناروا سلوک یا

کسی اور وجہ سے احساس کمتری اور مایوسی کا شکار ہو جائے جس سے بہر حال بچوں کو محفوظ رکھنے کی پوری کوشش ہونی چاہیے۔ البتہ کچھ بچے واقعی کند ذہن اور غبی ہوتے ہیں اور علمی مضامین میں ان کا ذہن عام بچوں کی طرح تیز رفتاری سے کام ہی نہیں کر سکتا اور بعض ذہنی اعتبار سے اچھے خاصے ہونے کے باوجود کسی کسی مضمون میں پچھڑ جاتے ہیں۔ یہ بچے ہماری غیر معمولی توجہ کے مستحق ہیں۔

غبی اور کند ذہن بچوں کا پھسڈی پن تو خیر ان کی ذہنی کمزوری اور فہم کی کمی کے باعث ہوتا ہے۔ انہیں تو ان کی اپنی رفتار ہی سے چلانا مناسب ہوگا جس کے لیے نصاب، طریق تعلیم اور نظام الاوقات سب میں رعایت رکھنی ہوگی۔ رہے وہ پھسڈی بچے جو ذہنی طور پر تو نارمل ہیں لیکن بعض وجوہ سے وہ پھسڈی ہو گئے ہیں تو پہلے ان اسباب کا پتہ لگانا ہوگا جو ان کے پھسڈی پن کے موجب ہوئے ہیں اور اسی کے لحاظ سے ازالہ کی تدبیر کرنی ہوں گی۔

اسباب:

پھسڈی پن کے عموماً مندرجہ ذیل اسباب ہوتے ہیں:

☆ بچوں کا پابندی سے اسکول نہ جانا۔ غیر حاضری، دیر حاضری یا گھنٹوں سے کھسک جانے کی عادت خواہ ان کے اسباب کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔

☆ معلم کے ناروا سلوک، ناقص طریقہ تعلیم اور تعلیمی سامان کی کمی کے باعث کسی مضمون سے بچے کا متنفر یا مایوس ہو جانا۔

☆ بچوں کی عمر اور ذہنی صلاحیت کا لحاظ کیے بغیر ان سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لینا اور ان کی بساط سے زیادہ ان پر بار لاد دینا یا کسی مضمون کی باقاعدہ تدریس شروع کرنے میں جلد بازی کرنا یا وقت بچانے کے لیے استعداد سے اونچی جماعت میں داخل کرانا۔

☆ ترقی دینے میں بہت جلدی یا بہت تاخیر کرنا۔

☆ تبادلہ، تلون یا کسی اور وجہ سے ایک مدرسے میں جم کر تعلیم دلانے کے بجائے جلد جلد

مدرسے سے تبدیل کرنا۔

☆ مدرسے اور گھر کے مابین ہم آہنگی اور تعاون کی کمی۔

☆ درجے یا مدرسے کا غیر دلچسپ ماحول جس سے مدرسے میں جی ہی نہ لگتا ہو۔

☆ گھر کے ناسازگار حالات مثلاً والدین کے باہمی تعلقات کی کشیدگی، علالت، جہالت، پریشانی، مفلسی، بے کاری عدم موجودگی یا وسائل کی کمی کے باعث ان کا بچوں کی تعلیم وتربیت پر توجہ صرف نہ کرسکنا یا ان کے ساتھ مناسب رویہ نہ رکھنا۔

☆ بری صحبت کے باعث بچے کا تعلیم کے بجائے دوسری سرگرمیوں میں اپنی ذہانت وقوت صرف کرنا۔

☆ بچے کی سماعت یا بصارت کا ناقص ہونا۔

علاج:

پھسڈی پن ایک ایسی خطرناک بیماری ہے جس کا اگر بروقت علاج نہ کیا جائے تو بچے علم سے کورے رہ جاتے ہیں اور ان کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ والدین اور اساتذہ کی کوتاہیوں کے باعث بسا اوقات اچھے بھلے لڑکے بھی اس مہلک مرض کا شکار ہو کر رفتہ رفتہ اپنے کو تباہ کر لیتے ہیں۔ بچوں کا نہایت دقت نظری سے جائزہ لیتے رہنا چاہیے اور پھسڈی پن کے آثار نمودار ہوتے ہی صحیح اسباب کا پتہ لگا کر ازالہ کی بروقت فکر کرنی چاہیے۔ اگر والدین یا اساتذہ کا ناروا سلوک اس کا ذمہ دار ہے تو اپنے رویئے کی اصلاح کرنی چاہیے۔ اگر گھر یا مدرسے کا ماحول ناسازگار ہے تو اسے سازگار بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بصارت یا سماعت میں نقص ہے تو اس کا علاج کرانا چاہیے۔ بہرحال جو سبب بھی ہو اسے دور کرنے میں جلدی ہونی چاہیے تو امید ہے کہ بروقت کام بن جائے گا لیکن اگر یہ مرض کسی حد تک پرانا ہو گیا ہو تو مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کی جائیں۔

☆ پھسڈی بچوں کا ایک علیحدہ گروپ بنا کر انہیں ان کی رفتار سے چلانے کے لیے علیحدہ سے

انتظام کیا جائے۔ اگر ان کا درجہ ہی الگ ہو سکے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ورنہ دوسرے بچوں کے مقابلے میں ان پر زیادہ توجہ صرف کی جائے اور حتی الامکان انفرادی توجہ اور امداد دے کر انہیں ساتھ لے چلنے کی فکر کی جائے۔

☆ ان کو اعادہ اور مشق کا زیادہ موقع دیا جائے اور مدرسے کے علاوہ اوقات میں بھی ان پر کچھ وقت صرف کیا جائے۔

☆ ان کو ایسی مشقیں دی جائیں جن کو وہ معمولی محنت سے حاصل کر سکیں۔ اس طرح ان کی حوصلہ افزائی بھی ہوگی اور وہ زیادہ دلچسپی اور توجہ سے کام کرنے لگیں گے۔

☆ اسباق کی وضاحت کے لیے زیادہ سے زیادہ تعلیمی وتوضیحی سامان نقشے، ماڈل، چارٹ وغیرہ استعمال کیے جائیں اور کر کے سیکھنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں۔

☆ غیر نصابی مصروفیات ومشاغل، آرٹ کرافٹ اور دوسرے کاموں میں ایسے بچے نسبتاً زیادہ دلچسپی اور مہارت کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان میں انہیں بڑھا کر ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کرائی جائے تا کہ احساس کمتری اور مایوسی دور ہو اس طرح رفتہ رفتہ ان کا تنفر دور ہو جائے گا۔ بہتر ہو اگر ایسے مضامین کسی دوسرے معلم کے حوالے کر دیے جائیں جو زیادہ محبت وشفقت سے پڑھا سکے۔

☆ ایسے بچوں کو جو کچھ پڑھایا سکھایا جائے اس کی ضرورت وافادیت ان پر بخوبی واضح کر دی جائے۔

پھسڈی بچے بہر حال ہماری توجہ کے زیادہ مستحق ہیں۔ انہیں مایوسی وناکامی سے بچانے کی ہر ممکن تدبیر کی جائے اور اپنی طرف سے پوری کوشش کی جائے کہ پھسڈی پن کا موجب ہماری ذات نہ ہونے پائے۔

۳۔ تکان

دیر تک لکھنے پڑھنے یا کوئی ذہنی وجسمانی کام کرنے سے جسم میں پستی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں اور بالآخر نہ دماغ ٹھیک کام کرتا ہے اور نہ جسم میں کام کی مزید سکت رہتی ہے۔ یہی تکان دراصل ایک طرح کی تنبیہہ ہے کہ تازہ دم ہوئے بغیر مزید کام نہ کیا جائے، ورنہ جسم کو نقصان پہنچے گا۔

اسباب:

کام کرنے میں قوت صرف ہوتی ہے۔ یہ قوت جسم ہی کے بعض اجزاء کے جلنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ان اجزاء کو جلا کر انہیں قوت میں تبدیل کرنے کا کام خون میں ملی ہوئی آکسیجن[1] انجام دیتی ہے۔

چنانچہ جب ہم دیر تک کام کرتے ہیں تو!

☆ قوت میں تبدیل ہونے والے اجزاء جل جاتے ہیں۔

☆ خون میں ملی ہوئی آکسیجن کی مقدار گھٹ جاتی ہے اور مزید قوت پیدا کرنے کے لیے ضرورت کے مطابق نہیں ملتی۔

☆ جلا ہوا مسموم فضلہ خون میں شامل ہو کر پورے جسم میں پھیل جاتا ہے۔ چنانچہ جسم کے ساتھ دماغ بھی متاثر ہوتا ہے اور جوڑ جوڑ میں جہاں فضلہ رکتا ہے درد ہونے لگتا ہے۔

ظاہر ہے جب تک ان کا ازالہ نہ ہو جائے مزید کام کرنا انتہائی مضر ہو سکتا ہے لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ تکان کے ڈر سے زیادہ محنت نہ لی جائے۔ تکان کی بڑی اہمیت وافادیت ہے۔ بچے جب خوب محنت کرتے ہیں تو بھوک بھی خوب لگتی ہے، کھانا اچھی طرح ہضم ہوتا ہے، گہری نیند آتی ہے اور جسم کے جو اجزاء جل کر قوت بہم پہنچاتے ہیں ان کی جگہ نئے اجزاء بنتے ہیں جو زیادہ

[1] آکسیجن صاف ہوا کا وہ پانچواں حصہ ہے جس کی خاصیت چیزوں کے جلنے میں مدد دینا ہے۔ سانس کے ساتھ یہی آکسیجن اندر جاتی اور خون میں مل کر پورے جسم کو گرم رکھتی ہے۔

قوی ہوتے اور نشو ونما میں مدد دیتے ہیں۔

تکان کی قسمیں:

تکان دو طرح کی ہوتی ہے۔

۱۔ ذہنی ۲۔ جسمانی

ذہنی کام کرنے سے دماغ تھکتا اور ذہنی تکان ہو جاتی ہے اور جسمانی کام کرنے یا کھیلنے کودنے سے جسم تھکتا اور جسمانی تکان واقع ہو جاتی ہے۔ جسمانی یا ذہنی کسی ایک طرح کی تکان کے بھی بہت بڑھ جانے سے دوسری طرح کی تکان خود بخود ہو جاتی ہے۔ جسم تھک کر چور ہو جائے تو دماغ بھی کام ٹھیک نہیں کرتا۔

ذہنی تکان کی بھی دو قسمیں ہیں:

۱۔ حقیقی تکان۔

۲۔ مصنوعی تکان یا بیزاری و اکتاہٹ۔

مصنوعی تکان دراصل تکان نہیں ہوتی بلکہ کام کے غیر دلچسپ ہونے کی وجہ سے جی نہیں لگتا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تکان ہو گئی ہے اگر کسی طرح دلچسپی پیدا کر دی جائے تو مزید کام ہو سکتا ہے۔

تکان کی علامتیں:

جب مندرجہ ذیل علامتیں ظاہر ہونے لگیں تو سمجھنا چاہیے کہ بچے تھک گئے ہیں اور اب تکان کے ازالے کی مناسب تدبیر ہونی چاہیے۔

جسمانی علامتیں:

☆ جسم میں ڈھیلا پن اور چستی و حرکت میں کمی۔

☆ چہروں پر پھیکا پن، کملاہٹ۔

☆ جوڑوں میں درد ہونا، بار بار انگڑائی لینا یا جمائی آنا یا اونگھنا۔

☆ خلاف توقع حرکات کا سرزد ہونا۔

☆ سر لٹک جانا، ریڑھ کی ہڈی کا جھک جانا، نگاہوں کا نہ جمنا یا کھڑے ہونے میں سہارا لینے کی کوشش کرنا۔

ذہنی علامتیں:

☆ یادداشت میں کمی آجانا۔

☆ سوال حل کرنے یا جواب دینے میں بار بار غلطیاں کرنا۔

☆ سمجھانے پر بات سمجھ میں نہ آنا۔ غور وفکر اور یادداشت میں کمی۔

☆ بار بار جھنجھلانا یا آواز پر چونک پڑنا وغیرہ۔

جلد تھکا دینے والے حالات:

کارکردگی پر ان حالات کا غیر معمولی اثر پڑتا ہے جن میں کوئی کام انجام دیا جارہا ہو۔ موسم خوشگوار اور فضا پُرسکون ہو، کام دلچسپ اور طبیعت کام پر آمادہ ہو تو کام بھی نہایت انہماک اور توجہ سے ہوتا ہے اور دیر تک تکان بھی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس مندرجہ ذیل صورتوں میں بچے جلد تھک جاتے اور توجہ، انہماک ودلچسپی سے کام کرنے کے بجائے اکتاہٹ اور بیزاری کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔

☆ موسم کی شدت، شدید سردی، شدید گرمی، تیز دھوپ، امس، کہر ودھند وغیرہ۔

☆ مدھم روشنی یا صاف اور کھلی ہوا کی کمی۔

☆ بہت زیادہ یا مسلسل شوروغل اور ڈانٹ پھٹکار یا سزا۔

☆ خراب صحت، ناقص غذا، ناموزوں لباس، تکلیف دہ نشست گاہ اور کمرے کی ناموزونیت۔

☆ فطری خواہشات یا جبلی تقاضوں کا پورا نہ ہونا۔

☆ آمادہ کیے بغیر سبق شروع کرادینا یا سبق کا مشکل، غیر دلچسپ اور ناقابل فہم ہونا۔

☆ ایک ہی طرح کا کام ایک ہی انداز یا پوسچر میں کرتے رہنا کیونکہ اس طرح جسم کے ایک ہی حصے کے اجزاء قوت خارج کرتے کرتے جلد تھک جاتے ہیں۔

ان اسباب کے ازالے کی جس حد تک فکر کی جائے گی کارکردگی میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔

تکان کا علاج:

بچے اگر واقعی تھک جائیں تو انہیں ستانے کے لیے کچھ وقفہ ملنا چاہیے اور کھانے کے لیے ایسی غذا جس میں مٹھاس شامل ہو۔ اس سے بچے تازہ دم ہو کر کام کے لائق ہو جائیں گے۔ لیکن تکان غیر معمولی ہو تو معمولی آرام سے کام نہیں چلتا بلکہ مکمل آرام اور گہری نیند بھی ضروری ہے کیونکہ اسی طرح قوت پیدا کرنے والے جلے ہوئے اجزاء کی جگہ نئے اجزاء تیار ہو سکیں گے۔ چائے اور قہوہ وغیرہ سے وقتی طور پر توانائی تو محسوس ہونے لگتی ہے مگر تکان کا یہ حقیقی علاج نہیں ہے بلکہ ان کا پینا اور ان کے سہارے دیر تک کام کرنا، بچے کیا، بڑوں کے لیے بھی نہایت مضر ہے۔ ان کے بجائے بچوں کے لیے بھیگا ہوا چنا یا گڑ اور اگر استطاعت ہو تو دودھ دہی پھل وغیرہ کا استعمال تکان کو دور کرنے میں بہت معاون ہوتا ہے۔

البتہ اگر تکان معمولی ہو یا محض بیزاری یا اکتاہٹ کی وجہ سے بچے تکان کا مظاہرہ کرتے ہوں تو مندرجہ ذیل صورتیں اختیار کی جائیں۔

☆ مختلف تدابیر سے سبق کو دلچسپ اور قابل فہم بنانے کی کوشش کی جائے۔

☆ آمادگی، خوش دلی اور ہمت و حوصلے کی فضا میں بچوں سے کام لیا جائے۔

☆ کام کی نوعیت میں تبدیلی کر دی جائے یعنی ذہنی کے بعد جسمانی، زبانی کے بعد عملی پڑھائی کی جگہ لکھائی وغیرہ۔

☆ مختلف تدبیروں سے رفتہ رفتہ بچوں کو دیر تک جم کر کام کرنے کا عادی بنایا جائے۔ بچوں کی توجہ جلد جلد بھٹکتی رہتی ہے اور شروع میں ایک چیز پر زیادہ دیر تک جم نہیں پاتے لیکن جب

محنت کے عادی ہو جاتے ہیں تو پھر دیر تک تکان محسوس نہیں کرتے۔

نظام الاوقات میں تکان کا لحاظ:

نظام الاوقات بناتے وقت تکان کے متعلق مندرجہ ذیل امور پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

☆ چھوٹے بچے بڑوں کے مقابلے میں جلد تھک جاتے ہیں اور تھوڑی دیر میں اکتاہٹ اور بیزاری محسوس کرنے لگتے ہیں اس لیے ابتدائی درجات میں گھنٹے گرمیوں میں تیس ۳۰ اور جاڑوں میں پینتیس ۳۵ منٹ سے زیادہ لمبے نہ رکھے جائیں۔

☆ گرمیوں میں صبح کا اسکول رکھا جائے اور دوپہر تک تدریس کا کام ختم کر دیا جائے البتہ سردیوں میں حسب معمول دس بجے سے چار بجے کے مابین ہی تدریس مناسب رہے گی۔

☆ اول وقت میں بچے تازہ دم ہوتے ہیں اس لیے مشکل مضامین مثلاً ریاضی زبان وغیرہ پہلی میٹنگ ہی میں رکھے جائیں۔ پہلے گھنٹے میں تکان تو نہیں ہوتی لیکن بچوں کی توجہ بھٹکتی رہتی ہے اور آخری گھنٹے میں تکان کا غلبہ ہونے لگتا ہے۔ اس لیے بیچ کے گھنٹے ہی مشکل مضامین کے لیے مخصوص ہونے چاہئیں۔ وقفے کے بعد بچے کسی حد تک پھر تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ اس لیے دوسری میٹنگ کے بیچ کے گھنٹوں میں نسبتاً کم مشکل مضامین رکھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً سماجی علوم، عام سائنس وغیرہ باقی گھنٹوں میں آسان اور دلچسپ مضامین یا عملی اور تحریری کام رکھے جائیں مثلاً اسلامیات، آرٹ کرافٹ، املا، نقل انشاء وغیرہ۔

☆ مختلف گھنٹوں میں مضامین کی ترتیب ایسی رکھی جائے کہ کام کی نوعیت بدل جائے اور ایک ہی طرح کے مضامین مسلسل نہ پڑنے پائیں۔ مثلاً زبانی کے بعد تحریری، ذہنی کے بعد جسمانی اور نظری کے بعد عملی نوعیت کے کام ہوں اس طرح تکان کم ہوگی۔

☆ وقفے تکان کو کم کرتے ہیں۔ اس لیے ایک تہائی تدریسی کام کے بعد دس منٹ کا ایک مختصر وقفہ اور دو تہائی کام ہو چکنے پر ایک طویل وقفہ دیا جائے چھوٹے بچوں کو اگر ہر گھنٹے کے بعد دو چار منٹ مل جائیں تو مناسب ہوگا۔ پہلو بدل لینے اور تھوڑی دیر اچھل کود، بھاگ دوڑ کر

لینے سے خون میں ملا ہوا مسموم فضلہ دوران خون کی تیزی کے باعث خارج ہو جاتا ہے اور لمبے سانس لینے سے آکسیجن کی کمی بھی پوری ہو جاتی ہے۔

☆ تکان اور توجہ میں اتار چڑھاؤ جس طرح روزانہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ہفتہ وار اور سالانہ بھی ہوتا ہے۔ ہفتہ وار چھٹی کے بعد جب بچے پہلے دن آتے ہیں تو چھٹی کی وجہ سے تازہ دم تو ضرور ہوتے ہیں مگر چھٹی کی دلچسپیوں کے باعث تعلیم کی طرف توجہ نہیں ہوتی اور اکثر بچوں کو تو مدرسہ آنے ہی میں طبیعت پر جبر کرنا پڑتا ہے اس لیے پہلے دن تدریسی کام ہلکا پھلکا اور دلچسپ ہونا چاہیے۔ ہفتے کے بیچ کے دنوں میں توجہ اور انہماک میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور تکان بھی زیادہ نہیں ہوتی البتہ آخری دن تکان کے بڑھ جانے کی وجہ سے توجہ بھی بھٹکنے لگتی ہے اور محنت طلب کاموں میں دل نہیں لگتا۔ اس لیے آخری دن بھی ہلکے پھلکے اور دلچسپ کام ہونے چاہئیں مثلاً اعادہ اور طلبہ کا اجتماع۔ مدرسے کی کوئی ترقی، پکنک، تعلیمی سیر و سیاحت، خدمت خلق یا صفائی وغیرہ سے متعلق کام۔ یہی حال تعلیمی سال شروع ہونے پر ہوتا ہے۔ تعطیلات میں بچوں پر تعلیم کا بار نہیں رہتا اس لیے شروع میں جب آتے ہیں تو جسم میں توانائی تو خوب ہوتی ہے مگر تعلیم کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ اس لیے ابتداء میں کچھ دنوں ہلکے پھلکے کام دینے چاہئیں اور پچھلے کام کا ضروری اعادہ کرانے کے بعد نیا کام شروع کرنا چاہیے۔ پھر چند ماہ خوب محنت لے کر اعادہ اور ششماہی جانچ ہونی چاہیے۔ اس دوران بھی مختصر وقفوں کی طرح کبھی کبھی چھٹیاں ملنی چاہئیں، پکنک اور سیر و سیاحت کے لیے لے جانا چاہیے اور ششماہی امتحان کے بعد بھی بڑے وقفے کی طرح ایک دو ہفتے کی چھٹی ملنی چاہیے۔ اسی طرح دوسری میقات میں کام کر کے تعطیلات کلاں دینی چاہئیں۔ تعطیلات کے معاملے میں بعض ادارے بخیل اور بیشتر ادارے بہت زیادہ فیاض ہوتے ہیں۔ دونوں باتیں غلط ہیں۔ تعطیلات میں بخل بھی صحیح نہیں ہے۔ نہ بہت زیادہ تعطیلات مناسب ہیں۔ تعطیلات کی مختلف وجوہ سے بہت زیادہ اہمیت ہے مگر اعتدال ملحوظ رکھنا چاہیے۔

۴۔ نظام الاوقات

ضرورت وافادیت:

بچوں کی تعلیم وتربیت کا بہت کچھ انحصار موزوں نظام الاوقات پر ہے کیونکہ اس کی وجہ سے۔

☆ تعلیم وتربیت کا کام نظم وترتیب سے ہوتا ہے۔

☆ وقت ضائع نہیں ہوتا، محدود وقت میں کافی کام ہو جاتا ہے۔

☆ ہر ضروری مضمون اور مشغلہ کو مناسب وقت مل جاتا ہے اور کوئی بھی نظر انداز نہیں ہوتا۔

☆ اساتذہ کی صلاحیتوں کے لحاظ سے کام کی تقسیم ہوتی ہے چنانچہ ان کی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

☆ کام متوازن ہوتا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے اساتذہ کے ذوق اور رجحان پر ضروری روک لگ جاتی ہے ورنہ اگر پورا وقت ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے تو اکثر اساتذہ اپنے ذوق اور دلچسپی ہی کے مضامین پر زیادہ وقت صرف کریں گے اور متعدد پہلو نظر انداز ہو جائیں گے۔

☆ وقت کی پابندی، اس کی قدر و قیمت کا احساس، محنت وانہماک اور ترتیب سے کام کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔

☆ طلبہ ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔ چنانچہ نظم وضبط برقرار رہتا ہے۔ مصروفیت کے باعث شرارتوں کا موقع نہیں ملتا۔ اس لیے سزا کی بھی کم ہی نوبت آتی ہے۔

☆ طلبہ اور اساتذہ سب کو علم رہتا ہے کہ فلاں گھنٹے میں کیا کرنا ہے۔ چنانچہ ضروری تیاری پہلے ہی سے کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

☆ صدر مدرس اور دوسرے ذمہ داران ادارہ کو ہر وقت اس بات کا علم ہو سکتا ہے کہ کوئی مدرس یا کسی درجے کے طلبہ کہاں اور کس کام میں منہمک ہوں گے۔

قابل لحاظ امور:

ہر ادارے میں بہر حال کوئی نہ کوئی نظام الاوقات ہوتا ہی ہے جس کے مطابق اس ادارے میں تعلیم وتربیت کا کام انجام دیا جاتا ہے۔ لیکن ان میں معیاری شاذ ونادر ہی ہوتے ہیں، اور ہوتے بھی ہیں تو ان پر کما حقہٗ عمل بہ مشکل ہوتا ہے کیونکہ:

☆ بہت کم مدارس میں ضرورت اور صلاحیت کے اعتبار سے اسٹاف پورا ہوتا ہے۔

☆ اکثر مدارس میں اساتذہ کے تبادلے، استعفے، اخراج، طویل رخصتیں، تقرریاں وغیرہ تعلیمی سال کے دوران بھی چلتی رہتی ہیں۔

☆ نظام الاوقات بناتے وقت لاعلمی یا عدم توجہی کے باعث وہ تمام امور پیش نظر نہیں رہتے جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

ان موانع کو حتی الامکان کم کرنا چاہیے اور مندرجہ ذیل قابل لحاظ امور کو سامنے رکھ کر جس حد تک ممکن ہو معیاری نظام الاوقات بنانا اور اس کے مطابق عمل ہونا چاہیے تاکہ تعلیم وتربیت زیادہ سے زیادہ موثر ہو سکے۔

☆ سب سے پہلے مضامین ومشاغل کی فہرست تیار کی جائے پھر ان کی قدر وقیمت، اہمیت وافادیت اور ان کے مشکل آسان، دلچسپ یا خشک ہونے کے لحاظ سے ان کی گروہ بندی کر لی جائے۔ مثلاً اسلامیات سب سے اہم اور بنیادی مضمون ہے۔ تمام مضامین ومشاغل میں اسی کی روح کارفرما ہوگی۔ خود یہ مضمون بھی بہت وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ کیونکہ اس میں قرآن حکیم ناظرہ صحت کے ساتھ پڑھنا اور کچھ حصے حفظ کرنا فقہ وعقائد، سیرت النبی ﷺ اور سیرت انبیاءؑ وصلحائے امت، اخلاق ومعاشرت وغیرہ سے متعلق ضروری معلومات اور مناسب تربیت شامل ہے، اس لیے اس پر سب سے زیادہ وقت اور توجہ صرف کرنی ہوگی۔ اس کے بعد مادری زبان اور ریاضی کا نمبر ہے۔ پرائمری درجات میں اگر ان دونوں

مضامین میں اچھی صلاحیت بہم پہنچ جائے تو باقی مضامین بہت آسان ہو جاتے ہیں اس لیے ان دونوں کو نسبتاً زیادہ وقت ملنا چاہیے۔

☆ اساتذہ کی تعداد، ان کی لیاقت وصلاحیت اور تجربہ اور ان کے پسندیدہ مضامین ومشاغل کا لحاظ کیا جائے۔ اساتذہ میں کام کی تقسیم کرتے وقت اس کی فکر ہونی چاہیے کہ ان کی صلاحیتوں سے طلبہ کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچ سکے۔ حتی الامکان ان کے مشورے سے کام تقسیم کیا جائے تا کہ وہ پوری آمادگی وخوش دلی سے مفوضہ فرائض انجام دیں۔ پرائمری درجات میں درجہ وار اور بعد کے درجات میں مضمون وار کام کی تقسیم مناسب ہوتی ہے۔ ابتدائی دو تین درجات بچوں سے فطری لگاؤ رکھنے والے اچھے تجربہ کار اور مستقل مزاج اساتذہ کے سپرد ہونے چاہئیں۔ پرائمری درجات کے اساتذہ میں اتنی صلاحیت ہونی ہی چاہیے کہ وہ ایک ہی درجے کے بیشتر مضامین پڑھا سکیں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ہر معلم اتنی صلاحیت بہم پہنچا سکتا ہے۔ درجہ بہت بڑا نہ ہونا چاہیے ورنہ طلبہ پر انفرادی توجہ نہیں دی جا سکے گی اور نہ مناسب تربیت ہو سکے گی۔ ابتدائی درجات میں پچیس تیس طلبہ سے زیادہ نہ ہونے چاہئیں۔ اساتذہ تعداد میں کم از کم اتنے ہوں جتنے درجات ہیں تا کہ ایک استاد کو ایک وقت میں ایک ہی درجہ لینا پڑے۔ بحالت مجبوری اگر دو درجات ایک ہی استاد کے سپرد کرنے پڑیں تو وہی درجات ملائے جائیں جن کی عمروں اور استعداد میں کم سے کم تفاوت ہو تا کہ ساتھ لے چلنے میں دشواری نہ ہو، لیکن ابتدائی دو درجات کے ساتھ تدریسی کام میں دوسرے درجات کو ملانا کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ وہ ہمہ وقت توجہ اور مصروفیت چاہتے ہیں۔

☆ **تکان[1] اور توجہ کا لحاظ:** مدرسہ شروع ہوتے وقت بچوں میں تکان تو نہیں ہوتی لیکن توجہ ادھر ادھر بھٹکتی رہتی ہے۔ اس لیے فوراً باقاعدہ تدریس نتیجہ خیز نہیں ہوگی۔ مناسب یہ ہے کہ

1 تکان اور توجہ پر علیحدہ بحث کی گئی ہے ایک نظر دیکھ لیں۔

ابتداء میں کم و بیش ۳۰ منٹ مندرجہ ذیل ضروری کاموں پر صرف کیے جائیں۔

سب سے پہلے تیاری کی گھنٹی بجائی جائے تاکہ سب بچے چوکنے ہو جائیں اور اپنی مصروفیات کو مختصر کر دیں۔ پانچ منٹ بعد دوسری گھنٹی پر قد کے لحاظ سے درجہ وار تمام طلبہ مدرسہ کے صحن میں کھڑے ہو جائیں تمام اساتذہ بھی موجود ہوں ایک استاد دس منٹ ہلکی پی ٹی یا ڈرل کرائیں۔ پھر کلاس ٹیچر حضرات اپنے اپنے درجے کے بچوں کے جسم و لباس کی صفائی وغیرہ کا معائنہ کریں۔ اس کے بعد حمد یا ترانہ اجتماعی طور پر بلند آواز سے پڑھائیں۔ آخر میں ضروری ہدایات یا اعلانات وغیرہ کے بعد درجہ وار قطار میں سکون کے ساتھ درجوں میں طلبہ کو بھیج دیا جائے جہاں کلاس ٹیچر ان کی حاضری لے کر باقاعدہ تدریس شروع کریں۔ اس طرح یہ ضروری کام بھی انجام پا جائیں گے اور توجہ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

پرائمری درجات کے بچوں کی توجہ جلد جلد بھٹکتی ہے اور وہ جلد تھک بھی جاتے ہیں اس لیے پیریڈ (گھنٹے) گرمیوں میں تیس اور سردیوں میں پینتیس منٹ سے زیادہ نہ لمبے ہونے چاہئیں۔ پہلے تین پیریڈ میں بچے تازہ دم ہوتے ہیں ان میں اہم مضامین مثلاً اسلامیات اردو پڑھنا اور حساب رکھنا چاہیے۔ پھر مختصر وقفہ کر کے بچوں کو تازہ دم ہونے کا موقع دینا چاہیے۔ اس کے بعد دو پیریڈ پڑھا کر طویل وقفہ دینا چاہیے تاکہ بچے کھا پی سکیں اور ظہر کی نماز سے فارغ ہو جائیں اس کے بعد تازہ دم ہو کر کچھ مزید کام کر لیں۔

☆ **تبدیلی[1] کا لحاظ:** کام میں یکسانیت سے اکتاہٹ بھی پیدا ہوتی ہے اور جلد تکان محسوس ہونے لگتی ہے اس لیے طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لحاظ سے کام کی نوعیت میں تبدیلی کا انتظام ہونا چاہیے۔ ایک استاد کے ایک ہی درجے میں مسلسل دو تین پیریڈ سے زیادہ نہ رکھے جائیں اور نہ ایک ہی مضمون یا ایک ہی نوعیت کے مضامین و مشاغل رکھے جائیں۔

---

[1] مشکل اور آسان کے لحاظ سے مضامین کی ترتیب یہ ہے۔ ریاضی، غیر زبان، اسلامیات، مادری زبان، سائنس، تاریخ، جغرافیہ، تحریری کام، آرٹ

بلکہ پڑھنے کے ساتھ لکھنا اور زبانی کے ساتھ عملی کام اور مشکل کے بعد آسان مضمون رکھا جائے۔ بچوں کو جگہ اور پہلو بدلنے کا موقع بھی ملنا چاہیے۔ایک ہی انداز سے دیر تک بیٹھنے سے جوڑوں میں درد ہوتا اور تکان محسوس ہونے لگتی ہے۔آرٹ کرافٹ، ناظرہ وقرأت وغیرہ کے لیے اگر کمرے مخصوص ہوں تو مختلف درجات کے بچوں کو اپنا درجہ چھوڑ کر وہاں جانا ہوگا اور ان میں چستی اور شگفتگی پیدا ہوگی۔اس طرح مطالعہ قدرت، ڈرل اور عملی کام کے لیے میدان میں جانے میں بھی فرحت محسوس ہوگی۔

☆ **اساتذہ کے خالی گھنٹے:** کوشش کرنی چاہیے کہ ہر استاد کا روزانہ کم از کم ایک پیریڈ خالی ہو اس سے کئی فائدے ہوں گے۔

☆ کسی استاد کی اتفاقی رخصت کے موقع پر خالی گھنٹوں میں اساتذہ سے کام لیا جا سکے گا اس طرح طلبہ کا ہرج بھی نہیں ہوگا اور وہ بدنظمی سے بھی محفوظ رہیں گے۔

☆ بچوں کے تحریری کام کی جانچ اور ان سے متعلق مختلف قسم کے ریکارڈ تیار کرنے کا اساتذہ کو موقع ملے گا۔اگر اسٹاف کم ہو تو عملی کام، کھیل، آرٹ کرافٹ وغیرہ میں دو دو درجات کو ایک ساتھ ملا کر ایک استاد کی نگرانی میں دے دیا جائے۔اور اول دوم کو آخری گھنٹے میں چھٹی دے کر نیز صدر مدرس کو کچھ پیریڈ دے کر اساتذہ کے گھنٹے خالی کرنے کی کوشش کی جائے۔

☆ **شور وغل کا لحاظ:** بہتر تو یہی ہے کہ مختلف درجات کے لیے کمرے الگ ہوں تاکہ آوازوں کے ٹکرانے کا اندیشہ نہ رہے۔لیکن اگر مجبوری ہو تو گھنٹوں کی ترتیب اس انداز سے ہونی چاہیے کہ وہ تمام مضامین جن میں اساتذہ کو بلند آواز سے بولنا پڑتا ہے۔مختلف درجات میں ایک ہی پیریڈ میں نہ پڑنے پائیں۔مثلاً ناظرہ، قرأت، اردو پڑھنا، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ ورنہ شور بھی زیادہ ہوگا اور آواز کے ٹکرانے سے توجہ بھٹکے گی۔ ایسی صورت میں ایک درجے میں آواز سے تعلیم ہو رہی ہو تو دوسرے میں حساب ڈرائنگ یا تحریری کام ہونا چاہیے۔

☆ **اعادہ اور جانچ:** اعادہ کے لیے ہفتے کا دن ہونا چاہیے کیونکہ آخری دن تک تکان بڑھ

جاتی ہے اور نئے سبق کے لیے ذہن تیار نہیں رہتا اور جانچ ہمیشہ ہفتے کے پہلے دن رکھنا چاہیے تا کہ ہفتہ وار چھٹی میں تیاری کا بچوں کو موقع مل جائے۔

☆ نظام الاوقات ایسا ہونا چاہیے کہ اساتذہ اور طلبہ کو بآسانی یاد ہو جائے تا کہ روزانہ اور ہر گھنٹے میں اسے دیکھنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ جو مضمون جس گھنٹے میں پہلے دن رکھا جائے کوشش کی جائے کہ وہ مضمون ہفتے بھر اسی گھنٹے میں پڑے۔ اگر کسی مضمون کے روزانہ گھنٹے نہ ہوں بلکہ ہفتے میں صرف دو یا تین گھنٹے ہوں مثلاً جغرافیہ اور سائنس وغیرہ تو انہیں مسلسل دو تین دن نہیں رکھ دینا چاہیے۔ ورنہ دوبارہ ان کی باری آنے میں وقفہ طویل ہو جائے گا جس سے بھول جانے کا اندیشہ رہے گا۔ اس طرح کے مضامین ایک ایک یا دو دو دن ناغہ دے کر رکھے جائیں۔

☆ ادارے کے اپنے معمولات ہوتے ہیں اور اساتذہ نیز طلبہ کو چاہیے کہ وہ اپنے معمولات کو بہر حال اس کے تابع کر دیں۔ پھر بھی نظام الاوقات بناتے وقت کوشش ہونی چاہیے کہ بیشتر لوگوں کو اس کی پابندی میں آسانی اور سہولت ہو اور ناشتے کھانے، نماز، کھیل، غیر نصابی مصروفیات اور آرام وغیرہ کے مناسب مواقع مل سکیں۔ اسی طرح قرآن حکیم کی تعلیم حتی الامکان پہلے گھنٹے میں یا طویل وقفے کے بعد رکھی جائے تا کہ بچے قرآن باوضو پڑھنے کے عادی ہو سکیں اور انہیں وضو میں زحمت نہ ہو۔

☆ **بچوں کا اجتماع تعلیمی سیر و سیاحت اور پکنک:** ان کے لیے بھی ہفتے کا آخری دن مناسب ہو گا۔ اجتماع کے لیے گھنٹے پانچ پانچ منٹ کم کر دیے جائیں اور آخری گھنٹہ حذف کر کے کم و بیش ڈیڑھ گھنٹے کا پروگرام رکھ دیا جائے جس میں بچے تقاریر، نظمیں، کہانیاں لطیفے وغیرہ پیش کریں۔ اس طرح باہر لے جانے کے لیے بھی یہی دن موزوں ہے کیونکہ اس کے بعد آرام کے لیے چھٹی مل جائے گی۔

☆ **اپنے ادارے کے حالات کا لحاظ:** کسی دوسرے ادارے کا نظام الاوقات خواہ کتنا

ہی معیاری کیوں نہ ہو اس کی من وعن نقل کسی دوسرے ادارے کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔
ہر ادارے کو اپنے حالات، اپنی ضروریات اور اپنے اساتذہ کی تعداد ان کی صلاحیت، عمارت میں گنجائش وغیرہ ملحوظ رکھ کر اپنا نظام الاوقات خود بنانا چاہیے۔

☆ نظام الاوقات تین ہونے چاہئیں۔

۱۔ پورے ادارے کا اجمالی، جس کی ایک نقل صدر مدرس کے پاس، دوسری نوٹس بورڈ پر چسپاں ہونی چاہئے۔ یہ نظام الاوقات اتنا واضح ہونا چاہیے کہ دیکھنے والا اندازہ لگا سکے کہ کس درجے اور کس گھنٹے میں کون مدرس کیا مضمون پڑھا رہے ہیں اور درجے کا کلاس ٹیچر کون ہے۔ نیز ادارے میں کیا کام ہوتا ہے۔

۲۔ درجہ وار مفصل: ہر درجے کے کلاس ٹیچر اجمالی نظام الاوقات میں سے اپنے درجے کا جزو نقل کر کے درجے میں لگا دیں اور طلبہ کو نوٹ کرا دیں۔ آموختہ دیکھنے، ہوم ورک دینے اور بیرون نصاب مصروفیات کا پروگرام بھی اس میں درج ہونا چاہیے۔

۳۔ معلم وار: اس میں یہ دکھایا جائے کہ ہر معلم ہفتے بھر مختلف گھنٹوں میں کس کس درجے میں کیا کیا مضمون لیتا ہے اور کون کون سے گھنٹے خالی رہتے ہیں۔ یہ بھی صدر مدرس کے دفتر میں ہونا چاہیے۔ ہر معلم کو اپنے سے متعلق جز اپنی ڈائری میں نقل کر لینا چاہیے۔ ان کے نمونے منسلک ہیں۔

☆☆☆

اساتذہ کے خانے [illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	درجات
	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	کلاس ٹیچر
	اجتما	عی	حا	ضر	ی	۱۰_۱۰:۱۵
	درجہ	وار	حا	ضر	ی	۱۰:۱۵_۱۰:۲۰
	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
	وقفہ	برائے	کھانا	ونماز	ظہر	[illegible]
	دوسری	حا	ضر	ی		[illegible]
	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
	طلبہ سے	کلاس ٹیچر	انفرادی	ملاقاتیں		۲:۵۰_۳
						[illegible]

گھنٹی تیاری ۹:۵۵ — مکمل نظام الاوقات درسگاہ .... از یکم جولائی سنہ ۲۰..

دن	۱۰:۱۰ تا ۱۰:۱۵	۱۰:۱۵ تا ۱۰:۲۰	I ۱۰:۲۰ تا ۱۰:۵۰	II ۱۰:۵۰ تا ۱۱:۲۰	III ۱۱:۲۰ تا ۱۱:۵۰	II' ۱۱:۵۰ تا ۱۲:۲۰	I ۱۲:۲۰ تا ۱۲:۵۰	۱۲:۵۰ تا ۱:۲۵	۱:۲۵ تا ۱:۵۰	II ۱:۵۰ تا ۲:۲۰	III ۲:۲۰ تا ۲:۵۰	IIII ۲:۵۰ تا ۳:۲۰	I ۳:۲۰ تا ۳:۵۰		کیفیت
ہفتہ	ی	ی	ناظرہ عبدالغفار	ریاضی تحریری امین صاحب	ریاضی زبانی امین صاحب	اردو پڑھنا عبدالغفار	آرٹ عبدالغفار	نماز	ی	بنگالی پڑھنا امین صاحب	جغرافیہ عبدالغفار	فقہ و عقائد عبدالمجید	باغبانی امین صاحب	ت	
اتوار	ضر	ضر	ناظرہ "	"	اردو نقل عبدالغفار	"	کرافٹ "	و	ضر	"	عام سائنس "	"	حسب دلچسپی "	ملاقا	
پیر	حا	حا	حفظ "	"	ریاضی زبانی امین صاحب	"	آرٹ "	کھانا	حا	بنگالی لکھنا "	جغرافیہ "	سیرت و تعلیمات "	باغبانی "	ی	
منگل	عی	ر	ناظرہ "	"	اردو و انشاء عبدالغفار	"	کرافٹ "	برائے	ی	بنگالی پڑھنا "	عام سائنس "	فقہ و عقائد "	حسب دلچسپی "	د	
بدھ	جتما	وا	ناظرہ "	"	ریاضی زبانی امین صاحب	"	آرٹ "	وقفہ	سر	"	جغرافیہ عام سائنس	"	باغبانی "	انفرا	
جمعرات	ا	درجہ	اعادہ	"	اردو املاء عبدالغنی	"	کرافٹ "	و	دو	بنگالی لکھنا "	"	سیرت و تعلیمات "	بچوں کا اجتماع عبدالغفار		

۵۔ رجسٹر اور دوسرے ریکارڈ

ہر منظم ادارے کو متعدد رجسٹر اور فائلیں رکھنی پڑتی ہیں۔ان میں ادارے سے متعلق مختلف قسم کا ریکارڈ محفوظ ہوتا ہے۔ان کا رکھنا متعدد وجوہ سے نہایت ضروری ہے۔

ضرورت واہمیت:

☆ ان کے ذریعے ادارے کی رفتار ترقی کا اندازہ ہوسکتا ہے

☆ اساتذہ اور طلبہ وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔

☆ ادارے کی ضروریات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

☆ ادارے کی آمد وصرف وغیرہ کے متعلق معلومات ہوسکتی ہیں۔

☆ ذمہ داران ادارہ، اساتذہ اور بچوں کے سرپرستوں کو طلبہ کی حاضری، نتائج امتحانات، رفتار ترقی وغیرہ کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

☆ ادارے کے متعلق ذمہ داروں کے تاثرات، احکامات، ہدایات وغیرہ علم میں آسکتے ہیں۔

☆ ادارے کی فلاح وبہبود کے بارے میں غور وفکر کرنے اور آئندہ کے لیے منصوبے بنانے میں مدد مل سکتی ہے۔

☆ طلبہ کی متوازن تعلیم وتربیت، ترقی وجماعت بندی میں سہولت ہوتی ہے۔

قابل لحاظ امور:

رجسٹر اور فائلیں وغیرہ رکھنے کے ضمن میں مندرجہ ذیل باتیں پیش نظر ہونی چاہئیں۔

☆ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے دفتری کام کم سے کم کرنا پڑے۔

☆ وہی ریکارڈ رکھے جائیں جو واقعی ناگزیر ہوں، جن کے بغیر کام چل سکتا ہو۔ان پر وقت اور قوت ضائع کرنا درست نہیں۔بعض ادارے اپنے اساتذہ کا وقت بلاوجہ ایسے ریکارڈ

لکھوانے پر ضائع کراتے ہیں کہ نمائش کے سوا جن کی کوئی افادیت نہیں ہوتی۔ وہی وقت اگر کمزور طلبہ پر انفرادی توجہ دینے پر صرف کیا جائے تو کہیں زیادہ مفید اور نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔

☆ بہت احتیاط سے ریکارڈ رکھے جائیں۔ صحت کے ساتھ ضروری تفصیلات کے اندراج کا پورا اہتمام کیا جائے تا کہ معلومات تشنہ نہ رہیں اور ان پر پورا اعتماد کیا جا سکے۔

☆ ریکارڈ رکھنے کے پیچھے اساتذہ کا اتنا وقت نہ صرف کرایا جائے کہ تدریس وتربیت سے متعلق ان کے فرائض متاثر ہو جائیں بہتر ہو کہ اس طرح کے کاموں کے لیے روزانہ دو ایک پیریڈ خالی رکھے جائیں اور ماہانہ ریکارڈ مرتب کرنے اور جسٹر وغیرہ مکمل کرنے کے لیے مہینہ کی آخری تاریخ کو دوسری میٹنگ میں طلبہ کو چھٹی دے دی جائے۔

☆ ہر کام کے لیے حتی الامکان علیحدہ فائلیں اور رجسٹر رکھے جائیں۔ اس طرح بوقت ضرورت بآسانی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

☆ اندراجات بروقت کر دیئے جایا کریں تا کہ ریکارڈ مکمل رہا کرے۔ اس میں تاخیر روانہ رکھی جائے ورنہ ایسے ناقص ریکارڈ سے ان کے رکھنے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

ہر ادارے کو مندرجہ ذیل رجسٹر رکھنے چاہئیں۔

ا۔ رجسٹر داخل خارج:

یہ نہایت اہم رجسٹر ہے۔ اس میں ہر داخل ہونے والے طالب علم کے متعلق مفصل معلومات ہوتی ہیں۔ مثلاً نمبر داخلہ، نام طالب علم، تاریخ پیدائش، والد کا نام مع مکمل پتہ، سرپرست کا نام مع مکمل پتہ (اگر والد کے علاوہ ہوں) مذہب یا مسلک، والد یا سرپرست کا ذریعہ معاش۔ درجہ جس میں داخل ہوا ہے۔ ہر جماعت سے ترقی پانے کی تاریخیں، مدرسہ چھوڑنے کی تاریخ مع وجوہ، چال چلن وغیرہ۔

اس رجسٹر کے تمام اندراجات بروقت اور نہایت احتیاط سے ہونے چاہئیں۔

۲۔ رجسٹر حاضری طلبہ:

یہ دوسرا اہم رجسٹر ہے۔ مدرسہ میں اگر طلبہ کی تعداد بہت کم ہو تب تو خیر ایک ہی رجسٹر سے کام چلایا جا سکتا ہے ورنہ ہر درجے کا علیحدہ رجسٹر ہونا چاہیے۔ رجسٹر حاضری رکھنے اور پابندی سے حاضری لینے کی ذمہ داری کلاس ٹیچر کی ہے۔ حاضری بروقت ہونی چاہیے۔ غیر حاضری یا دیر سے حاضر ہونے پر طلبہ سے باز پرس کرنی چاہیے اور انہیں سرپرست کی تصدیق سے درخواست بھیج کر چھٹی لینے کا پابند بنانا چاہیے۔ بعض مدارس میں ماہانہ فیس کے اندراجات بھی اسی رجسٹر میں ہوتے ہیں۔ یہ اندراجات بہت احتیاط سے کرنے چاہئیں اور روزانہ یا فیس کے دن جو رقم جمع ہوا سے فوراً خزانچی کے پاس جمع کر دینا چاہیے۔ ہر ماہ کے اختتام پر ہر طالب علم کی پورے ماہ کی حاضری کا میزان اور سابقہ حاضری کو ملا کر مکمل میزان اور فیس کا گوشوارہ مرتب کر کے صدر مدرس سے دستخط لینا چاہئیں۔ روزانہ حاضری کے بعد بھی حاضر طلبہ کی تعداد نیچے لکھ کر دستخط کر دینا چاہئیں۔

۳۔ رجسٹر حاضری اساتذہ:

یہ بھی نہایت ضروری رجسٹر ہے۔ اگر اساتذہ کی تعداد کم ہو تو رجسٹر کے بجائے ایک معمولی کاپی سے یہ کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ رجسٹر اسٹاف روم میں ہونا چاہیے۔ اساتذہ کو حاضری کی گھنٹی سے کم از کم پانچ منٹ پہلے پہنچ کر پابندی سے اس میں اپنے نام کے سامنے دستخط ثبت کر کے آمد کا (اور اگر ضرورت محسوس ہو تو رفت کا بھی) وقت نوٹ کر دینا چاہیے۔ اس رجسٹر میں تعطیلات کی تفصیل اور ہر استاد کی رخصتوں کی نوعیت درج ہونی چاہیے۔ اساتذہ کو پابند بنانا چاہیے کہ وہ تحریری درخواستوں کے ذریعے رخصت لیا کریں جس کی منظوری ناظم ادارہ یا جو بھی مجاز ہو اس سے پیشگی حاصل کر لینی چاہیے الا یہ کہ کوئی ہنگامی ضرورت پیش آ جائے اور ایسا کرنا ممکن نہ ہو۔ رخصتوں کے استحقاق کو اپنا ایسا حق ہرگز نہ تصور کرنا چاہیے جسے ہر حال میں استعمال ہی کرنا ہے بلکہ ایسی رعایت تصور کرنا چاہیے جو بحالت مجبوری قبول کی جائے۔ مہینے کے آخر میں پورے ماہ کی رخصتوں کا مدوار

میزان نوٹ کر دیا جائے۔ ساتھ ہی شروع میقات سے اب تک جس نوعیت کی رخصت لی گئی ہو اس کی بھی مدوار میزان دے دی جائے مثلاً رخصت اتفاقیہ، رخصت علالت وغیرہ۔ منظور یا نامنظور شدہ درخواستیں احتیاط سے دفتر میں محفوظ رہنی چاہئیں۔

۴۔ قبض الوصول:

ہر ادارے میں ایک قبض الوصول بھی ہونا چاہیے جس میں تمام کارکنان ادارہ کے نام، عہدے، مشاہرات، تنخواہیں، بھتے، کٹوتیاں وغیرہ درج ہونی چاہئیں اور تنخواہ تقسیم کرتے وقت ہر کارکن سے اس پر دستخط لے لیا کرنے چاہئیں۔ اسٹاف اگر کم ہو تو رجسٹر کے بجائے ایک معمولی کاپی سے کام چل سکتا ہے۔

۵۔ رجسٹر آمد وصرف (کیش بک):

ادارے میں روزانہ جو لین دین بھی ہو اس کو پابندی سے اس رجسٹر میں درج ہونا چاہیے۔ فیس، اعانت، چندے وغیرہ آمد کے خانے میں اور تنخواہیں، وظیفے، خریدی ہوئی اشیاء کی قیمتیں وغیرہ صرف کے خانے میں جو آمدنی بھی ہو وہ رسیدوں کے ذریعے ہونی چاہیے اور جو خرچ بھی ہو اس کی رسیدات اور واؤچر محفوظ ہونے چاہئیں۔ حساب کتاب نہایت صاف رکھنا چاہیے تاکہ کسی کو کسی طرح کے شبہے کی گنجائش نہ رہے۔ آمدنیاں خزانچی کے پاس جلد از جلد جمع کر دی جایا کریں۔ اپنے پاس ہرگز نہ رکھنی چاہئیں۔

۶۔ رجسٹر موجودات (اسٹاک رجسٹر):

ایک اسٹاک رجسٹر بھی ضروری ہے جس میں مدرسے کی موجودات کا اندراج ہو۔ مدرسے کے لیے جب بھی کوئی مستقل نوعیت کی چیز خریدی یا کہیں سے حاصل کی جائے۔ اسے اسٹاک رجسٹر میں بروقت درج کر دینا چاہیے۔ مثلاً میز، کرسیاں، الماریاں، لوٹے، تختہ سیاہ کھیل کے سامان صندوق وغیرہ، چیز کے نام اور تعداد کے ساتھ تاریخ خریداری اور قیمت کا بھی اندراج ہونا

چاہیے۔ مدرسے کی تمام املاک کی دیکھ بھال حفاظت اور اسٹاک رجسٹر کی وقتاً فوقتاً جانچ ہونی چاہیے جو اشیاء ٹوٹ پھوٹ یا گم ہو جائیں انہیں ادارے کے ذمہ دار افراد کے علم اور اجازت سے خارج یا ان کا بدل فراہم کر دینا چاہیے۔

۷۔ معائنہ بک:

ہر مدرسے میں ایک معائنہ بک بھی ہونی چاہیے۔ جس میں ذمہ داران ادارہ اور صاحب صلاحیت حضرات کے تاثرات، ہدایات اور مشورے درج ہوا کریں۔

۸۔ رجسٹر کتب خانہ:

مدرسے کی لائبریری کا بھی ایک رجسٹر ہونا چاہیے جس میں نمبر شمار، کتاب کا نام، مصنف، تاریخ خریداری، قیمت وغیرہ درج ہونی چاہیے۔ اگر لائبریری بڑی ہو تو ایک رجسٹر ایسا ہونا چاہیے جس میں تمام کتب کا اندراج فن وار ہو۔ مثلاً تفاسیر، احادیث فقہ، تاریخ اسلام، اردو ادب، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کے تحت، اس سے اپنے ذوق وضرورت کی کتاب بآسانی تلاش کی جاسکتی ہے۔

۹۔ کتاب الاحکام:

ایک رجسٹر ایسا بھی ہونا چاہیے جس میں صدر مدرس یا ادارے کے ذمہ دار کی طرف سے وقتاً فوقتاً دی جانے والا ہدایات، احکام، اطلاعات (نوٹس) وغیرہ درج کی جائیں۔ ہر حکم پر متعلقہ حضرات کے دستخط کرا لینے چاہئیں۔ نوٹس اگر طلبہ سے متعلق ہو تو جس درجے میں جو استاد سنائے وہ دستخط کے نیچے درجے کا نام بھی لکھ دے۔

۱۰۔ رجسٹر مراسلات:

ادارے میں موصول ہونے والے یا ادارے کی طرف سے دوسروں کو لکھنے جانے والے خطوط کے بارے میں ضروری یادداشت کے لیے ایک ضروری رجسٹر ہونا چاہیے جس میں خط بھیجنے یا آنے کی تاریخ مکتوب الیہ یا کاتب کا نام اور اختصار سے مضمون کا خلاصہ درج ہونا چاہیے تاکہ

وقت پر حوالہ دیا جاسکے۔

ان رجسٹروں کے علاوہ ادارے کے ہر کارکن کی ایک فائل ہونی چاہیے جس میں اس سے متعلق ضروری کاغذات ومعلومات محفوظ رہیں۔ مثلاً تقرر کا حکم، شرائط، علمی لیاقت، گریڈ، کارکردگی کی رپورٹ، ترقی وتنزل مخصوص رخصتیں وغیرہ۔

علاوہ ازیں ہر استاد کے پاس ڈائری ہونی چاہیے جس میں بروقت اندراجات ہوں اور صدر مدرس وقتاً فوقتاً ان کی جانچ کرلیا کرے۔ ڈائری میں متعلقہ مضامین کا مختصر اور تفصیلی نصاب، پورے سال کا تدریسی خاکہ، طریقہ تعلیم کے بارے میں مختصر نوٹ وغیرہ درج ہونا چاہیے۔

۶۔ غیر نصابی مصروفیات

والدین اور اساتذہ کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ بچے لکھنے پڑھنے میں تیز ہوں اور محنت سے کتابی علم حاصل کریں۔ بلاشبہ ان کی یہ خواہش بجا ہے اور اس کے حصول کی پوری کوشش بھی ہونی چاہیے۔ لیکن تنہا کتابی علم سے تعلیم کے ہمہ گیر مقاصد ہرگز حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے متعدد ایسے مشاغل ومصروفیات کا بھی بندوبست کرنا ہوگا جن میں عملی حصہ لے کر طلبہ اپنی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرسکیں۔ انہی کو غیر نصابی مصروفیات ومشاغل کہتے ہیں۔ ان کی اہمیت وافادیت نصابی تعلیم سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ چنانچہ آج کل مدارس میں ان پر غیر معمولی توجہ دی جارہی ہے۔

مصروفیات ومشاغل:

مدارس میں اگر مندرجہ ذیل مصروفیات ومشاغل کا اہتمام کیا جائے اور بچوں کو ان میں عملی طور پر حصہ لینے کے پورے مواقع ملیں تو ان کی تربیت میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

☆ **بچوں کے اجتماعات منعقد کرنا:** ہر جمعرات کو گھنٹے مختصر کرکے ان کے لیے وقت نکالا جائے۔ مہینے میں تین اجتماعات تو کلاس ٹیچر کی نگرانی میں درجہ وار ہوں۔ ایک انتظامی

وتربیتی جس میں درجے کی صفائی، آرائش، انتظامات، فلاح وبہبود وغیرہ سے متعلق منصوبے بنائے جائیں اور طلبہ میں انفرادی واجتماعی حیثیت سے ذمہ داریاں تقسیم کی جائیں اردو میں بچے تقریر، مکالمے، کہانیاں، نظمیں، چٹکلے، لطیفے وغیرہ پیش کرنے کی مشق کریں۔ کوشش کی جائے کہ درجے کا ہر بچہ کم از کم ایک بار کچھ نہ کچھ ضرور پیش کرے۔ آخری اجتماع پورے ادارے کا ماہانہ ہو جس میں تمام بچے شریک ہوں اور ہر درجے کے نمائندے پروگرام میں عملی حصہ لیں۔ ان اجتماعات میں فرش وفروش سے لے کر پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے کا سارا کام اساتذہ کی رہنمائی میں خود طلبہ اور ان کی ٹولیاں انجام دیں۔ صدر سیکرٹری وغیرہ بچے ہی ہوں اور ان کی سرکردگی میں پروگرام چلایا جائے۔

☆ مدرسے کی تقریبات، سرپرستوں کے اجتماعات، مہمانوں کی دیکھ بھال، تقسیم انعامات کے جلسے، تعلیمی ہفتے وغیرہ کے مختلف پروگراموں اور انتظامات میں عملی حصہ لینے کے مواقع بہم پہنچانا۔

☆ طلبہ کی مختلف قسم کی جمعیتوں کی تشکیل جن کے سپرد مندرجہ ذیل کام ہوں اور جنہیں وہ اساتذہ کی رہنمائی میں سلیقے سے انجام دیں۔

۱۔ عام صحت وصفائی کی دیکھ بھال، کھیل، پی ٹی اور مختلف قسم کے مقابلوں کا اہتمام۔

۲۔ پکنک، تعلیمی سیر وسیاحت، قلمی رسالہ، دارالمطالعہ، نئے کمزور اور نادار طلبہ کی امداد، بچوں کی دوکان، اجتماعی کھانے کا اہتمام۔

۳۔ نمائش اور مدرسے کے عجائب خانے کے لیے نوادرات جمع کرنا اور سامان تیار کرنا، میز بانی، عیادت اور تیمار داری وغیرہ۔

۴۔ طلبہ کو مختلف معاشرتی آداب اور طور طریقے سکھانے، اصول وضوابط کی پابندی کرانے، شرارتوں اور برائیوں سے بچانے، نماز کی پابندی کرانے میں امداد۔

اہمیت وافادیت:

ان مصروفیات ومشاغل کی بڑی اہمیت ہے۔ان کے ذریعہ:

☆ بچوں کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی ہم آہنگ تربیت ہوگی۔

☆ کتابوں میں جو کچھ پڑھتے ہیں اس کو زندگی میں برتنے کے مواقع ملیں گے۔اور وہ کتابی کیڑا بننے کے بجائے عملی انسان بنیں گے۔

☆ احساس ذمہ داری، اصول وضوابط کی پابندی، انہماک، تعاون، ایثار خدمت وغیرہ کے اجتماعی اوصاف اور تعمیری اخلاق پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔

☆ فرصت کے اوقات کو دلچسپ اور مفید مشاغل نیز اجتماعی مفاد کے کاموں میں استعمال کرنے کی تربیت ہوگی۔

☆ مدرسے، گھر اور معاشرے کے مابین جو خلیج حائل ہوگئی ہے، اسے پاٹنے میں مدد ملے گی۔

☆ بچوں کی مخصوص فطری صلاحیتوں کو نشو ونما دینے کے مواقع ملیں گے۔

☆ ہر مزاج، طبیعت اور صلاحیت کا بچہ مدرسے کی متوازن زندگی میں دلچسپی لینے لگے گا اور وہ تعلیم سے بھاگنے سے محفوظ رہے گا۔

مگر یہ فائدے اسی وقت ہو سکتے ہیں جب:

☆ ہر بچے کو اس کی صلاحیت کے مطابق عملی حصہ لینے کا موقع ملے۔کوئی بچہ محروم نہ رہ جائے۔ سست، شرمیلے اور کم ہمت بچوں کو بھی حصہ لینے پر اکسایا جائے۔

☆ ہر پروگرام بامقصد، مفید اور ادارے کے بنیادی مقصد سے ہم آہنگ ہو اور بچے کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو کی تربیت سے براہ راست یا بالواسطہ تعلق رکھتا ہو۔

☆ طلبہ کی دلچسپیوں، خواہشات اور امنگوں کا حتی الامکان لحاظ رکھا جائے تاکہ وہ پوری تندہی اور انہماک سے حصہ لیں۔

☆ جائز حدود میں آزادی دی جائے۔ جبر، دباؤ اور بے جامداخلت سے پرہیز کیا جائے۔

☆ ادارے کی وسعت، استطاعت، اساتذہ کی لیاقت وصلاحیت کو دیکھتے ہوئے مختلف نوعیتوں کی اورزیادہ سے زیادہ مصروفیات کا بندوبست کیا جائے۔ ہر بچہ اپنی دلچسپی اور پسند کی مصروفیات میں حصہ لے سکے۔

☆ پروگرام ایسے بنائے جائیں کہ ایک بچہ ایک سے زیادہ مشاغل میں حصہ لے سکے۔

☆ بعض بچے مختلف مصروفیات ومشاغل پر ایسے چھا جاتے ہیں کہ دوسروں کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں ملتا اور خود ان کا بھی بہت زیادہ وقت اور غیر معمولی توجہ ان مصروفیات کی نذر ہو جاتی ہے اور وہ نصابی کاموں کو نظر انداز کرنے لگتے ہیں۔ ایسا نہ ہونے دیا جائے۔

☆ کوشش کی جائے کہ نصابی اور غیر نصابی مصروفیات ایک دوسرے کی معاون ہوں اور دونوں میں اعتدال وتوازن رہے، ایک طرح کی مصروفیات کی وجہ سے دوسری طرح کی مصروفیات متاثر نہ ہونے پائیں۔

☆ ایسے پروگرام نہ بنائے جائیں جن میں صرفہ زیادہ ہو اور طلبہ کے سرپرستوں کی جیب پر بار زیادہ پڑے۔

☆ نگرانی اور رہنمائی کا پورا بندوبست کیا جائے تاکہ بچوں کی صلاحیتیں غلط رخ پر نہ پڑنے پائیں اور ان میں اعلیٰ اوصاف کے بجائے برائیاں نہ پروان چڑھنے لگیں۔

۷۔ بچوں کی تعلیم وتربیت میں گھر اور مدرسہ کا تعاون

بچوں کی تعلیم وتربیت کا منظم ادارہ مدرسہ ہے۔ مدرسے میں باصلاحیت اساتذہ کی ایک ٹولی اس فریضہ کو بحسن وخوبی انجام دینے پر مامور ہوتی ہے۔ دیہی علاقوں میں معاشرے کی اصلاح کے مراکز بھی یہی مدرسے شمار ہوتے ہیں۔ اس لیے بجاطور پر ان سے بڑی توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ مدرسے میں داخل کرنے کے بعد والدین عموماً اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کی طرف سے

غافل ہو جاتے ہیں انہیں اطمینان ہو جاتا ہے کہ اب یہ کام مدرسہ خود انجام دے گا۔ اساتذہ بھی والدین کی عدیم الفرصتی یا جہالت کے باعث انہیں معذور سمجھتے اور ان کا تعاون حاصل کرنے کی پوری کوشش نہیں کرتے۔ اس طرح تعلیم وتربیت کا پورا بار جو مل جل کر ہی اٹھایا جا سکتا ہے، تنہا مدرسے پر آپڑتا ہے جسے وہ محدود وقت میں کسی طرح نہیں اٹھا پاتا اور وہ توقعات پوری نہیں ہوتیں جو عموماً مدرسے سے وابستہ کر لی جاتی ہیں۔ اس لیے اپنے فرائض سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ، بچوں کے والدین خصوصاً ان کی ماؤں کا تعاون حاصل کرنے کی پوری کوشش کریں۔

سرپرستوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ

☆ اساتذہ خوش اخلاق اور ملنسار ہوں۔ روابط قائم کرنے کے لیے وقت نکالیں، کشادہ دلی سے ملیں اور عزت سے پیش آئیں۔

☆ ان کے اعتراضات شکایات یا مشورے خندہ پیشانی سے سنیں۔

☆ ان کے بچوں کی تعلیم وتربیت اور بھلائی و بہتری میں پوری دلچسپی لیں۔

☆ ان کے بچوں کی رفتار ترقی وغیرہ سے برابر انہیں باخبر رکھیں۔

☆ تعلیم وتربیت سے متعلق ان کی ذمہ داریوں کو اچھے الفاظ میں یاد دلاتے رہیں۔

☆ مدرسے کی مختلف تقریبات میں انہیں شرکت کے لیے مدعو کریں اور پروگرام میں حتی الامکان ان کی دلچسپی کا لحاظ کریں۔

☆ وقتاً فوقتاً سرپرستوں کے اجتماعات منعقد کریں۔

سرپرستوں کے اجتماعات:

ہر تعلیمی سال میں کم از کم دو بار سرپرستوں کے اجتماعات منعقد کیے جائیں۔ ایک تعلیمی سال کے شروع میں داخلوں کے بعد، دوسرا وسط سال میں تعلیمی ہفتے وغیرہ کے موقع پر۔

پہلے اجتماع کا پروگرام کچھ اس طرح کا ہونا چاہیے۔

۱۔ سب سے پہلے دلنشیں پیرائے میں اختصار سے ادارے کا بنیادی مقصد، پالیسی اور پروگرام سمجھایا جائے۔

۲۔ پھر بچوں کی تعلیم وتربیت اور مدرسے کی فلاح وبہبود کے سلسلے میں ان کے تعاون کی ضرورت واہمیت بتائی جائے۔

۳۔ پھر تعاون کی مندرجہ ذیل شکلوں کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے۔

الف۔ گھریلو فضا کو تعلیم وتربیت کے لیے سازگار بنانا اور گھر نیز مدرسے کی زندگی میں تفاوت کو کم کرنے کی کوشش کرنا۔

ب۔ ادارے کے قواعد وضوابط اور ہدایات پر عمل کرنا۔

ج۔ بچے.... کو حاضری کا پابند بنانے آموختہ دیکھنے اور ہوم ورک پورا کرانے کا انتظام کرنا۔

د۔ بچے کی تربیت کے سلسلے میں مدرسے کے پروگراموں پر فرصت کے اوقات میں عمل کرانا۔

ہ۔ بری صحبت سے بچانے کی فکر کرنا۔

ر۔ غیر نصابی مصروفیات سے فائدہ اٹھانے میں مدد کرنا۔

ز۔ نماز کی پابندی، پسندیدہ عادات واطوار کے قیام اور گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے لیے بچوں کو برابر اکساتے رہنا۔

ح۔ بچے کے سامنے ادارے کی ہوا خیزی نہ ہونے دینا۔

ط۔ ادارے کی بھلائی بہتری اور ترقی کے لیے مشورے اور عملی تعاون سے نوازتے رہنا۔

۴۔ آخر میں بچوں کی تعلیم وتربیت اور مدرسے کی فلاح وبہبود کے متعلق سرپرستوں سے تجاویز مانگی جائیں اور ان پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔ دوسرے اجتماع میں مدرسے کے

مختلف پروگرام اور بچوں کے کام دکھائے جائیں اور اس تعاون کا ٹھنڈے دل سے جائزہ لیا جائے جو مدرسے اور گھر نے ایک دوسرے کے ساتھ کیا ہے۔ قابل لحاظ امور کی طرف مزید توجہ دلائی جائے۔

ان اجتماعات کی اہمیت وافادیت:

اگر یہ کام سلیقے سے انجام دیا جائے تو مندرجہ ذیل فوائد متوقع ہیں۔

☆ بچوں کی تعلیم وتربیت میں سرپرستوں کا پورا تعاون حاصل ہوگا۔

☆ مدرسے کے اغراض ومقاصد سے ہمدردی اور دلچسپی پیدا ہوگی۔

☆ گھر اور مدرسے کی فضا میں ہم آہنگی پیدا ہوگی۔

☆ بچوں کے ساتھ ان کے گھروں کی اصلاح میں بھی مدد ملے گی۔

☆ مدرسہ اپنے فرائض زیادہ اچھے ڈھنگ سے انجام دے سکے گا۔

☆ ہمدردوں کا حلقہ بہت وسیع ہو جائے گا جس سے مدرسے کی توسیع اور مقبولیت میں کافی مدد ملے گی۔

☆ سرپرستوں کی غلط فہمیاں دور ہوں گی اور وہ اپنے فرائض کا احساس کرنے لگیں گے۔

کوشش کی جائے کہ سرپرستوں کے اجتماعات سے یہ فوائد بہر حال حاصل ہوں۔

۸۔ تعلیمی ہفتہ یا سالانہ جلسہ

ہر مدرسے کو سال میں ایک بڑی تقریب ضرور منانی چاہیے۔ اس سے متعدد فائدے ہوں گے۔

☆ ادارے کی خدمات سے لوگ متعارف ہوں گے اور اس کی اہمیت وافادیت کا انہیں اندازہ لگانے کا موقع ملے گا۔

☆ پبلک میں اثر ونفوذ کا ذریعہ ہاتھ آئے گا۔ لوگوں کا تعاون اور ہمدردیاں حاصل کرنے کے

لیے راہیں کھلیں گی اور ادارے کی توسیع وترقی سے دلچسپی لینے والوں کا حلقہ وسیع ہوگا۔

☆ طلبہ کی عملی تربیت کے کافی مواقع ملیں گے اور ادارے سے ان کی عمومی دلچسپی میں اضافہ ہوگا۔

☆ بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت کا لوگوں میں احساس پیدا ہوگا اور دینی تعلیم کی ترویج واشاعت میں مدد ملے گی۔

☆ گردوپیش کی اصلاح اور لوگوں میں دینی روح بیدار کرنے کا موقع ملے گا۔

پروگرام:

اس تقریب کا پروگرام مندرجہ ذیل عنوانات پر مشتمل ہوسکتا ہے۔ اپنے حالات، ضروریات اور استطاعت کے مطابق ان میں ترمیم واضافہ کر لینا چاہیے۔ اگر ایک ادارہ تنہا کوئی موثر اور کامیاب پروگرام نہ چلا سکے تو آس پاس کے، چند اداروں کو مل کر باری باری ایک ایک ادارے میں یہ کام انجام دینا چاہیے۔

☆ دین کے تقاضے اور دینی تعلیم کی اہمیت وغیرہ پر صاحب صلاحیت حضرات کی تقاریر کا اہتمام، تقریریں مختصر جامع سنجیدہ اور موثر ہونی چاہئیں اور ایک نشست میں دو سے زیادہ نہ ہوں۔

☆ تعلیمی نمائش جس میں طلبہ اور اساتذہ کی تیار کردہ اشیاء، ان کے فراہم کردہ ''نوادرات'' تعلیم وتربیت سے متعلق پوسٹر، دینی معلومات کے چارٹ، مختلف مضامین کی تعلیم کے لیے استعمال ہونے والے توضیحی وتعلیمی سامان، صحت وصفائی اور عام معلومات سے متعلق نقشے خاکے اور ماڈل وغیرہ ترتیب اور سلیقے سے آراستہ کیے جائیں اور اطمینان سے دکھانے اور اچھی طرح سمجھانے کا اہتمام کیا جائے۔ نمائش محفوظ جگہ میں ہو۔ ایک طرف سے آنے اور پوری نمائش دیکھ کر دوسری طرف سے نکلنے کا راستہ دیا جائے۔ راستے کے کنارے باڑھ لگا دی جائے تاکہ دیکھنے والے چیزوں کو ہاتھ نہ لگا سکیں، اگر روشنی کا معقول بندوبست ہو سکے

تو نمائش رات میں زیادہ اچھی لگتی ہے۔

☆ کھیلوں کے مقابلے اور پی ٹی ،فرسٹ ایڈ، کشتی، لاٹھی وغیرہ کے مظاہرے،کھیلوں میں فٹ بال ،والی بال، کبڈی ،رسہ کشی ،لمبی اور اونچی کود، چھوٹے بچوں کی کرسی دوڑ ،نارنگی دوڑ ،جلیبی دوڑ ،چمچہ دوڑ ،رومال جھپٹ، اندر باہر تین ٹانگ کی دوڑ وغیرہ میں سب کو بڑا لطف آتا ہے۔

☆ بیت بازی، تقاریر،خوش نویسی اور مضمون نگاری وغیرہ کے مقابلے۔

☆ ادبی مجلس کا اہتمام یا بچوں کا نقلی مشاعرہ جس میں بچے مشہور شعراء کی دلچسپ اور سبق آموز نظمیں سلیقے سے پیش کریں۔

☆ بچوں کی طرف سے خطاب عام۔ اس میں بچے پبلک کے سامنے، مختصر تقاریر، مکالمے، چٹکلے، لطیفے، موثر نظمیں، سبق آموز کہانیاں وغیرہ مختلف زبانوں میں پیش کریں۔

☆ جلسہ تقسیم انعامات مختلف مقابلوں میں کامیاب ہونے والے، اپنا پروگرام سلیقے سے پیش کرنے والے امتحان میں پوزیشن لانے والے، نمائش کے لیے اچھا سامان تیار کرنے والے بچوں کو انعامات دیئے جائیں۔ انعامات میں مفید دلچسپ اور قابل فہم کتابیں، لکھنے پڑھنے کا سامان، سرٹیفکیٹ، تعلیمی کھلونے دینے چاہئیں۔ انعام بہرحال انعام ہے اس کا قیمتی ہونا ضروری نہیں ہے۔

قابل لحاظ امور:

اس تقریب کو مفید موثر اور کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ:

☆ تقریب خوشگوار موسم میں رکھی جائے اور ضروری پروگرام ایسے وقت رکھے جائیں جب زیادہ تر لوگ فارغ ہوں اور بآسانی شرکت کرسکیں۔ مثلاً خطاب عام، ادبی مجلس، بچوں کا

مشاعرہ، نمائش وغیرہ رات میں اور مختلف قسم کے مقابلے دن میں۔ اگر موسم اجازت دے تو ششماہی اور سالانہ امتحان کے بعد رکھنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ تدریس کا زیادہ ہرج نہیں ہوتا اور تیاری کا خوب موقع ملتا ہے۔

☆ تفصیلی پروگرام کی اچھی طرح تشہیر ہو۔

☆ ادارے کو مقامی پارٹی بندیوں سے الگ تھلگ رکھا جائے تاکہ ہر ایک تقریب میں شرکت کر سکے۔

☆ تقاریر وغیرہ میں جزئی اختلافات کو چھیڑنے سے گریز کیا جائے تاکہ غلط فہمی پھیلنے کا یا پھیلانے کا موقع نہ ملے۔ اصلاحی پروگرام بھی عمومی اور ایجابی نوعیت کے ہوں۔ بچوں سے بڑوں پر کوئی تنقید ہرگز نہ کرائی جائے۔

☆ وہی پروگرام پیش کیے جائیں جن کی اچھی طرح تیاری اور خوب مشق کر لی گئی ہو۔

☆ چھوٹوں، بڑوں، عورتوں، مردوں سب کی دلچسپیوں کا لحاظ رکھا جائے۔

☆ کوشش کی جائے کہ ہر طالب علم اپنی عمر اور صلاحیت کے لحاظ سے کسی نہ کسی پروگرام میں ضرور حصہ لے۔

☆ تمام کام اپنی نگرانی میں حتی الامکان طلبہ سے انجام دلائے جائیں تاکہ انہیں ہر طرح کے کاموں کا عملی تجربہ ہو۔

☆ شرکاء کی عزت کی جائے اور انہیں ہر امکانی سہولت بہم پہنچائی جائے۔

۹۔ اقامت گاہ (بورڈنگ ہاؤس)

والدین اپنی عدیم الفرصتی یا فن تربیت سے ناواقفیت کے باعث اپنے بچوں کی طرف پوری توجہ نہیں دے پاتے، ادھر صنعتی انقلاب نے خاندانی نظام کو بہت کچھ درہم برہم کر دیا ہے۔ سماج دن بدن مادہ پرستی، الحاد اور بے دینی کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ مذہب واخلاق کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی ہے، ماحول عموماً گندے اور طرح طرح کی خرابیوں کی آماجگاہ بن گئے ہیں۔ ایسی صورت میں

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مدرسے حتی الامکان اقامتی ہوں یا کم از کم ایسا نظم کیا جائے کہ بچے اپنا بیشتر وقت اساتذہ کی معیت اور نگرانی میں گزار سکیں تا کہ ان کی مناسب دیکھ بھال پرورش اور تربیت ہو سکے۔ وہ بری صحبت سے محفوظ رہیں اور آزاد مطالعہ غیر نصابی مصروفیات کے لیے بھی کافی وقت مل سکے۔

علاوہ ازیں ہوسٹل کی اقامتی زندگی سے:

☆ طلبہ میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ وہ بہت جلد اپنی مدد آپ کرنا سیکھ لیتے ہیں اور ہر کام میں بڑوں کے محتاج نہیں رہتے۔

☆ مختلف مزاج وطبائع اور معاشرتی معیار کے بچوں کے ساتھ زندگی گزارنے اور کسر وانکسار کے ساتھ نباہ کرنے کا طریقہ سیکھ لیتے ہیں۔

☆ پسندیدہ عادات واطوار اپنانے، طریقے سلیقے اور معاشرتی آداب سیکھنے اور سیرت وکردار ڈھالنے کے لیے انہیں قابل تقلید اسوے اور مناسب مواقع ہاتھ آتے ہیں۔

☆ زندگی میں نظم وضبط پیدا ہو جاتا ہے۔ جذبات پر قابو حاصل کرنے اور اصول وضوابط کی پابندی کرنے کی عادت پڑتی ہے۔

☆ ٹولیوں میں مل جل کر کام کرنے، دوسروں کے کام آنے، محبت، ہمدردی، ایثار اور قربانی کا مظاہرہ کرنے یا تیمار داری، میزبانی، خدمت، اطاعت اور قیادت کے کافی مواقع ملتے ہیں۔

☆ قلب میں کشادگی، معلومات میں وسعت اور حوصلوں میں بلندی پیدا ہوتی ہے۔

☆ سب سے بڑی بات یہ کہ زندگی گزارنے کے لیے پاکیزہ ماحول اور اچھے ہم جولیوں کی صحبت نصیب ہوتی ہے جس کے زندگی پر بہت دور رس اثرات ہوتے ہیں اور جس کی یاد زندگی بھر تازہ رہتی ہے۔

قابل لحاظ امور:

ہوسٹل کی زندگی سے متوقع فوائد حاصل کرنے کے لیے حتی الامکان مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہنے چاہئیں۔

☆ ہوسٹل آبادی سے الگ تھلگ مدرسے کے قریب پرسکون اور کھلی فضا میں ہو۔

☆ رہائشی کمرے ہوادار، روشن اور اتنے کشادہ ہوں کہ دس تا پندرہ بچے ایک ساتھ ایک ہی کمرے میں رہ سکیں۔

☆ کمرے ضروری سامان سے آراستہ ہوں اور بچوں کے نجی سامان کو حفاظت، صفائی، ترتیب اور سلیقے سے رکھنے کا پورا بندوبست ہو۔

☆ عمارت حتی الامکان ادارے کی اپنی ہو اور حفظان صحت کے اصولوں اور ہوسٹل کی ضروریات کا لحاظ رکھ کر بنائی گئی ہو۔ کرایہ کی عمارتیں عموماً ہوسٹل کے لیے موزوں نہیں ہوتیں۔

☆ بورڈنگ کا نگران ایسے شخص کو بنایا جائے جو شفقت، محبت، ہمدردی و دل سوزی میں والدین کا مناسب بدل ہو۔ والدین ہی کی طرح بچوں کی مدد اور رہنمائی کر سکے۔ تاکہ بچوں کا دل لگے اور وہ بہت زیادہ اپنا گھر نہ یاد کریں۔ بچوں کو کنٹرول میں رکھنے ان کی تربیت و پرورش کرنے اور ان کے معاملات نمٹانے کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔ اقامت گاہ ہی کے ایک حصے میں یا عمارت سے ملحق نگراں کا بھی قیام ہونا چاہیے۔

☆ نگران کو مندرجہ ذیل امور کی خاص طور پر نگرانی کرنی چاہیے۔

۱۔ صحت وصفائی

۲۔ کھانا و ناشتہ

۳۔ مطالعہ

۴۔ کھیل

۵۔ فرصت کے اوقات کی مصروفیات

۶۔ چال چلن اور باہمی تعلقات

۷۔ نماز کی پابندی

۸۔ معاشرتی آداب کا لحاظ

۹۔ ذمہ داریوں کی انجام دہی میں انہماک وسلیقہ

۱۰۔ سامان کی حفاظت وترتیب

☆ بورڈنگ میں بچوں کی تعداد اگر بہت تھوڑی ہو تو خیر نگرانی کا کام کسی ایسے باصلاحیت استاد کے سپرد کیا جاسکتا ہے جو تدریس کے ساتھ اس کام سے متعلق زیادہ سے زیادہ وقت اور توجہ صرف کر سکتے ہوں ورنہ یہی ہونا چاہیے کہ نگراں ہمہ وقتی ہو اور اس کے سپرد مدرسے کی تدریسی یا دیگر ذمہ داریاں نہ ہوں تا کہ وہ طلبہ کی تربیت و پرورش پر پوری توجہ دے سکے۔

☆ صفائی ستھرائی خصوصاً بچوں کے لباس، بستر، رہائشی کمروں، مطبخ، کھانے کے کمرے، پیشاب خانے، پاخانے، غسل خانے، نالیوں، صحن، برآمدے وغیرہ کی صفائی کی طرف غیر معمولی توجہ دی جائے۔ فنائل، ڈی ڈی ٹی اور چونا چھڑکنے، کبھی کبھی کمروں کو دھلانے، گندھک، لوبان سلگانے وغیرہ کا بھی انتظام کیا جائے۔

☆ وقتاً فوقتاً بچوں کا طبی معائنہ کرایا جائے۔ ٹیکے اور وبائی امراض سے بچاؤ کے لیے انجکشن لگوائے جائیں۔ معمولی طبی امداد کا بورڈنگ ہی میں انتظام کیا جائے۔ مریض بچوں کے لیے علیحدہ کمرہ مخصوص کر دیا جائے۔

☆ چھوٹے اور بڑے بچوں کو الگ رکھا جائے۔ ایک کمرے میں حتی الامکان ایک ہی عمر اور ایک ہی استعداد کے بچے رکھے جائیں۔ بڑے لڑکوں کو داخل کرتے وقت ان کے چال چلن کی طرف سے اطمینان کر لیا جائے اور زیادہ بگڑے ہوئے بچوں کو بورڈنگ میں ہرگز نہ لیا جائے ورنہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندا کر دے گی۔

☆ ہر کمرے میں ایک مانیٹر ہونا چاہیے جو کمرے کی صفائی ستھرائی، سامان کی حفاظت وترتیب، کمرے میں نظم وضبط وغیرہ کے سلسلے میں بورڈنگ کے نگران کی امداد کر سکے۔

☆ طلبہ کے مختلف گروپ بنا کر ہر گروپ کو باری باری اپنے مانیٹروں یا کپتانوں کی نگرانی میں اقامت گاہ کی صفائی، کھانا کھلانے، علیل طلبہ کی تیمارداری، آموختہ دیکھنے، ہوم ورک کرنے اور دارالمطالعہ سے استفادہ کا انتظام، کھانا کھلانے، نماز کا اہتمام کرنے، مہمانوں کی خدمت اور نئے طلبہ کی امداد، کھیل، مطبخ کی دیکھ بھال وغیرہ کی ذمہ داریاں سنبھالنے کا موقع دیا جائے۔

☆ اقامت گاہ کا ایک نظام الاوقات بنا دیا جائے اور مختلف مشاغل ومصروفیات کے ضمن میں مختصر قواعد وضوابط بنا کر ان کی پابندی کرائی جائے۔ مختلف مواقع کے آداب سکھائے جائیں۔

☆ وقت پر صاف ستھری، سادہ اور متوازن غذا کا اہتمام کیا جائے۔ ادارہ اپنی ہی نگرانی میں کھانے پینے کا انتظام کرے۔ ٹھیکہ پر نہ دیا جائے ورنہ معقول انتظام ہرگز نہ ہو سکے گا۔ بچوں کی صحت اور ان کے اطمینان کے لیے کھانے پینے کے مناسب انتظام کی طرف غیر معمولی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

☆ بچوں کو محنت ومشقت اور سادہ زندگی نیز ہر طرح کا کام رفتہ رفتہ خود کر لینے کا عادی بنانا چاہیے۔ اس کے لیے انفرادی واجتماعی ذمہ داریاں سپرد کی جائیں اور ان پر عمل کے لیے اکسایا جائے۔

☆ فرصت کے اوقات کے لیے مناسب مصروفیات، جائز حدود میں بچوں کی دلچسپیوں کا لحاظ نیز کھیل کود اور تفریح کا پورا بندوبست ہونا چاہیے اس طرف سے غفلت طرح طرح کی خرابیوں کا موجب ہوسکتی ہے۔ بچوں کا دل لگنے کے لیے بھی یہ چیزیں ضروری ہیں؛ ورنہ اقامت گاہ کو بچے جیل خانہ سمجھنے لگتے ہیں۔

☆ بچوں کے عادات واطوار پر اچھی طرح نظر رکھی جائے۔ ورنہ اقامتی زندگی میں جہاں بہت

سے فائدے ہیں وہیں چال چلن کے بگڑنے، آوارہ گردی کرنے، چوری، فضول خرچی، احساس کمتری، دوسرے بچوں کی ریس، لاپروائی وغیرہ کے بہت زیادہ اندیشے ہوتے ہیں۔ بچوں کے جیب خرچ کا پیسہ نگراں کی تحویل میں رہے لیکن ان کی ضرورت پر انہیں بآسانی مل سکے۔

☆ پسندیدہ عادات ڈلوانے اور طور طریقے اور آداب سکھانے کے لیے مختلف قسم کے ہفتے منائے جائیں۔ لڑکوں کے ہفتہ واری تربیتی اجتماعات منعقد کر کے انہیں قابل لحاظ امور کی طرف برابر توجہ دلائی جائے اور وضاحت سے وہ تمام باتیں سمجھائی جائیں جو اقامتی زندگی میں مطلوب ہیں اور ان کی پابندی کے لیے ان سے عہد لیا جائے۔ کبھی کبھی طلبہ سے انفرادی ملاقاتیں کر کے ان کی مدد اور رہنمائی کی جائے۔

☆ بورڈنگ میں بچوں سے متعلق مندرجہ ذیل اندراجات ہونے چاہئیں۔

الف۔ ہر بچے کا نام، کمرہ نمبر، ولدیت، تاریخ پیدائش، گھر کا مفصل پتہ، تاریخ داخلہ۔

ب۔ ہر بچے کے سامان کی مکمل فہرست جس میں اضافہ اور کمی وغیرہ کے اندراجات برابر ہوتے رہیں۔ کپڑے بستر اور دیگر سامان پر بچے کا نام درج ہونا چاہیے تا کہ پہچاننے میں زحمت نہ ہو۔

ج۔ حساب کتاب اور مصارف کی تفصیلات۔

☆ پابندی سے بچوں کی حاضری لی جائے اور بغیر اجازت بورڈنگ سے باہر نہ جانے دیا جائے نہ رات گزارنے دی جائے۔ سوتے وقت بھی ایک بار بچوں کا جائزہ ضروری لے لیا جائے۔

بچوں کے دوست احباب، اعزہ، اقارب یا دوسرے مہمانوں اور غیر متعلق اشخاص کو بچوں کے ساتھ بورڈنگ میں قیام کی اجازت نہ دی جائے بلکہ ان کے لیے علیحدہ انتظام کیا جائے ورنہ مختلف قسم کے مفسدوں کا اندیشہ رہتا ہے۔

............☆☆☆............

باب ۳۵:

اسباق اور ان کے پڑھانے کے طریقے

اسباق کی کامیابی کا انحصار تین باتوں پر ہے۔

☆ معلم کا محنت سے سبق تیار کرنا۔

☆ درجے کے سامنے سلیقے سے سبق کو پیش کرنا۔

☆ طلبہ کا سبق کی طرف پوری توجہ دینا۔

اسباق کی تیاری:

پڑھانے سے پہلے سبق کو بخوبی تیار کر لینا چاہیے۔ تیاری کے بغیر سبق پڑھانا معلم کی شان کے منافی اور علم کی توہین ہے۔ جو لوگ ایسی غلطی کر بیٹھتے ہیں وہ سبق کا حق بھی ادا نہیں کر پاتے اور بسا اوقات ان کی بڑی بھد ہوتی ہے۔

تیاری کی اہمیت:

تیاری کے بغیر کبھی سبق کامیاب اور موثر ہو ہی نہیں سکتا۔ سبق خواہ آسان ہو یا مشکل اور درجہ خواہ اونچا ہو یا نیچا تیاری بہر حال ضروری ہے کیونکہ:

☆ سبق تیار کر لینے سے استاد کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔

☆ وہ طلبہ کے سامنے اپنی بات پورے وثوق، اعتماد اور سلیقے سے رکھتا ہے۔

☆ تدریس کا موزوں ترین طریقہ اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ طلبہ کو کما حقہ فائدہ پہنچتا ہے۔

☆ طلبہ کو بخوبی مطمئن کر سکتا ہے۔

بعض پرانے اور تجربہ کار اساتذہ اس زعم میں بغیر تیاری کے سبق پڑھانا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ سبق تو ہمارا پہلے کا پڑھایا ہوا ہے۔ اس کی تیاری کی اب کیا ضرورت ہے۔ لیکن یہ ان کی زبردست بھول ہے۔ تجربہ بلاشبہ کامیاب تدریس میں بڑا معاون ہوتا ہے لیکن تیاری سے بالکلیہ بے نیاز نہیں کر سکتا کیونکہ ہر سال درجے میں جو نئے طلبہ آتے ہیں، ان کی لیاقت سابقہ پچھلے برسوں کے طلبہ سے مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ بسا اوقات سبق کا پورا ڈھانچہ بدل دینا پڑتا ہے۔ سابقہ طریقہ تعلیم بھی کام نہیں دیتا۔ تمہید اور موزوں سوالات بالکل نئے سوچنے پڑتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس کی بھی توقع نہیں کی جا سکتی کہ معلم کو ہر وقت ضروری مواد مستحضر رہے گا۔ ہو سکتا ہے کہ سبق کا کچھ جزو ذہن سے محو ہو گیا ہو پھر تو درجے کے سامنے بڑی سبکی ہوگی۔ اس لیے تیاری بہر حال استاد کے لیے ناگزیر ہے۔

تیاری میں قابل لحاظ امور:

☆ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ کس درجے اور کس گھنٹے میں کیا سبق پڑھانا ہے۔ کتنے وقت میں سبق پورا کرنا ہے۔ جن بچوں کو پڑھانا ہے، ان کی عمر، صلاحیت اور دلچسپیاں کیا ہیں۔ اس سبق کے ضمن میں وہ پہلے سے کیا جانتے ہیں۔ جو کچھ پڑھانا ہے اس کے مواد پر خود استاد کو کہاں تک عبور ہے۔ جو کمی ہو وہ پوری کر لی جائے۔

☆ ضروری مواد یکجا کر لینے کے بعد اسے دو تین مناسب اجزاء میں تقسیم کر کے کل کا ایک عنوان اور اجزاء کے ذیلی عنوانات قائم کر لیے جائیں اور پھر ہر جز کی پیش کش کے طریقے سوچ لیے جائیں۔

☆ سبق کے لیے طلبہ کے ذہن کو آمادہ کرنے کے لیے مناسب تمہید سوچ لی جائے اور لیاقت سابقہ جانچنے کے لیے چند سوالات بنا لیے جائیں۔

☆ ہر جز کے بعد یا سبق کے آخر میں جو سوالات کرنے ہوں وہ بھی بنا لیے جائیں۔

☆ طلبہ کی مشکلات اور الجھنوں کا پیشگی اندازہ لگا لیا جائے اور ان کے ازالے کی تدابیر سوچ لی جائیں۔

☆ سبق کو بخوبی ذہن نشین کرانے کے لیے ضروری تعلیمی وتوضیحی سامان، نقشے چارٹس وغیرہ تیار یا فراہم کر لیے جائیں۔

☆ طلبہ کو نوٹ کرانے کے لیے یا تختہ سیاہ پر درج کرنے کے لیے سبق کا خلاصہ مرتب کر لیا جائے۔

☆ سبق سے متعلق ہوم ورک یا اور کوئی تفویض بھی پہلے سے سوچ رکھی جائے۔

☆ طلبہ سے جو سوالات حل کرانے ہوں وہ پہلے ہی سے حل کر لیے جائیں۔ ان کے سامنے سائنس کا جو تجربہ یا کسی مضمون سے متعلق جو عملی مظاہرہ کرنا ہو پیشگی اس کی مشق کر لی جائے تاکہ غلطی کا احتمال نہ رہے۔

☆ نئے اساتذہ کو چاہیے کہ اختصار سے سبق کے تحریری اشارات تیار کر لیا کریں۔ تجربہ کار اساتذہ کو بھی مختصر نوٹ ضرور لے لینا چاہیے۔

سبق کے اشارات:

☆ سبق کے اشارات حتی الامکان تحریری ہوں اور ان میں مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت معلومات ہونی چاہئیں۔

۱۔ مورخہ۔

۲۔ درجہ۔

۳۔ اوسط عمر۔

۴۔ گھنٹہ اور وقت۔

۵۔ مضمون۔

٦۔ عنوان اور ذیلی عنوانات۔

۷۔ مقصد عام۔

۸۔ ربط۔

۹۔ ضروری سامان کی فہرست ترتیب وار۔

۱۰۔ لیاقت سابقہ۔

۱۱۔ تمہید۔

۱۲۔ مواد کی پیش کش مع طریقہ تعلیم۔

۱۳۔ مشقی اعادی سوالات۔

۱۴۔ تختہ سیاہ کا خلاصہ۔

۱۵۔ تفویض۔

☆ ہر سبق کے دو مقاصد ہوتے ہیں۔ ۱۔ مقصد عام۔ ۲۔ مقصد خاص، اشارے میں دونوں درج ہونے چاہئیں۔

☆ بچوں کی لیاقت سابقہ ہی پر نئے سبق کا دارو مدار ہوتا ہے۔ اس لیے اختصار سے اس کا بھی تذکرہ ہونا چاہیے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نئے سبق کو آپ نے کس حد تک اس سے مربوط کر کے پڑھایا ہے۔

☆ تمہید مختصر لیکن زوردار ہو اور اس میں سابقہ معلومات جاننے اور سبق کے لیے آمادہ کرنے کے لیے کچھ سوالات درج ہوں۔

☆ جو مواد پیش کرنا ہے اختصار اور ترتیب سے وہ بھی درج کیا جائے اور اس کے پڑھانے کا طریقہ بھی۔

☆ وہ سوالات بھی ہر جز کے اختتام پر درج کر دیئے جائیں جو اس جز پر طلبہ سے پوچھنے ہیں۔

☆ آخر میں دو تین مشقی یا اعادی سوالات درج کیے جائیں جو پورے سبق پر حاوی ہوں۔

☆ دوران سبق تختہ سیاہ پر جو کچھ لکھنا یا بنانا ہے وہ بھی درج کر دیا جائے۔

☆ آخر میں گھر پر کرنے یا درجے ہی میں پورا کر لینے کے لیے جو تفویض پیش نظر ہو وہ بھی نوٹ کر دی جائے۔

سبق کی تیاری کے لیے ناگزیر شرائط:

مندرجہ بالا کام اس وقت بخوبی پا سکتا ہے جب:

☆ استاد کو جو سبق پڑھانا ہے اس کے مواد پر اسے عبور ہو یا جو فن سکھانا ہے اس میں اسے ضروری مہارت حاصل ہو۔

☆ طلبہ سے اس کا گہرا ربط ہو تا کہ وہ ان کی لیاقت سابقہ، ان کی فطری صلاحیتوں ان کی نفسی کیفیات اور ان کی انفرادی خصوصیات سے بخوبی واقف ہو۔

☆ مختلف تدریسی طریقوں کا اسے علم ہو۔

☆ تعلیم کے بنیادی مقصد اور ہر مضمون کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف ہو۔

☆ موزوں سوالات بنانے کا اسے سلیقہ آتا ہو۔

☆ توضیحی و تعلیمی سامان بنانے کی صلاحیت یا فراہم کرنے کے وسائل ہوں۔

☆ اسباق تیار کرنے کی ضرورت و افادیت کا احساس ہو اور اس کے لیے وقت نکالنے کی فکر ہو۔

اسباق کی قسمیں:

اسباق عموماً تین طرح کے ہوتے ہیں۔

۱۔ معلوماتی: جن کا مقصود بچوں کی معلومات میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً فقہ سیرت، تاریخ، جغرافیہ سائنس وغیرہ کے اسباق۔

۲۔ عملی یا مہارتی: جن کا مقصود کسی فن میں مہارت پیدا کرنا ہوتا ہے مثلاً آرٹ کرافٹ، سلائی

بنائی، خوشنویسی وغیرہ کے اسباق۔

۳۔ تنقیدی یا تقریظی: جن کا مقصود حسن وقبح اور بھلائی برائی کی پرکھ پیدا کرنا یا ذوق سلیم اور جذبات لطیف کو پروان چڑھانا ہوتا ہے۔ مثلاً اسلامیات، ادب، قرأت، نظم خوانی وغیرہ کے اسباق۔ ان اسباق کی بھی مزید دو نوعیتیں ہوتی ہیں: ۱۔ جدید۔ ۲۔ مشقی یا اعادی۔

۱۔ جدید سبق: وہ ہے جس کے ذریعے کوئی نیا اصول قاعدہ یا ضابطہ ذہن نشین کرایا گیا ہو مثلاً ریاضی یا قواعد کے اصول وضابطے یا کچھ نئی معلومات فراہم کی گئی ہو مثلاً تاریخ، جغرافیہ سائنس وغیرہ کے تحت نئی معلومات۔

۲۔ مشقی یا اعادی سبق: جس کا مقصود پہلے سے بتائے گئے کسی قاعدے یا ضابطے کی مشق کرانا یا سابقہ معلومات کا اعادہ کرانا ہوتا ہے۔

۱۔ معلوماتی اسباق پڑھانے کا طریقہ

معلوماتی اسباق کو بخوبی ذہن نشین کرانے کے لیے ہر سبق میں مندرجہ ذیل پانچ اقدام ضروری ہیں۔

۱۔ تمہید۔

۲۔ سبق کی پیش کش۔

۳۔ توضیح وتقابل۔

۴۔ تعمیم یا عام اصول اخذ کرنا۔

۵۔ استعمال یا مشق۔

۱۔ تمہید:

ہر سبق کے لیے ایک مناسب تمہید ضروری ہے۔ اس کا مقصد دراصل بچوں کے ذہن کو نئے سبق کے لیے آمادہ کرنا ہوتا ہے۔ تمہید بہت ہی مختصر لیکن جاندار ہونی چاہیے تاکہ وقت بھی زیادہ نہ

لگے اور نئی معلومات حاصل کرنے کے لیے بچے متجسس ہوں اور ان کا ذہن پورے طور پر آمادہ ہو جائے۔ موضوع سے متعلق مختصر بات چیت، کوئی چھوٹی سی کہانی، جاذب نظر تصویر یا ماڈل، سابقہ معلومات جانچنے اور پچھلے اسباق سے ربط قائم کرنے کے لیے چند موزوں سوالات اچھی تمہید بن سکتے ہیں۔

تمہید کے سوالات اتنے آسان ہوں کہ ہر بچہ بآسانی جواب دے سکے۔ خوش گوار فضا میں پوچھے جائیں تاکہ ہر ایک فکر کا اظہار نمایاں کر سکے۔ ایک دوسرے سے مربوط ہوں تاکہ خیالات میں تسلسل رہے۔ آخری سوال ایسا ہو کہ سبق کا مقصد و مدعا بچوں پر واضح ہو جائے اور ان کا ذہن نئی معلومات کی ضرورت محسوس کرنے لگے۔

۲۔ سبق کی پیش کش:

طلبہ کو نئے سبق کے لیے پورے طور پر تیار کر لینے کے بعد اصل سبق پیش کیا جائے۔ پورا سبق ایک ہی ساتھ نہیں بلکہ دو تین مناسب اجزاء میں تقسیم کر کے پیش کیا جائے۔ ترتیب سے ایک ایک جزء لیا جائے۔ بیچ بیچ میں اور ہر جزء کے اختتام پر چند سوالات کیے جائیں۔ ہر جزء کا آخری سوال ایسا ہو کہ اگلے جزء کے مواد کی طرف ذہن کو منتقل کرے۔ خلاصہ تختہ سیاہ پر نوٹ کرتے جائیں۔ آخر میں پورے سبق پر چند سوالات کر کے ان اجزاء کو باہم مربوط کر دیا جائے۔ اجزاء کی ترتیب ایسی ہو کہ پہلے آسان اور سادہ پھر بتدریج مشکل اور پیچیدہ معلومات سامنے آئیں۔ اس طرح پورا سبق بآسانی سمجھ میں آجائے گا۔

۳۔ توضیح وتقابل:

سبق کا جو جزء پیش کیا جائے اسے بخوبی واضح کرنے کے لیے بچوں کی لیاقت سابقہ سے اس کا ربط ملایا جائے۔ نئی معلومات سے ملتی جلتی یا اس کی ضد جو باتیں پہلے سے بچوں کے علم میں یا تجربے میں آچکی ہوں ان سے جدید کا موازنہ و مقابلہ کرایا جائے، مثالیں دی جائیں۔

وضاحت کے لیے تصاویر، نقشے اور چارٹ وغیرہ استعمال کیے جائیں یا تجربہ کر کے دکھلایا جائے اس طرح جدید معلومات بخوبی ذہن نشین ہو سکیں گی۔

۴۔ نتیجہ یا تخریج و تعمیم:

پورا سبق سلیقے سے پیش اور بخوبی واضح کر دینے کے بعد موزوں سوالات کے ذریعے وہ قاعدہ، ضابطہ، اصول یا نتیجہ اخذ کرانا چاہیے جس کے لیے سبق پڑھایا گیا ہے۔ مثلاً ریاضی کا کوئی قاعدہ، سائنس کا کوئی اصول وغیرہ۔ نتیجہ اخذ کرنے میں حسب ضرورت بچوں کی امداد کی جائے اور اگر وہ بالکل ناکام رہیں تو سبق پھر سے سمجھایا جائے نتیجہ تختہ سیاہ پر نوٹ کر کے طلبہ کو بھی نوٹ کرا دیا جائے۔

۵۔ استعمال یا مشق:

بچوں نے جو کچھ سیکھا ہے اس کا جائزہ لینے، اسے استعمال میں لانے اور اس کی مشق کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ اس کے لیے آخر میں زبانی چند سوالات کیے جائیں یا کوئی تحریری اور عملی کام دیا جائے، اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ بچوں نے کیا کچھ سیکھا اور استاد سبق میں کہاں تک کامیاب ہوا۔ نیز استعمال میں لانے کے بعد وہ چیز بچوں کو بخوبی یاد ہو جائے گی۔ مثلاً ریاضی کا کوئی قاعدہ سکھا دینے یا سائنس کا کوئی اصول سمجھا دینے کے بعد اس پر دو تین سوالات دیئے جائیں جو اس اصول یا قاعدہ کی مدد سے حل ہو سکیں۔ اگر بچے حل کر لے جاتے ہیں تو سبق کامیاب ہے۔ استعمال میں لانے یا مشق کرنے سے بچوں کو وہ قاعدہ بخوبی یاد ہو جائے گا۔

یہ ہیں پانچ اقدام جنہیں ملحوظ رکھ کر سبق پڑھانا مفید اور موثر ہوتا ہے ان کا خلاصہ ایک بار پھر دیکھ لیجیے۔

۱۔ مناسب تمہید کے ذریعہ طلبہ کو نئے سبق کے لیے آمادہ کرنا۔

۲۔ دلچسپ پیرائے میں جدید مواد کو پیش کرنا۔

۳۔ توضیح وتشریح کے ذریعے سبق کو واضح کرنا، نیز طلبہ کی سابقہ معلومات، تجربات ومشاہدات سے جدید مواد کا موازنہ ومقابلہ کر کے اور روزمرہ کی زندگی سے جدید کا ربط ملا کر سبق کو ان کے لیے قابل فہم بنانا۔

۴۔ پورے سبق کا نچوڑ بطور خلاصہ، عام اصول، کلیہ، قاعدہ یا ضابطہ طلبہ کے سامنے لانا۔

۵۔ طلبہ سے اس قاعدے کا انطباق کرا کے یا استعمال میں لانے کا موقع دے کر مطمئن ہونا۔

بلا شبہ نفسیات عقل اور تجربے کی روشنی میں یہ پانچ اقدام بہت ہی مفید اور موثر ثابت ہوتے ہیں لیکن ان پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس طریقے میں طلبہ کو خود کر کے سیکھنے کا بہت کم موقع ملتا ہے عام طور پر ان کی حیثیت مجہول سامع کی سی ہوتی ہے۔ اس لیے وہ سبق میں عملی دلچسپی کم لیتے ہیں اگر بعض معلوماتی اسباق (خصوصاً ریاضی، عام سائنس اور جغرافیہ وغیرہ) میں ان کے بجائے مندرجہ ذیل پانچ اقدام اختیار کیے جائیں تو زیادہ مفید اور موثر ثابت ہوں گے۔

۱۔ جدید سبق سے متعلق طلبہ کے سامنے کوئی حل طلب مسئلہ رکھ دینا کہ وہ تشویش اور الجھن میں پڑ جائیں اور اسے حل کرنے میں اپنا پورا زور لگا دیں۔

۲۔ اس کے حل کے لیے طلبہ سے تجاویز طلب کرنا۔

۳۔ مختلف تجاویز کو جانچنا پرکھنا اور بعض کو استعمال کر کے حل کرنے کی کوشش کرنا۔

۴۔ مناسب رہنمائی کر کے صحیح حل پر پہنچانا۔

۵۔ اس حل کی تصدیق کے لیے مزید تجربہ ومشاہدہ کرانا۔

اس طرح بچے پوری عملی دلچسپی لیں گے اور ان کی معلومات زیادہ مستحکم ہوں گی۔ نیز ان غور وفکر استدلال اور قوت فیصلہ کی نشوونما کا موقع ملے گا۔ ریاضی کا تو ہر سوال حل طلب مسئلہ ہی ہوتا ہے۔ جنرل سائنس اور جغرافیہ میں بھی اس طریقے سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جا سکتا ہے۔

۲۔ عملی یا مہارتی اسباق پڑھانے کا طریقہ

آرٹ کرافٹ، خوش نویسی یا دوسرے مہارتی اسباق میں مندرجہ ذیل امور ملحوظ رہیں۔

☆ طلبہ کو اس فن کے سیکھنے کی حقیقی ضرورت محسوس کرادی جائے تاکہ سیکھنے کی زوردار تحریک ہو۔

☆ ان کو جو کچھ سکھانا ہو وہ نہ تو اتنا مشکل ہو کہ بچوں میں مایوسی اور بددلی پیدا ہو اور نہ اتنا طویل ہو کہ وہ اکتا جائیں۔

☆ بچوں کے کام میں صحت وصفائی کے بس اتنے معیار کی توقع کی جائے جو وہ معمولی جدوجہد سے حاصل کر سکتے ہیں۔ واضح رہے بہت دنوں کی لگاتار محنت اور مشق کے بعد ہی فنون میں مہارت پیدا ہوتی ہے اور بچوں سے یوں بھی باریک کام کی توقع قبل از وقت ہے۔

مہارتی اسباق کے اقدام یہ ہیں:

۱۔ تمہید یا تحریک:

بچوں کے سامنے کوئی نمونہ پیش کر کے اس کی نقل پر آمادہ کیا جائے۔ انہیں ایسی صورت حال سے دوچار کر دیا جائے کہ وہ کسی خاص سلسلے میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگیں۔ مثلاً عید کے موقع پر اعزہ کو بھیجنے کے لیے اپنے ہاتھ سے عید کارڈ اور لفافہ بنانے کی ضرورت، اپنی کتابوں کی جلد بنانے اور اسے آراستہ کرنے کی ضرورت وغیرہ۔

۲۔ پیش کش:

پہلے سے تیار کسی نمونے کا اچھی طرح مشاہدہ کرایا جائے اور اس کے ایک ایک جز کی سائز وشکل وغیرہ بخوبی ذہن نشین کرادی جائے یا اس کی مفصل ڈرائنگ تختہ سیاہ کی مدد سے سمجھا دی جائے اور ضرورت ہو تو پورا نمونہ بچوں کے سامنے تیار کر کے دکھایا جائے۔ نمونے کو پورے درجے میں گشت کرادیا جائے تاکہ ہر بچہ اپنے ہاتھ میں لے کر قریب سے دیکھ لے۔

۳۔ قاعدے اور اصول:

اختصار سے وہ قاعدے اور اصول وغیرہ سمجھا دیئے جائیں جس سے نمونہ تیار کرنے میں مدد ملے گی۔

۴۔ عمل:

ضروری سامان فراہم کر کے طلبہ کو کام پر لگایا جائے۔ بچے جب عملی کام میں مصروف ہوں تو استاد کو چاہیے کہ وہ پورے درجے میں ٹہل گھوم کر دیکھتا رہے کہ:

☆ طلبہ کی نشست ٹھیک ہے۔ آنکھ اور کاپی وغیرہ کے درمیان کا فیصلہ مناسب ہے۔ کمر سیدھی ہے۔

☆ قلم برش یا دوسرے آلات کی گرفت صحیح ہے۔

☆ سامان مناسب طریقے سے استعمال کیا جا رہا ہے۔

☆ کام صحت وصفائی کے ساتھ انجام پا رہا ہے۔

☆ کس کس کو انفرادی امداد کی ضرورت ہے۔

اور جہاں جس طرح کی امداد کی ضرورت ہو بروقت کر دی جائے۔ واضح رہے کہ ان امور کی انفرادی امداد جتنی توجہ سے ہوگی طلبہ کو مہارت حاصل کرنے میں اتنی ہی آسانی ہوگی، کام صحت وصفائی سے ہوگا اور سامان ضائع ہونے سے محفوظ رہے گا۔ نگرانی کی طرف سے غفلت طرح طرح کے نقصانات کی موجب ہوتی ہے۔

۵۔ تفویض:

سیکھے ہوئے ہنر کو کام میں لانے کے لیے کوئی ایسا دلچسپ کام تفویض کیا جائے جس سے مزید مشق ہو مثلاً: گلدان یا میز کی بنانے کا طریقہ سکھانے کے بعد درجے یا کمرے کو آراستہ کرنے کے لیے کچھ بنانے کو دینا، خوشنویسی سکھانے کے بعد کوئی کتبہ لکھ کر لگانے کے لیے کہنا۔

۳۔ تنقیدی یا تقریظی اسباق

ان میں ادبی شہ پاروں، اخلاقی کہانیوں، موثر نظموں اور سبق آموز واقعات وغیرہ پر مشتمل وہ اسباق آتے ہیں جو بچوں کی جذباتی واخلاقی تربیت کرنے ان کے اندر ذوق سلیم اور جذبات لطیف پیدا کرنے اور ان کے تخیلات وتصورات اور نصب العین کو اعلیٰ بنانے میں معاون ہوتے ہیں۔ اس طرح کے اسباق کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ:

☆ معلم خود ایک دردمند، حساس اور خیر پسند دل رکھتا ہو۔

☆ بُرے بھلے میں امتیاز کرنا جانتا ہو۔

☆ دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

☆ بچوں کی عمر، ذوق اور معیار کے مطابق مواد فراہم کر سکے۔

اس طرح کے اسباق پڑھانے میں مندرجہ ذیل پانچ اقدام اختیار کرنے ہوں گے۔

۱۔ موزوں فضا: مناسب تمہید کے ذریعے سبق کے لیے موزوں فضا تیار کی جائے۔ فضا جتنی زیادہ پُرسکون ہوگی اور طلبہ انتشار ذہنی سے جس قدر محفوظ ہوں گے اس طرح کے اسباق سے اتنا ہی زیادہ متاثر ہوں گے۔

۲۔ مواد کی پیش کش: سبق اگر بڑا ہو تو دو تین اجزاء میں پیش کر کے ورنہ پورا ایک ساتھ پیش کر کے طلبہ پر مطلوبہ کیفیت طاری کرنے کی کوشش کی جائے۔

۳۔ موازنہ ومقابلہ اور توضیح وتشریح کے ذریعے طلبہ کے لیے اسے قابل فہم بنایا جائے۔

۴۔ سوالات قائم کر کے طلبہ کو خود سوچنے اور غور وفکر کرنے کا موقع دیا جائے۔

مناسب سوالات کے ذریعے خیالات وجذبات کا اظہار کرانے اور تنقید تقریظ یا تبصرہ کرا کے صحیح نتیجے پر پہنچنے میں امداد کی جائے۔

۴۔ اعادی یا مشقی اسباق پڑھانے کا طریقہ

اس طرح کے اسباق میں صرف تین اقدام ہوتے ہیں۔

تمہید: سکھائے ہوئے قاعدے وضابطے سے متعلق دو تین ایسے سوالات کیے جائیں جن کے جوابات بچے زبانی دے سکیں۔

مشق: اعادے یا مشق کے لیے دو تین ایسے سوالات دیئے جائیں جو پڑھے ہوئے قاعدوں کی مدد سے حل کر سکتے ہوں لیکن جن کو حل کرنے کے لیے غور وفکر اور محنت درکار ہو۔ بچے جب سوالات حل کرنے لگیں تو معلم کو چاہیے کہ وہ درجے میں ٹہل گھوم کر نگرانی کرے اور حسب ضرورت امداد کرے، کمزور طلبہ پر خصوصی توجہ دے اور ذہین طلبہ اگر جلد ہی سوالات حل کرلیں تو انہیں مزید کام دے دیا جائے تاکہ وہ مصروف رہیں اور دوسروں کے کاموں میں مخل نہ ہوں۔ اگر کئی بچے حل کرنے میں ناکام ہوں تو بلیک بورڈ پر خود حل کر کے یا ان طلبہ سے حل کرا کے ذہن نشین کرایا جائے جن کا حل صحیح ہو۔

۳۔ تفویض: آخر میں پڑھے ہوئے قاعدوں اور ضابطوں کے متعلق بعض ایسے کام دیے جائیں جو معمولی توجہ سے بچے اپنے طور پر کر سکیں یہ کام درجے میں بھی کرایا جا سکتا ہے اور گھر سے کر کے لانے کے لیے بھی دیا جا سکتا ہے۔

..........☆☆☆..........

باب ۳۶:

مختلف مضامین کے تدریسی طریقے[1]

تدریس اور طریقۂ تدریس پر اصولی بحثوں کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اہم مضامین کے تدریسی طریقوں پر اختصار سے کچھ ضروری معلومات فراہم کر دی جائیں۔

ا۔ اسلامیات

یہ مضمون اسلامی نظام تعلیم کی جان ہے۔ تمام مضامین و مشاغل کے لیے روح رواں کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے پورے ادارے کو مجموعی حیثیت سے اور ہر معلم کو اپنے طور پر تمام نصابی و بیرون نصاب مصروفیات میں اس مضمون کو مرکزی مقام دینا چاہیے اور ادارے کو اپنے معمولات نیز اساتذہ کو اپنے قول و عمل اور سیرت و کردار سے اس کی سچی شہادت پیش کرنی چاہیے۔ درس گاہ، اقامت گاہ اور قریبی ماحول میں ایسی فضا بنانے اور اسے قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے جس سے اسلامی اقدار کو استقلال اور بالاتری حاصل ہو اور طلبہ کو شعوری اور غیر شعوری تقلید کے لیے اچھے نمونے مل سکیں۔ پسندیدہ عادات و اطوار ڈلوانے اور ناپسندیدہ کو ترک کرانے کا پورا اہتمام ہونا چاہیے اور اس بات کی فکر کرنی چاہیے کہ ماحول میں معروف کو فروغ ہو اور منکرات کی بیخ کنی۔

ابتدائی درجات میں اسلامیات مندرجہ ذیل مضامین و مشاغل پر مشتمل ہو گی۔

- قرآن حکیم ناظرہ، صحیح مخارج کے ساتھ پورا کلام پاک پڑھنا منتخب سورتیں اور رکوع حفظ کرنا۔
- اختصار سے سیرت النبی ﷺ، انبیائے کرام و صلحائے امتؒ اور مشاہیر ملت کے اہم واقعات نیز تاریخی اخلاقی کہانیاں، عقائد و عبادات کے متعلق ضروری معلومات۔

[1] اس عنوان پر علیحدہ سے کتاب لکھنے کا ارادہ ہے یہاں اختصار سے کچھ ضروری ہدایات دی جاتی ہیں۔

☆ اخلاقی ومعاشرتی تربیت۔

☆ وضو،نماز،روزے وغیرہ کی عملی تربیت۔

ان کی تعلیم میں یہ مقصد پیش نظر ہوگا کہ بچوں کے قول وفعل،علم وعمل اور عقائد وافکار اسلامی تعلیمات کے مطابق ہوں۔ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے،اس کی مرضی کے مطابق انفرادی،عائلی اور اجتماعی زندگی گزارنے کا سلیقہ آئے اور اس ضمن کی ذمہ داریوں کو انجام دینے کی عملی تربیت ہو۔علم پر خود عمل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کی تحریک ہو۔

طریق تعلیم سے متعلق ہدایات:

☆ عام قرآنی قاعدوں سے ابتدا نہ کی جائے کیونکہ یہ قاعدے بچوں کے لیے عموماً خشک ہوتے ہیں۔حروف تہجی کی شناخت،جوڑ پیوند،حرفوں کی ملاوٹ اور نسخ میں لکھی ہوئی آسان اردو عبارتیں پڑھانے کے جدید طریقے اختیار کیے جائیں۔الفاظ اور عبارتیں اردو کی ہوں تاکہ بچوں کے لیے قابل فہم رہیں۔

☆ تہجی چارٹ،منی کتاب،قاعدہ نسخ سے ابتدا کرائی جائے ان میں دی ہوئی ہدایات کا لحاظ رکھا جائے اور تختہ سیاہ کا استعمال ہو تو بچے نہایت آسانی اور دلچسپی سے اردو بھی پڑھنے لگتے ہیں اور خط نسخ سے بھی بخوبی واقف ہو جاتے ہیں اور ابتداء ہی سے اردو کے لیے علیحدہ اور قرآن مجید کے لیے علیحدہ دو قاعدوں کا بار نہیں پڑتا۔

☆ حروف اور الفاظ کی ادائیگی میں مخارج کی صحت کا ابتداء ہی سے پورا لحاظ رکھا جائے۔

☆ سال دوم میں یسرنا القرآن یا اس طرز پر لکھے ہوئے کسی اور دلچسپ قاعدے کی مدد سے وہ اہم قواعد بھی تختہ سیاہ کے ذریعے ذہن نشین کرا دیئے جائیں جو روانی سے ناظرہ پڑھنے کے لیے ضروری ہیں۔تمام قاعدے اسی مرحلے پر بتا دینے ضروری نہیں۔اب پارہ عم شروع کرایا جائے اور مخصوص قواعد،رسم الخط اور رموز واوقاف وغیرہ رواں پڑھاتے وقت سب

ضرورت و موقع بتائے جائیں۔

☆ معلم کو صحیح مخارج اور والہانہ انداز سے پڑھنے کا خود نمونہ پیش کرنا چاہیے اور بچوں سے بھی اجتماعی و انفرادی طور پر اسی طرح ادا کرانا چاہیے۔ ہجے پر زیادہ زور دینے سے روانی جاتی رہتی ہے اس لیے جہاں بچے غلطی کریں صرف وہیں روک کر ہجے کرائی جائے۔

☆ قرآن مجید کے احترام کے ضمن میں بھی ابتداء ہی سے توجہ دلائی جائے اور خود قابل تقلید نمونہ پیش کیا جائے۔

☆ قرآن مجید کی تعلیم کے دوران درجے کی فضا نہایت خوشگوار رکھی جائے، شفقت و محبت کا مظاہرہ کیا جائے۔ سختی، ڈانٹ، پھٹکار وغیرہ سے قطعی گریز کیا جائے تاکہ اس کتاب کے ساتھ خوشگوار جذبات وابستہ ہوں۔

☆ دینی معلومات کے ضمن میں ایک تدریج سے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا واضح تصور دلایا جائے، اس کے احسانات بتائے جائیں۔ اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا طریقہ سکھایا جائے اور اس ضمن میں آنحضرت ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین اور صلحائے امت کے اسوے پیش کیے جائیں۔

☆ عبادات و معاملات یا اخلاق و معاشرت سے متعلق زبانی تقریر کرنے یا مجرد اصول سمجھانے کے بجائے انہیں عملاً برتنے کے طریقے سکھائے جائیں۔ تاریخی اخلاقی کہانیوں کا سہارا لیا جائے۔ نیز عمل کے کافی مواقع فراہم کیے جائیں۔ جسم و لباس پاک کرنے، غسل یا وضو کرنے، نماز پڑھنے کا مکمل طریقہ عملاً سکھایا جائے۔ ان کے اجزاء کو فرائض واجبات، سنن و مستحبات وغیرہ میں تقسیم کر کے ان کی طویل فہرست رٹنے پر بچوں کو مجبور نہ کیا جائے ورنہ طلبہ پر قبل از وقت غیر معمولی بار بھی پڑے گا اور بددلی بھی پیدا ہوگی۔ یہ طویل فہرستیں عموماً بچوں کو اس مضمون سے متنفر کر دیتی ہیں۔ مکمل طریقہ عملاً بتانے سے وہ بآسانی اور بخوشی سیکھ

لیں گے اور ٹھیک ٹھیک انجام دیں گے۔ نماز کے اذکار و دعائیں وغیرہ یاد کرانے کے لیے ابتدائی دو تین جماعتوں میں طلبہ سے پوری نماز بلند آواز سے باجماعت کسی ایسے بچے کی امامت میں ادا کرائی جایا کرے جسے نسبتاً زیادہ یاد ہو اور معلم تعدیل ارکان اور مخارج کی صحت کا لحاظ رکھے۔

☆ درس گاہ میں سنجیدہ دینی فضا بنانے کے لیے مندرجہ ذیل ذرائع سے کام لیا جائے۔

۱۔ مختلف مواقع کے اسلامی آداب سمجھا کر ان کی پابندی کرائی جائے۔

۲۔ نماز اور مسجد کو تربیت کا ذریعہ بنایا جائے۔ سنجیدگی کا ماحول، اجتماعی روح، پاکیزگی اور خضوع وخشوع کی کیفیت پیدا کرنے میں ان سے بڑی مدد ملے گی۔

۳۔ اجتماعی حاضری میں بلند آواز سے ایسی حمد ونعت کا اہتمام کیا جائے جن کی بحر مترنم، الفاظ آسان اور اشعار قابل فہم ہوں۔ ایک ہی حمد یا نعت مسلسل نہ پڑھی جائے۔

۴۔ اجتماعات و مذہبی تقریبات منانے کا اہتمام کیا جائے۔ ان کے ذریعے دینی معلومات میں اضافہ اور دین سے جذباتی لگاؤ پیدا کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔

۵۔ آیات و احادیث، زریں اقوال، دینی پوسٹرس وغیرہ سلیقے سے جگہ جگہ آویزاں ہوں جن کی زبان آسان و بلیغ، خط جلی اور خوبصورت انداز دلکش اور جاذب نظر ہو۔

۶۔ مذاکرات کی مجالس منعقد کی جائیں یا توسیعی تقاریر کا بندوبست کیا جائے۔

۷۔ دینی کتب، اخبارات ورسائل کا بندوبست کیا جائے۔

۸۔ دینی وتبلیغی جلسوں میں شرکت کے مواقع دیئے جائیں۔

۹۔ رفاہی کاموں اور خدمت خلق کے پروگرام بنائے جائیں اور ان پر عمل کرایا جائے۔

۱۰۔ معروف کے قیام اور منکرات کے ازالے کے لیے ہفتے منوائے جائیں۔

۲۔ مادری زبان (اردو)

مادری زبان ہونے کی وجہ سے اردو کو نصاب میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اپنی بات سمجھانے اور دوسروں کی سمجھنے کا فطری اور موثر ترین ذریعہ ہے۔ ہمارا بیشتر علمی ادبی سرمایہ اور دینی لٹریچر اسی زبان میں ہے۔ دوسری زبانوں کے مقابلے میں قرآن وسنت سے استفادے میں بھی یہی زبان زیادہ معاون ہوتی ہے۔ کیونکہ رسم الخط، متعدد الفاظ وتراکیب، محاورات وضرب الامثال، تلمیحات وتشبیہات، خیالات وجذبات، شعائر وآداب وغیرہ سے اسی کے ذریعے طلبہ بہت حد تک مانوس ہو جاتے ہیں۔ اپنی مادری زبان اور اس کے ادب سے طلبہ کو طبعاً جو والہانہ لگاؤ ہوتا ہے وہ کسی اور زبان سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ مادری زبان ہونے کی وجہ سے تمام مضامین کے لیے یہی ذریعہ تعلیم بھی ہوتی ہے چنانچہ اسی میں استعداد پر دوسرے تمام مضامین کی ترقی کا انحصار ہوتا ہے۔

اس کی تدریس میں مندرجہ ذیل مقاصد پیش نظر ہونے چاہئیں۔

☆ طلبہ کو زبانی وتحریری اظہار خیالات وجذبات پر قدرت حاصل ہو۔ دوسروں کے خیالات وجذبات خواہ وہ زبانی ہوں یا تحریری طلبہ بآسانی سمجھ سکیں۔ اور ان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہو۔

☆ مادری زبان کی تعلیم میں بولنے، پڑھنے اور لکھنے تینوں میں ہم آہنگی کے ساتھ لیاقت پیدا کرنا شامل ہے۔ زبان کی تدریس نامکمل ہوگی اگر ان میں سے کسی ایک کی طرف سے بھی لاپروائی برتی گئی یا کسی ایک پہلو کو بھی نظر انداز کیا گیا۔

بولنا سکھانے کا طریقہ:

زبان کا سب سے اہم جز یہی ہے۔ اظہار خیالات وجذبات کے لیے ہر فرد کو سب سے زیادہ اسی ذریعے سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس لیے اس کے سکھانے کی طرف بہت زیادہ توجہ دینی

چاہیے۔ ہمارے مدارس میں عموماً اس طرف سے بہت غفلت برتی جاتی ہے۔ صرف پڑھنا لکھنا سکھا دینے ہی کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اسی پہلو پر توجہ دینی چاہیے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل امور پیش نظر رہیں۔

☆ بچے کو اتنا مانوس کر لیا جائے کہ وہ بے جھجک اظہار خیال کر سکے۔

☆ اس کے والدین، بھائی بہن، محلہ پڑوس، گھریلو زندگی، اس کے پسندیدہ کھیل کھلونوں، غذا، لباس، گھریلو اور پالتو جانوروں وغیرہ کے متعلق بات چیت کی جائے تو وہ بہت جلد مانوس ہو جاتا ہے لیکن ان کے ضمن میں بہت زیادہ تفصیلات میں نہ جائیں بلکہ صرف ان پہلوؤں پر بات چیت کی جائے جن سے بچے کو لگاؤ اور دلچسپی ہو۔

☆ اپنی جگہ کھڑے ہو کر، درجے کے سامنے آ کر، مجمع کے سامنے کھڑے ہو کر کچھ کہنے پر اکسایا جائے۔ مثلاً کسی سوال کا مختصر جواب دینا، سوال کرنا، کوئی اعلان کرنا یا پیغام پہنچانا، نظم، قرأت، رٹے ہوئے مربوط جملے سنانا۔ جانوروں کی بولیاں اور حرکات کی نقل وغیرہ جھینپ اور جھجک دور کرنے میں معاون ہوتی ہے۔

☆ مختلف نصابی و غیر نصابی مصروفیات و مشاغل خصوصاً آرٹ کرافٹ، وضو، نماز، کہانیاں اور کھیل وغیرہ بات چیت کے کافی مواقع فراہم کرتے ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔

☆ بچوں سے گفتگو میں اس بات کا لحاظ رہے کہ بات چیت زیادہ سے زیادہ غیر رسمی اور فطری ہو، انداز دل کش، شائستہ اور خوشگوار ہو، واضح اور صحت کے ساتھ بولنے، پورا جواب دینے اور مناسب طرز ادا اختیار کرنے کی طرف توجہ دلائی جائے۔

☆ دوران گفتگو بچوں کی غلطیوں کی اصلاح کی جائے لیکن احساس کمتری نہ پیدا ہونے دیا جائے۔ بہتر ہو کہ غلط لفظ جملے یا طرز ادا کی اصلاح کے لیے خود صحت کے ساتھ ادا کر کے کہلوایا جائے۔

☆ پھر گرد و پیش کی اشیاء، حیوانات، روزمرہ کے واقعات و مشاہدات وغیرہ پر بتدریج مربوط

گفتگو کی جائے۔اس سے انشاء میں بھی مدد ملے گی۔

☆ آخر میں کہانیاں، مکالمے، لطیفے، مختصر مربوط جملے بطور تقریر یٹ کرا اجتماعات میں پیش کرنے کی مشق کرائی جائے۔انداز کتاب پڑھنے کا نہیں تقریر کا ہو۔

پڑھنا سکھانے کے طریقے:

طریق تہجی کے بجائے جو آج عموماً رائج ہے مخلوط طریقے سے پڑھنا شروع کرایا جائے۔ تفصیلی ہدایات کے لیے منی کتاب اور قاعدہ نسخ دیکھیں اوران سے مدد لیں۔نظم ونثر پڑھانے کے لیے ہماری کتاب کے سیٹ میں دی ہوئی ہدایات اور مشقوں سے فائدہ اٹھائیں۔

☆ ابتدائی درجات میں قواعد علیحدہ سے نہ پڑھائے جائیں بلکہ بولنے یا لکھنے میں جو غلطیاں ہوں، ان کی اصلاح کے ضمن میں صحیح زبان بولنے یا لکھنے کے جس قاعدے کی خلاف ورزی ہوئی ہو اس کی نشاندہی کریں۔

لکھنا سکھانے کا طریقہ:

☆ ابتدا ڈرائنگ سے کرائی جائے۔سادہ لکیروں، چوکور، تکونی گول شکلوں میں جزوی تبدیلی کر کے تصاویر اور دلچسپ رنگین مشغلے کے ذریعے گرفت، اعصاب پر قدرت اور آنکھ، دماغ، ہاتھ سے بیک وقت کام لینے کی مشق کرائیں۔ یہ کام رنگین بتیوں سے سلیٹ پر یا رنگین چاک سے تختہ سیاہ اور کالی تختیوں پر شروع کرایا جائے۔

☆ پھر رفتہ رفتہ حروف اور الفاظ کو ڈرائنگ کی طرف لائیں، جتنا پڑھائیں ابتدا میں اس کی نقل بھی کرائیں۔اس طرح ہجے اور املا میں بھی مدد ملے گی اور سبق یاد بھی ہو جائے گا۔ لکھتے وقت قلم کی گرفت اور صحیح طرز نشست کا پورا خیال رکھیں۔پھر تختی پر سیٹھے کے قلم سے مشق کرائیں۔املا صرف ان حصوں کا ہو جن کی وہ کافی مشق کر چکے ہوں تاکہ غلطیاں کم سے کم ہوں۔ابتدا میں صرف صاف اور واضح لکھنے پر زور دیں۔بعد میں صحیح اور خوشخط لکھنے پر بسم

اللہ کہہ کر شروع کرنے، مناسب حاشیہ چھوڑنے، ڈیش لگانے، صاف ستھرا لکھنے وغیرہ کا لحاظ رکھوائیں۔ انگلیاں سیاہی سے بھرنے، یا ادھر ادھر سیاہی چھڑکنے، دیواروں یا کاپیوں، کتابوں پر بلاضرورت لکھنے کی ابتدا سے روک تھام کی جائے۔

طریق تعلیم انشا:

☆ متعلقہ عنوان پر تحریر سے قبل زبانی اظہار خیال اور بحث مباحثہ کا کافی موقع دیا جائے۔ عنوان کے انتخاب میں بچوں کی دلچسپی کا خیال رکھا جائے۔

☆ ابتدا میں صرف ان عنوانات پر انشاء کا کام کرایا جائے جن سے متعلق تجربات و مشاہدات کے کافی مواقع ملے ہوں تاکہ واضح تصورات قائم ہو چکے ہوں۔

☆ انشاء پردازی کے مثالی نمونے بھی دکھائے جائیں۔

☆ انشاء کا کام مناسب مقدار اور مناسب وقفے سے دیا جائے۔

☆ عبارت میں ربط اور اظہار خیال میں نظم و ترتیب کا لحاظ رکھوایا جائے۔

☆ مختصر اور عنوان سے متعلق باتیں لکھنے کی طرف توجہ دلائی جائے۔

☆ ابتدائی درجات میں خالی جگہیں پر کرنا، الفاظ کو استعمال کر کے جملے بنانا موزوں الفاظ کے انتخاب وغیرہ کی مشقیں ہوں۔ پھر دیئے ہوئے عنوانات پر چند مربوط جملے لکھنا سکھائیں اور رفتہ رفتہ مربوط عبارتیں، طویل انشاء پردازی کی بچوں سے توقع نہ رکھی جائے۔

☆ تحریری کام کی بروقت اصلاح کی جائے لیکن تمام غلطیوں کی ایک ساتھ اصلاح نہ کی جائے بلکہ بتدریج غلطیاں درست کرائی جائیں۔ بھونڈی غلطیاں پہلے لی جائیں اور معمولی بعد میں۔

☆ غلطیاں زیادہ ہوں تو دوبارہ لکھوایا جائے۔ کمیت سے زیادہ کیفیت پر زور دیا جائے۔

☆ اچھے انشاء پر نمبر کے ساتھ موزوں ریمارک بھی دیئے جائیں۔ ہر انشاء پر کچھ ضروری ہدایات دی جائیں۔

خطوط نویسی:

خطوط نویسی کی بھی مشق کرائی جائے۔طلبہ کو ہدایت کیجیے کہ بسم اللہ سے ابتداء کریں اور اوپر باسمہ سبحانہ لکھ دیا کریں۔اوپر دائیں طرف مختصر پتہ، بائیں طرف تاریخ ڈالیں۔مختصر القاب سے مخاطب کریں۔القاب کے ساتھ سلام مسنون یا السلام علیکم لکھیں، نئے پیرے سے مدعا لکھیں۔ خاتمہ پر مکتوب الیہ سے اپنا تعلق ظاہر کرنے والے الفاظ کے ساتھ اپنا نام لکھ دیا کریں۔غصہ کی حالت میں خط نہ لکھیں۔خطوط کے جواب ضرور دیں۔خط مختصر لکھا کریں۔ہر خط پر اپنا پتہ ضرور لکھ دیا کریں۔مصیبت میں ہمدردی اور خوشی میں مبارکباد کا خط لکھیں۔بغیر اجازت دوسروں کے خط نہ پڑھیں۔پتہ خوشخط لکھا کریں، روانہ کرنے سے پہلے دوبارہ پڑھ لیں۔غیر متعلق آدمیوں سے جواب طلب باتوں کے لیے جوابی کارڈ یا ٹکٹ بھیج دیا کریں۔ڈاک میں ڈالنے کے لیے کوئی خط دے تو ضرور ڈال دیا کریں۔

۳۔ ریاضی

ہماری روزانہ زندگی میں ریاضی کی بہت اہمیت ہے۔کوئی فرد خواہ کسی پیشے سے تعلق رکھتا ہو، ریاضی کے بغیر اس کا کام نہیں چل سکتا۔سودا سلف، عشر وزکوۃ، لین دین، وراثت وفرائض سب میں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔اسلامیات اور مادری زبان کے بعد نصاب کا سب سے اہم مضمون یہی ہے۔دوسرے مضامین کی کمزوریاں تو معمولی توجہ سے بعد میں بھی رفع ہو سکتی ہیں لیکن پڑھنے لکھنے یا حساب میں اگر بعض بنیادی خامیاں رہ جائیں تو ان کی تلافی مشکل ہے بلکہ ان کی موجودگی میں آگے بڑھنا بھی محال ہو جاتا ہے۔مثلاً گنتیوں کے لکھنے پڑھنے پر اگر قدرت نہ ہو تو جوڑنا گھٹانا نہیں سکھایا جا سکتا۔چاروں مفرد قاعدوں پر بخوبی عبور نہ ہو تو بعد کے قاعدے ہرگز نہیں سکھائے جا سکتے۔اس لیے ابتدا ہی سے اس کی باقاعدہ تدریس اور بنیاد مضبوط کرنے کی فکر ہونی چاہیے۔

قابل لحاظ امور:

☆ ابتدائی درجات میں ریاضی کی تدریس کا مقصد دراصل روزمرہ کی زندگی اور مختلف مضامین ومشاغل میں پیش آنے والے ریاضی سے متعلق مسائل کو سمجھنے اور صحت وسرعت کے ساتھ انہیں حل کر لینے کی طلبہ میں لیاقت پیدا کرانا ہے۔ اس لیے اعداد وشمار اور مسائل وغیرہ بچوں کی روزمرہ زندگی سے متعلق ومربوط ہی ہونے چاہئیں۔

☆ بچوں کو ایسی صورت حال سے دوچار کرنے کی کوشش کریں کہ ریاضی کا جو قاعدہ یا ضابطہ انہیں سکھانے جا رہے ہیں، اس کی افادیت وضرورت خود بچے بھی بخوبی محسوس کرنے لگیں۔ اس سے دلچسپی بھی پیدا ہوگی اور وہ پوری توجہ سے اسے سمجھنے اور یاد رکھنے کی کوشش کریں گے۔

☆ اعداد کا تصور دلانے یا گنتی جوڑ گھٹاؤ وغیرہ سکھانے کے لیے مقرون سے مجرد کی طرف چلیں۔ یعنی بال فریم، گولیوں، املی کے بیجوں، انگلیوں، استعمال کی چیزوں، کھلونوں وغیرہ کی مدد سے سمجھائیں پھر تنہا اعداد کے ذریعے مشق کرائیں۔

☆ نئے نئے قاعدے ضابطے سکھانے میں جلد بازی سے کام نہ لیں جب تک ایک قاعدے پر بخوبی عبور نہ ہو، دوسرا ہرگز نہ شروع کرائیں۔

☆ ہر قاعدے کی بار بار مشق کرائیں، اعادے ہی سے صحت وسرعت کے ساتھ سوالات حل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ ریاضی بہت ریاض چاہتی ہے بغیر کافی مشق کے ریاضی نہیں آتی البتہ بیزاری اور اکتاہٹ سے محفوظ رکھنے کے لیے تجسس، تحریک اور آمادگی کا پورا لحاظ رکھیں۔ ایک نشست میں اعادے کے لیے بہت مختصر وقت لیا کریں۔

☆ صحت وصفائی کے ساتھ اعداد لکھنے پر شروع ہی سے توجہ دیں۔ دو یا زائد ہندسوں کے اعداد میں ہر ہندسے کی مقامی قیمت کا تصور بخوبی واضح رہے۔ مثلاً ستائیس میں ۲ دہائیاں اور

سات اکائیاں ہیں۔ لکھنے میں بھی دو یا زائد ہندسوں کے اعداد بائیں سے دائیں لکھائیں مثلاً ۲۷ لکھنا ہے تو پہلے دو پھر سات لکھنے کی عادت ڈلوائیں۔

- ابتدائی درجات میں متعدد مثالیں دے کر قاعدے نکلوائیں۔ قاعدہ بخوبی ذہن نشین ہونے کے بعد بھی مشق کے کافی مواقع دیں۔
- رفتہ رفتہ اتنی مشق کرائیں کہ جوڑنے، گھٹانے یا پہاڑے پڑھنے میں بچے ایک مرتبہ میں مطلوبہ جواب دے سکیں۔ انہیں پورا نہ گننا پڑے۔ مثلاً سات اور پانچ بارہ، آٹھ ستے چھپن وغیرہ نہ کہ انگلیوں کی مدد سے آٹھ نو دس گیارہ بارہ، آٹھ اکن آٹھ سے آٹھ ستے تک گننا۔
- ضربی پہاڑے دو گرو غیرہ یاد کرانے سے پہلے یہ ضرور سمجھا دیا کریں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔
- مشقوں میں اتنے بڑے اعداد ہرگز نہ بولیں، زندگی میں جن کی شاذ و نادر ہی ضرورت پیش آتی ہے یا چھوٹی عمر میں جن کا تصور بھی ناممکن ہے جیسا کہ عموماً رائج رہا ہے کہ ابتدائی درجات میں مہاسنکھ تک کی مشقیں ہوتی تھیں۔
- ایک ہی حقیقت کو متعدد طریقوں سے ذہن نشین کرائیں۔ مثلاً تین دو پانچ۔ ۵ سے ۳ بقدر ۲ کم ہے، یا تین سے پانچ بقدر دو زیادہ ہے یا ۵×۳ = ۳×۵ یا ۳+۵ = ۵+۳
- سوالات دے کر حل کرا لینے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ صحیح حل کی جانچ کا طریقہ بھی سکھائیں اور طلبہ سے جانچ کرالیا کریں۔ کبھی کبھی خود طلبہ سے بھی سوال بنانے کو کہیں۔
- تحریری کے ساتھ زبانی سوالات حل کرانے پر بھی خصوصی توجہ دیں۔ روزمرہ کی زندگی میں عام افراد کو حساب کتاب کے ایسے مسائل سے کم ہی سابقہ پیش آتا ہے جن کے لیے انہیں کاغذ قلم لے کر بیٹھنا پڑے، عام طور پر زبانی کام چلانا پڑتا ہے، اس لیے مسائل کو عموماً زبانی حل کر لینے کی اچھی صلاحیت بہم پہنچائیں۔ زبانی سوالات کی مشق تحریری سوالات کو بھی صحت و سرعت سے حل کرنے اور عبارتی سوالات سمجھنے میں بہت معاون ہوتی ہے۔ ہر سبق کے ابتدائی چند منٹ زبانی سوالات ہی کے لیے مخصوص رکھیں اور کبھی کبھی اس کے لیے

پورے گھنٹے لیے جائیں۔ابتدائی درجات میں تو زبانی سوالات پر تقریباً نصف وقت صرف کرنا چاہیے۔

☆ عبارتی سوالات میں عبارت آسان اور قابل فہم رکھیں تا کہ بچے تھوڑی جدوجہد سے حل کر سکیں۔ پیچیدگی بتدریج لائی جائے۔

گنتی سکھانا:

☆ مدرسے میں آنے سے پہلے بچوں کو محدود گنتیاں بے ربط یاد ہوتی ہیں وہ عموماً چیزوں کی مقدار سے اندازہ کرتے ہیں۔ کسی چیز کے بارے میں کم یا زیادہ کا تصور ہوتا ہے اور اسی پر وہ مطمئن ہوتے ہیں۔

☆ گنتی کی ابتدا ان اشیاء سے کی جائے جسے بچے چھو سکیں یا ادھر ادھر کر سکیں مثلاً املی کے بیج، گولیاں وغیرہ۔

☆ گنتی کی نظموں سے بھی مدد لے جائے مثلاً ایک دو تین قائم کر دو دین (۲) تین دو ایک، بن جاؤ نیک وغیرہ۔

☆ پہلے پانچ تک پھر دس تک سیدھا اور الٹا گنا کر لکھنا سکھائیں۔ بتدریج آگے بڑھیں، ترتیب سے لکھوانے کے بعد بے ترتیب کی بھی خوب مشق کرائیں۔

چاروں مفرد قاعدے:

☆ گنتیاں سکھانے کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ جمع تفریق کا بھی تصور دلائیں اور اتنی مشق کرائیں کہ اشیاء کی مدد کے بغیر بھی گننے لگیں مثلاً تین سے دو ایک کم ہے اور دو سے تین ایک زیادہ۔

☆ جوڑ گھٹاؤ میں انگلیوں سے گننے کا کام لیا جائے لیکن کچھ عرصہ بعد اس عادت کو ترک کرا دیں۔

☆ تیلیوں کے بنڈل سے یا دیا سلائی کے خالی ڈبوں میں املی کے دس دس بیجوں سے دہائی کا

تصور دلائیں اور ایک ایک کے اضافے سے اگلے اعداد سکھائیں۔ بال فریم کی مدد سے بھی اکائی دہائی کا تصور دلایا جائے اور ان کو اعداد میں ظاہر کرنے کا طریقہ سکھایا جائے۔

☆ بیس تک گنتیاں سکھانے کے بعد جوڑے جوڑے رکھ کر دو کے ضربی پہاڑے بھی بتا دیں اور متعدد مثالوں سے سمجھا دیں کہ جوڑ کا آسان طریقہ پہاڑے سے مدد لینا ہے۔

☆ دس یا کم چیزیں لے کر (۲،۲) (۳،۳) (۴،۴) کی ڈھیریاں لگا کر یا اتنے بچوں میں تقسیم کر کے تقسیم کا تصور دلائیں مگر اعداد ایسے ہوں جو پورے پورے تقسیم ہو سکیں۔

☆ سال اول میں اس طرح ۵۰ تک گنتی ۵ تک ضربی پہاڑے، اسی کے اندر جمع تفریق کے سوالات کی خوب مشق کرائیں۔ جوڑ کے سوالات میں دہائی حاصل لے سکتے ہیں لیکن تفریق کے سوالات میں دہائی سے ادھار نہ لینا پڑے۔

☆ جوڑ کے بیس کے اندر کے اور باقی کے دس کے اندر کے ٹیبل بنا کر یاد کرا دیں۔ مثلاً ایک ایک دو ایک دو تین' ایک تین چار وغیرہ یا ایک میں سے ایک گئے کچھ نہیں دو میں سے ایک گئے ایک وغیرہ۔

☆ چاروں مفرد قاعدے سال دوم میں اچھی طرح سکھا دیں لیکن مشق کا سلسلہ آگے بھی جاری رہے۔

کسروں کا تصور:

پھل، کاغذ کے گول چوکور ٹکڑے چھڑیاں وغیرہ کاٹ کر $\frac{1}{2}$، $\frac{1}{4}$، $\frac{1}{3}$، $\frac{3}{4}$، کا تصور بآسانی دیا جا سکتا ہے۔ رفتہ رفتہ دس تک ان کے کسری پہاڑے بھی بنوا کر یاد کرائیں۔

☆ کاغذ پر چوکر شکلیں بنا کر $\frac{1}{2}$، $\frac{1}{4}$، $\frac{1}{8}$، خانوں میں تقسیم کریں اور پھر انہی خانوں کی مدد سے (۱) $\frac{1}{2}+\frac{1}{4}=\frac{3}{4}$ ۔ (۲) $\frac{1}{2}=\frac{2}{4}=\frac{4}{8}$ ۔ (۳) $\frac{1}{2}$ کا $\frac{1}{2}=\frac{1}{4}$ ۔ (۴) $\frac{1}{2}-\frac{1}{4}=\frac{1}{4}$، وغیرہ کا تصور دلائیں۔

۴۔ جغرافیہ

اللہ تعالیٰ ساری کائنات کا خالق، رازق اور مالک ہے۔ اس نے اپنی بے پایاں مملکت کے ایک حقیر حصے زمین پر انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ اسی کی مٹی سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔ اس پر وہ ساری زندگی رہتا بستا ہے، اس کے وسائل وذرائع سے فائدہ اٹھاتا ہے، طرح طرح کے تصرفات کرتا ہے اور مرنے کے بعد اسی میں دفن ہوتا ہے۔ غرض بحیثیت خلیفہ یہی زمین اس کا میدان کار ہے۔ اس لیے اس کے متعلق معلومات ہر فرد کے لیے ضروری ہیں۔

جغرافیہ وہ علم ہے جس کے ذریعے روئے زمین کا حال معلوم ہوتا ہے، خصوصاً کسی خاص ماحول میں انسان کے رہن سہن کا علم، انسان کے رہن سہن پر اس کے طبعی ماحول زمین کی ساخت، آب وہوا، نباتات، پیداوار، حیوانات وغیرہ بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ جغرافیہ سے ان کا بھی علم حاصل ہوتا ہے۔

مختلف علوم وفنون کی مدد سے انسان نے اپنے ماحول میں طرح طرح کی تبدیلیاں کر کے اسے اپنے لیے سازگار بنایا ہے۔ انسان کے رہن سہن پر اس کے ماحول اور ماحول پر اس کی کوششوں کے اثرات کا علم جغرافیہ ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس لیے جغرافیہ کی تدریس ضروری ہے۔

ابتدائی درجات میں ایک تدریج سے مقامی، ضلعی، صوبائی اور ملکی جغرافیہ کا مختصر علم، دنیا کے مختلف ماحول میں رہنے والے بچوں کی شکل وصورت، لباس، رہن سہن وغیرہ کے متعلق معلومات اور سیاحوں کے سفرناموں اور مہمات کے ذریعے دنیا کا مختصر علم شامل نصاب ہوتا ہے۔

طریق تعلیم:

☆ گرد وپیش کے جغرافیائی حالات اور زمین پر فطرت کے کارفرما عوامل نیز ماحول کو سازگار بنانے کے ضمن میں انسانی کوششوں کا علم بہم پہنچانے کے لیے کبھی کبھی باہر لے جا کر ندی نالوں، کھیتوں، کھلیانوں، بازار، منڈیوں، ملوں، کارخانوں وغیرہ کا مشاہدہ کرائیں۔

☆ تصورات کو واضح کرنے کے لیے تصاویر، چارٹس، گلوب اور نقشہ جات، بالوں کی کشتیوں پر مناظر، ماڈل اور اگر دستیاب ہوسکیں تو ویو ماسٹر اور میجک لنٹرن سے مدد لیں۔

☆ دنیا کے مختلف خطوں کے بچوں کے متعلق معلومات، جغرافیائی کہانیوں کے ذریعے فراہم کریں۔

☆ سفرناموں اور بری و بحری، فضائی وکوہ پیمائی سے متعلق مہمات کا تذکرہ بیانیہ انداز سے کریں۔

☆ آپ بیتی کے انداز میں مختلف مصنوعات، مظاہر فطرت، ندی پہاڑ، زمین وغیرہ سے متعلق ضروری معلومات فراہم کریں۔ آخر میں خطہ داری بنیاد پر تمام دنیا کے متعلق اختصار سے معلومات بہم پہنچائیں۔

☆ مختلف معدنیات، اناجوں، بیجوں اور مختلف پیداوار کے نمونے اور دیس دیس کے ٹکٹ جمع کرانے کا اہتمام کریں۔

☆ کمرے کو جغرافیہ سے متعلق تصاویر، مناظر، چارٹس، نقشہ جات وغیرہ سے آراستہ کریں اور حسب ضرورت ان سے مدد لیں۔

۵۔ عام سائنس

اس مضمون میں (۱) حفظانِ صحت، (۲) وظائف اعضاء، (۳) مطالعہ قدرت (۴) طبیعات، (۵) ارضیات، (۶) فلکیات، (۷) کیمیا وغیرہ کی وہ ضروری معلومات شامل ہیں جو بچوں کو اپنے جسم، فطری ماحول، مظاہر قدرت، صحت مند عادات اور احتیاطی تدابیر وغیرہ کے ضمن میں بہرحال ہونی چاہئیں۔

مقاصد:

اس مضمون کی تدریس میں مندرجہ ذیل مقاصد پیش نظر ہونے چاہئیں۔

☆ فطری ماحول میں بکھری ہوئی متعدد نشانیوں کا مشاہدہ کرا کے خالق کائنات کی ذات وصفات کا طلبہ کے ذہن میں بتدریج واضح تصور بٹھانا۔

☆ گردوپیش کے حیوانات، نباتات، جمادات، مناظر فطرت ومظاہر قدرت کے مشاہدہ کی عادت ڈلوانا، ان کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچانا، صانع فطرت کے مقرر کردہ ان قوانین وضوابط سے طلبہ کو روشناس کرانا جو ان کی پشت پر کام کرتے ہیں تاکہ وہ توہمات اور جاہلی عقائد سے محفوظ رہیں۔

☆ جسم کی بناوٹ، اعضاء کے کام، حفظان صحت کے اصول، ابتدائی طبی امداد اور احتیاطی تدابیر سے طلبہ کو واقف کرنا۔

☆ خالق کائنات کے عطا کردہ بے پایاں خزانے کی قدروقیمت سمجھنے اور ان کو استعمال کر کے انسانیت کو نفع نقصان پہنچانے کی انسانی کوششوں کا اجمالی جائزہ لینے کے قابل بنانا۔

☆ طلبہ کی جبلت تجسس کو ابھارنا، اس کی تسکین کے مواقع فراہم کرنا تاکہ وہ مختلف چیزوں کے متعلق کیا کیوں کیسے وغیرہ سے واقف ہو سکیں۔

طریق تعلیم:

☆ عام سائنس کے اسباق میں حتی الامکان مشاہدات و تجربات خود کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع دیے جائیں، زبانی سبق پڑھا دینے پر اکتفا نہ کیا جائے۔

☆ جن چیزوں کا مشاہدہ یا تجربہ ممکن نہ ہو، ان کے ماڈل، چارٹس، تصاویر وغیرہ فراہم کی جائیں تاکہ تصورات واضح بنیں۔

☆ مشاہدہ کے لیے طلبہ کو کبھی کبھی باہر کھیتوں، باغوں، تالابوں وغیرہ کی سیر کے لیے لے جائیں اور قابل مشاہدہ پہلوؤں پر توجہ دلائیں۔

☆ جسم کی بناوٹ، اعضاء کے کام اور حفظان صحت کے اصول بخوبی ذہن نشین کرانے کے بعد صحت مند عادات کا پابند بنانے، احتیاطی تدابیر پر عمل پیرا ہونے اور ابتدائی طبی امداد سے متعلق طلبہ کی عملی تربیت کریں۔

☆ ہر مدرسے کو اپنا ایک مختصر عجائب خانہ بنانا چاہیے جس میں رفتہ رفتہ طلبہ کی مدد سے سیپ، گھونگے، چڑیوں کے پر، پھول پتیاں، طرح طرح کے بیج، دھاتوں کے ٹکڑے یا جانوروں کے ڈھانچے، اشیاء کے ماڈل، پوسٹرس تصاویر وغیرہ فراہم کر کے سلیقے سے ترتیب دیے جائیں۔

☆ عجائب خانے کے لیے کوئی علیحدہ کمرہ ہو سکے تو اچھا ہے ورنہ درجے ہی کے طاقوں، الماریوں وغیرہ میں یہ چیزیں ترتیب دی جائیں تاکہ مشاہدے میں آسانی ہو۔

☆ اگر امکان ہو تو ہر مدرسے کا ایک مختصر چمن ہونا چاہیے جس میں طرح طرح کے پھول پودے لگے ہوں اور پالتو جانوروں اور پرندوں کے رکھنے کا بھی بندوبست ہو۔ ان کی دیکھ بھال کا بیشتر کام خود طلبہ سے لیا جائے۔

☆ تجربات کے لیے سستے اور مختصر آلات و سامان بھی فراہم کرنے کی فکر کی جائے۔

☆☆☆

............☆☆☆...........

''دوران تعلیم میں طلبہ کو مارنا پیٹنا نامناسب ہے خاص طور پر چھوٹی عمر کے بچوں پر تو بالکل سختی نہیں کرنی چاہیے، جو شخص بچوں پر سختی کرتا ہے وہ ان کے دل کی خوشی چھین لیتا ہے، انہیں نکما اور ناکارہ بنادیتا ہے۔ انہیں دروغ گو اور بدباطن کر دیتا ہے۔ (ان کے اندر ریاکاری اور نفاق کے جراثیم پلنے لگتے ہیں اور) وہ ایسی باتیں ظاہر کرنے لگتے ہیں جو ان کے باطن کے خلاف ہوتی ہیں کیونکہ اگر ایسا نہ کریں تو قہر وغضب کے شکار بنیں۔ وہ مکر وفریب کے عادی بن جاتے ہیں کیونکہ اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ پھر یہی عادات اور طور طریقے ان کی سیرت وکردار کے جزء بن جاتے ہیں۔

پس معلم کو چاہیے کہ ایسے شاگرد پر اور باپ اپنے بیٹے پر قہر واستبداد کا مظاہرہ نہ کریں اور نہ جور وستم کے بل پر تربیت کریں۔'' (ابن خلدون)

............☆☆☆...........

باب ۴۷:

تعلیم وتربیت اور مفکرین اسلام

ذیل میں مختلف مفکرین اسلام کے اقوال وآراء اختصار سے دیئے جا رہے ہیں۔

☆ علم پیغمبروں کی میراث ہے اور مال کفار، فرعون اقارون وغیرہ کی۔

(حضرت ابوبکرؓ)

☆ طالب دنیا کو علم سکھانا ڈاکو کے ہاتھ تلوار فروخت کرنا ہے۔

(حضرت عمرؓ)

☆ ضائع ہے وہ علم جس پر عمل نہ کیا جائے۔

(حضرت عثمانؓ)

☆ شرافت عقل وادب سے ہے نہ کہ مال ونسب سے۔

(حضرت علیؓ)

☆ میں نے پوچھنے والی زبان اور سوچنے والے دل ودماغ سے علم حاصل کیا۔

(حضرت ابن عباسؓ)

☆ جب میں کوئی بات سمجھ لیتا اور اس کی باریکی اور حکمت سے واقف ہو جاتا تو الحمدللہ کہا کرتا اس لیے میرے علم میں ترقی ہوگئی۔

(امام ابوحنیفہؒ)

☆ تنہائی میں نصیحت کرنا اور سمجھانا شرافت کی دلیل اور اصلاح کی ضامن ہے۔

(امام شافعیؒ)

☆ میں نے علم اس طرح حاصل کیا کہ دوسروں سے استفادہ سے باز نہیں رہا اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔

(امام ابویوسفؒ)

☆ ہمارا یہ کام (علمی مشغلہ) بچپن سے موت تک ہے۔ جو شخص اس کو ایک گھڑی بھر بھی چھوڑنا چاہے اس کو وہ گھڑی ہی چھوڑ دے (یعنی مر جائے تو بہتر ہے)۔

(امام محمد)

☆ خدا کی قسم! مجھ کو کھانے کے وقت علمی مشاغل کے چھوٹ جانے پر افسوس ہوتا ہے کیونکہ فرصت وقت بہت عزیز چیز ہے۔

(امام رازی)

☆ اساتذہ مبتدیوں کے لیے چھوٹی چھوٹی عام فہم اور ایسی کتابیں تجویز کیا کرتے تھے جن میں وہ باتیں ہوتی تھیں جن کا انسان کو اکثر اتفاق پڑتا رہتا ہے۔

(امام شرف الدین عقیلی)

☆ سبق کی مقدار شروع میں اس قدر ہونی چاہیے جو صرف دو مرتبہ کہہ لینے سے یاد ہو جائے۔

(امام زرنجی)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ:

☆ بچے کی تعلیم وتربیت ایک نہایت اہم فریضہ ہے وہ والدین کے پاس امانت ہے۔ اس کا قلب ایک جوہر نفیس سادہ، ہر نقش وصورت سے خالی، ہر ایک نقش کے قابل ہے، جس طرف مائل کرو اس طرف میلان کے لائق ہوتا ہے مثلاً اگر خیر کی تعلیم پائے اور اس کا عادی بنایا جائے تو بڑا ہو کر بھی ایسا ہی رہے گا اور فلاح دارین سے بہرہ ور ہوگا اور اس اجر میں والدین، اساتذہ اور مربی سب شریک رہیں گے اور اگر شر کا عادی بنے گا اور جانوروں کی طرح بے غور و پرداخت چھوڑ دیا جائے تو تباہ و برباد ہو جائے گا اور اس کا وبال اس کے مربی پر ہوگا۔

☆ بچہ جب کوئی عمدہ کام کرے تو اس کو کچھ انعام دینا چاہیے تاکہ وہ خوش ہو اور لوگوں کے

سامنے اس کی تعریف کرنی چاہیے اور اگر کبھی کوئی غلطی سرزد ہو تو اس سے چشم پوشی کرنی چاہیے اور اس کا پردہ نہیں کھولنا چاہیے، خاص کر ایسی صورت میں جب خود بچہ اس کام کو چھپائے اور اسے پوشیدہ رکھنے کی جدوجہد کرے کیونکہ اگر اس کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کا بھانڈا پھوٹ جانے سے کچھ نہ ہوا تو آئندہ برائیوں پر جری ہو جائے گا اور بھید کھلنے کی پرواہ نہ رہے گی دوبارہ غلطی سرزد ہو تو تنہائی میں اس پر عتاب کرنا چاہیے اور تاکید سے کہنا چاہیے کہ خبردار آئندہ ایسا مت کرنا، اگر پھر کرو گے تو سب کے سامنے ذلیل کیے جاؤ گے۔

☆ بچے کو ہر وقت ڈانٹنا ڈپٹنا نہیں چاہیے کیونکہ اس سے وہ لعنت ملامت کا خوگر ہو جاتا ہے اور مذموم حرکات کھلم کھلا کرنے لگتا ہے اور نصیحت کا کوئی اثر نہیں لیتا۔

☆ بچے کو مکتب میں بھیج کر قرآن، حدیث اور صلحاء کی حکایتیں سکھانی چاہئیں تاکہ صالحین کی محبت اس کے دل میں پیدا ہو۔

☆ نشست و برخاست کے آداب سکھانے چاہئیں۔ بہت زیادہ بولنے سے منع کرنا چاہیے۔

☆ اس کا عادی بنانا چاہیے کہ سب سے پہلے نہ بولے۔ دوسرا شخص کوئی بات کہے تو غور سے سنے اور اپنے بڑے کی اٹھ کر تعظیم کرے اور اس کے لیے جگہ خالی کر دے۔

☆ مکتب سے آنے کے بعد بچے کو اچھے کھیل کا موقع دینا چاہیے تاکہ مکتب کی مشقت سے راحت ملے لیکن کھیل ایسا نہ ہو جو تھکا کر چور چور کر دے اگر کھیل سے محروم کر دیا جائے اور ہمیشہ تعلیم میں لگائے رکھا جائے تو بچے کا دل مرجاتا ہے اس کی ذکاوت ماند پڑ جاتی ہے زندگی اجیرن ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ تعلیم سے بھاگنے اور خلاصی و فرار کی صورتیں سوچنے لگتا ہے۔

☆ یہ بھی ضروری ہے کہ اسے ماں باپ اور معلم و مربی کی اطاعت کا عادی بنایا جائے اور ان اشخاص کا ادب واحترام کرنا سکھایا جائے جو عمر میں اس سے بڑے ہوں خواہ وہ اپنے ہوں یا بیگانے۔

☆ حاصل کلام یہ کہ بچے کی تربیت ابتداء میں بہت ضروری ہے کیونکہ بچپن میں اس کا جوہر قلبی ہر طرح کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خیر و شر دونوں سیکھ سکتا ہے اور اس کا اختیار ماں باپ کو ہے جس طرف چاہیں بآسانی مائل ہو سکتا ہے۔

☆ اگر ایک طبیب تمام بیماریوں کا ایک ہی نسخہ لکھے اور ایک ہی دوا سے علاج کرے تو اکثر کی ہلاکت کا باعث ہوگا۔ بالکل یہی حال معلم و مربی کا ہے اگر وہ اپنے زیر تربیت لڑکوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے گا تو انہیں برباد کر دے گا۔ ان کے قلوب پر موت طاری کر دے گا۔ معلم و مربی کا فرض ہے کہ زیر تربیت لڑکوں میں سے ہر ایک کے حال، عمر اور مزاج کے مطابق ان کے لیے راستہ تجویز کرے اور ان کے لیے وہی ریاضت تجویز کرے جس کے وہ متحمل ہو سکیں۔"

احنف بن قیس کی حضرت امیر معاویہؓ کو نصیحت:

"بچے ہمارے ستون ہیں جن سے ہماری پیٹھ سہارا لیتی ہے۔ وہ ہمارے دلوں کے مرغوب پھل ہیں۔ وہ ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں۔ انہی کو لے کر ہم دشمنوں پر حملہ کرتے ہیں، وہی ہمارے بعد ہماری جگہ لیتے ہیں۔ پس تجھے چاہئے کہ بچوں کے لیے نرم و ملائم زمین بن جا، اگر وہ تجھ سے مانگیں تو انہیں دے وہ تیری خوشنودی چاہتے ہیں تو ان سے خوش رہ، انہیں اپنی محبت سے محروم نہ رکھ ورنہ وہ تیرے قرب سے بھڑکیں گے تیری زندگی سے کھٹکیں گے اور تیری موت کی آرزو کریں گے۔"

مولانا اشرف علی تھانوی:

☆ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اس وقت علوم دینیہ کے مدارس کا وجود مسلمانوں کے لیے ایسی بڑی نعمت ہے کہ اس سے فوق متصور نہیں۔ دنیا میں اگر اس وقت اسلام کی بقا کی کوئی صورت

ہے تو یہ مدارس ہیں لیکن ساتھ ہی ان مدارس میں ایسے امور پائے جاتے ہیں جن کی اصلاح بہت ضروری ہے اور یہ اصلاح نہ ہونے سے اہل علم کی جماعت ہدف ملامت بھی بنتی ہے اور ان مدارس کے قائم کرنے کی خود جو روح وغایت ہے یعنی تمل بالدین وہ بھی ضعیف ہو جاتی ہے اور لوگ علوم دینیہ سے متوحش ونفور ہو جاتے ہیں تو اس طرح یہ جماعت علم گویا **یصدون عن سبیل اللّٰہ** (خدا کی راہ سے روکنے) کا سبب بن جاتی ہے۔

☆ اب تک طریقہ یہ ہے کہ پہلے طالب علم عبارت پڑھتا اور مدرس مطلب بیان کر دیتا ہے اگر کسی کو کچھ شبہ ہوا، دریافت کر لیا ورنہ آگے چل پڑے۔ یہ طریق مبتدیوں بلکہ متوسطین کے لیے بھی غیر نافع ہے اس میں اصلاح کی ضرورت یہ ہے کہ خود طلبہ کی استعداد سے کام لیا جائے بلاضرورت ان کی امداد نہ کی جائے خود ان ہی سے مطلب کی تقریر کرائی جائے نیز ہر قاعدہ ومسئلہ کی کثرت امثلہ سے مشق کرائی جائے۔

☆ مدارس میں یہ انتظام ہونا ضروری ہے کہ دس دس بیس بیس لڑکوں پر ایک معلم نگران مقرر ہو جو ان امور کی نگرانی رکھے کہ کسی بڑے طالب علم سے نہ ملنے دے۔ نگران سے الگ ہو کر آپس میں باتیں نہ کریں، ان کے نام جو خطوط آئیں وہ بھی دیکھ کر دے ان کے سر منڈاتا رہے، پان نہ کھانے دے، لباس سادہ ہو، نماز وجماعت میں ان کی حاضری کی فکر رکھے۔ تفریح یا کسی ضرورت سے بازار وغیرہ جائیں تو ان کے ساتھ رہے۔

علامہ اقبالؒ

مقصود ہو گر تربیت لعل بدخشاں
بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو

سیرت فرزند ہا از امہات
جوہر صدق وصفا از امہات

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

شیخ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روح انسانی

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط ونظام

از رموز جزو کل آگاہ بود
در جہاں قائم بامر اللہ بود

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرت انساں کے لیے اس کا ثمر موت

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسہ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

وہ علم کم بصری، جس میں ہم کنار نہیں
تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ:

☆ ''امامت کا دامن ہمیشہ علم سے وابستہ رہے گا۔ انسان کو بحیثیت ایک نوع کے زمین کی خلافت ملی ہی علم کی وجہ سے ہے۔ اس کو سمع، بصر اور فوائد تین چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو دوسری مخلوقات ارضی کو یا تو نہیں دی گئیں یا اس کی نسبت کمتر دی گئی ہیں۔ اس لیے وہ اس بات کا اہل ہوا کہ دوسری مخلوقات پر خداوند عالم کا خلیفہ بنایا جائے۔ اب خود اس نوع میں سے جو طبقہ یا گروہ علم کی صفت میں دوسرے طبقوں اور گروہوں سے آگے بڑھ جائے گا وہ اسی طرح ان سب کا امام بنے گا جس طرح انسان من حیث النوع دوسری انواع ارضی پر اسی چیز کی وجہ سے خلیفہ بننے کا اہل ہوا ہے۔''

☆ سمع سے مراد دوسروں کی فراہم کردہ معلومات حاصل کرنا ہے۔ بصر سے مراد خود مشاہدہ کر کے واقفیت بہم پہنچانا ہے اور فوائد سے مراد ان دونوں ذرائع سے حاصل کی ہوئی معلومات کو مرتب کر کے نتیجہ اخذ کرنا ہے، یہی تین چیزیں مل کر وہ علم بنتا ہے جس کی قابلیت انسان کو دی گئی ہے..... جو انسان ان تینوں قوتوں سے کم کام لیتے ہیں وہ پست اور مغلوب رہتے ہیں انہیں تابع اور مطیع بن کر رہنا پڑتا ہے، ان کا کام پیچھے چلنا ہوتا ہے بخلاف ان کے جو ان تینوں سے زیادہ کام لیتے ہیں وہ برتر و غالب ہوتے ہیں۔ متبوع اور مطاع بنتے ہیں۔ رہنمائی اور پیشوائی ان ہی کے حصے میں آتی ہے۔

☆ جو گروہ خیالات کے میدان میں امام بنتا ہے اور کائنات فطرت کی طاقتوں کو اپنے علم سے مسخر کر کے ان سے کام لیتا ہے اس کی امامت صرف خیالات ہی کے عالم تک محدود نہیں رہتی بلکہ زندگی کے پورے دائرے پر چھا جاتی ہے۔ زمین پر اس کا تسلط ہوتا ہے۔ رزق کی کنجیاں اس کے قبضہ میں ہوتی ہیں۔ حاکمانہ اختیارات اسے حاصل ہوتے ہیں اس لیے انسانی حیات اجتماعی کا سارا کاروبار اس ڈھنگ اور اس نقشے پر چلنے لگتا ہے جس پر وہ گروہ

اپنی ذہنیت اور اپنے زاویۂ نظر کے مطابق اسے چلانا چاہتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ گروہ جس کو یہ تسلط دنیا اور اس کے معاملات پر حاصل ہے خدا سے پھرا ہوا ہو تو اس کے حیطۂ اقتدار میں رہتے ہوئے کوئی ایسا گروہ پنپ نہیں سکتا جو خدا کی طرف پھرنا چاہتا ہو۔

☆ انقلاب امامت کے لیے انقلاب تعلیم ناگزیر ہے۔

☆ ناخداشناس امامت میں رہ کر خداشناسی و خداپرستی کا مسلک زندہ نہیں رہ سکتا، لہٰذا جو کوئی اس مسلک پر اعتقاد رکھتا ہو اس کے عین ایمان کا اقتضاء یہ ہے کہ اس امامت کو مٹانے اور خدا شناس امامت کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

☆ جو نظام تعلیم محض پرانے سمعی علوم کی حد تک محدود رہے اس میں ہرگز یہ طاقت نہیں کہ امامت میں اتنا بڑا انقلاب کرنے کے لیے آپ کو تیار کر سکے۔

☆ جو نظام تعلیم تمام علوم کو اسی ترتیب اور اسی زاویۂ نظر سے لیتا ہے جو ناخدا شناس ائمہ کی ترتیب اور ان کا زاویۂ نظر ہے اور جو اس تمدنی مشین کا پرزہ بننے کے لیے انسانوں کو تیار کرتا ہے جو ائمۂ ضلال نے بنائی ہے وہ دراصل ارتداد کا مجرب نسخہ ہے۔

☆ اصلاح تعلیم کا یہ لائحۂ عمل کہ علوم اسلامی کے ساتھ نئے علوم کا جوڑ لگایا جائے یہ بھی امامت میں انقلاب کرنے کے لیے آپ کو تیار نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ فلسفہ، سائنس، تاریخ، سیاسیات، معاشیات اور دوسرے علوم جو اس وقت تک مدون و مرتب صورت میں آپ کو ملتے ہیں وہ سب کے سب ناخدا شناس لوگوں کی فکر و تحقیق کا نتیجہ ہیں اور ان کی ترتیب و تدوین میں اس گروہ کا نقطۂ نظر اس طرح پیوست ہے کہ حقائق واقعیہ کو نظریات اور اوہام و تعصبات اور اہواء و رجحانات سے الگ چھانٹ لینا اور خداپرستی کے نقطۂ نظر سے بطور خود مرتب کر کے دوسرے نظریات قائم کرنا ہر طالب علم کے بس کی بات ہے نہ ہر استاد کے بس کی۔

موجودہ نظام تعلیم کی خصوصیات:

☆ دینی ودنیوی علوم کی انفرادیت مٹا کر دونوں کو ایک جان کر دیا جائے۔

☆ علوم کو دینی و دنیوی دو الگ الگ قسموں میں منقسم کرنا دراصل دین اور دنیا کی علیحدگی کے تصور پر مبنی ہے اور یہ تصور بنیادی طور پر غیر اسلامی ہے۔ اسلام جس چیز کو دین کہتا ہے وہ دنیا سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ دنیا کو اس نقطہ نظر سے دیکھنا کہ یہ اللہ کی سلطنت ہے اور اپنے آپ کو یہ سمجھنا کہ ہم اللہ کی رعیت ہیں اور دنیوی زندگی میں ہر طرح سے وہ رویہ اختیار کرنا جو اللہ کی رضا اور اس کی ہدایت کے مطابق ہو اس چیز کا نام دین ہے۔ اس تصور دین کا اقتضا یہ ہے کہ تمام دنیوی علوم کو دینی علوم بنا دیا جائے۔

☆ ابتدائی مراحل میں تو کوئی دوسرا نقطہ نظر طالب علم کے سامنے آنے ہی نہیں دینا چاہیے البتہ بعد کے مراحل میں تمام علوم اس کے سامنے اس طرح آنے چاہئیں کہ معلومات کی ترتیب، حقائق کی توجیہہ اور واقعات کی تعبیر تو بالکلیہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہو مگر اس کے مخالف تمام دوسرے نظریات بھی پوری تنقید و تنقیح کے ساتھ اس حیثیت سے اس کے سامنے رکھ دیئے جائیں کہ یہ ضالین اور مغضوب علیهم کے نظریات ہیں۔

☆ ہر طالب علم کو مجموعہ علم بنانے اور تکمیل کے بعد ہر ایک کو "مولانا" اور ہر ایک کو جملہ مسائل میں فتویٰ کا مجاز قرار دینے کا وہ طریقہ جو اب تک رائج ہے ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ اختصاصی تعلیم کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو سالہا سال کے تجربات کے بعد دنیا میں مفید پایا گیا ہے۔ انسان کا علم اب اتنی ترقی کر چکا ہے اور اتنے شعبے اس میں پیدا ہو گئے ہیں کہ کسی ایک شخص کا ان سب کو پڑھنا محال ہے اور اگر تمام علوم میں محض معمولی شد بد اسے کرا دی جائے تو وہ کسی شعبۂ علم میں بھی کامل نہیں ہو سکتا اس کے بجائے بہتر یہ ہے کہ پہلے آٹھ دس سال کا کورس ایسا رکھا جائے کہ ایک بچے کو دنیا اور انسان اور زندگی کے متعلق جتنی

معلومات کم سے کم حاصل ہونی ضروری ہیں وہ اس کو خالص اسلامی نقطۂ نظر سے دی جائیں۔ اس کے ذہن میں کائنات کا وہ تصور بیٹھ جائے جو مسلمان کا تصور ہونا چاہیے۔ عملی زندگی کے متعلق، وہ تمام معلومات اسے حاصل ہو جائیں جن کی ایک آدمی کو ضرورت ہوتی ہے اور وہ ان سب چیزوں کو ایک مسلمان کے طریقے پر برتنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اسے اپنی مادری زبان بھی آ جائے۔ عربی زبان بھی وہ اتنی جان لے کہ آگے مزید مطالعہ میں اسے مدد مل سکے اور کسی ایک یورپین زبان سے بھی واقف ہو جائے تاکہ معلومات کے اس وسیع ذخیرے سے فائدہ اٹھا سکے، جو ان زبانوں میں موجود ہے۔ اس کے بعد اختصاصی تعلیم کے الگ کورس ہوں جن میں چھ یا سات سال کی محققانہ تربیت حاصل کر کے ایک طالب علم اس شعبہ علم کا ڈاکٹر قرار دیا جائے جس کی تعلیم اس نے حاصل کی ہے۔

اس نئے نظام میں وہ بے مقصد تعلیم نہیں ہوگی جو آج کل ہندو پاک میں دی جا رہی ہے بلکہ اس میں تعلیم دینے والے اور تعلیم پانے والے دونوں کے سامنے ایک متعین اور واضح مقصد زندگی اور منتہائے سعی و عمل ہوگا۔ یعنی یہ کہ ان سب کو مسلک خدا پرستی کی امامت دنیا میں قائم کرنے کے لیے جہاد کبیر کرنا ہے۔ یہ مقصد اس نظام کی ہر چیز میں اس طرح کام کرے جس طرح انسانی جسم کے ہر رگ اور ہر ریشے اور ہر حرکت میں اس کی روح کام کرتی ہے۔ طلبہ کی شخصی زندگی، ان کے باہمی اجتماعات، ان کے کھیل کود اور تفریحات اور ان کے درس و تدریس اور مطالعہ و تحقیق کے تمام مشاغل میں اسی مقصد کی کارفرمائی ہو، اس کے مطابق ان کی سیرت و کردار کی تعمیر کی جائے۔ اسی پر ان کے اخلاق ڈھالے جائیں اور تمام ماحول ایسا بنایا جائے کہ ہر شخص کو ایک مجاہد فی سبیل اللہ میں تبدیل کر دے۔

☆☆☆


داعیٔ اعظم
انتخاب حدیث
امام حسین
حیات طیبہ
اسلامک پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ
U00083